محی الدین نواب

فہرست

ابتدائیہ

اردو زبان کی تاریخ میں ایسے کئی موڑ آئے جب تحریر اور تقریر کے انداز بدلتے گئے۔ وقت اور ماحول کے تقاضوں کے مطابق ادیبوں نے کبھی سلاست کی زبان استعمال کی، کبھی شاعرانہ نثر لکھی، کبھی الفاظ کے گورکھ دھندوں سے ایک عام سی بات کو فلسفہ بنا دیا۔ ہر دور میں لکھنے والوں کا دعویٰ رہا ہے کہ وہ زندہ اور جامع ادب پیش کر رہے ہیں، اور یہ دعوے درست ثابت ہوئے۔ اسی لیے آج بھی غالب، پریم چند اور علامہ اقبالؒ زندہ ہیں۔

موجودہ دور میں علامتی کہانیاں لکھی جا رہی ہیں۔ علامتی کہانیوں میں تشبیہ و استعاروں کا حسن جو آج ہے، پہلے کبھی نہ تھا۔ ان کہانیوں میں الفاظ نئے معنی اور نئی گہرائیوں کے ساتھ نیا جنم لیتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ جنم جنم تک رہیں گے۔ یقیناً اس دعوے کو درست ثابت ہونا چاہیئے۔

لیکن یہاں بات کل زندہ رہنے کی نہیں، آج زندہ رہنے کی ہے۔ آج ہی کی زندگی سے کل کی زندگی کا تسلسل قائم ہوگا۔ اس نقطۂ نظر سے یہ افسوسناک حقیقت سامنے آتی ہے کہ علامتی کہانیوں اور جامع ادب کو پڑھنے والے برائے نام ہیں۔ بک اسٹالوں پر ادبی رسالے اور کتابیں گرد آلود ہو رہی ہیں۔ حسنِ یوسف تو ہے، مصر کے بازار میں خریدار نہیں ہے۔

ان حالات کے پیشِ نظر اردو زبان کی تاریخ یوں سمجھ میں آتی ہے کہ ابتداء سے اب تک ادب کی خدمت کرنے والوں نے اردو کو زبان کی چاشنی اور حسنِ بیان کی رنگا رنگی تو دی، مگر اس کی اشاعت کو عوام تک نہ پہنچا سکے۔ دوسرے لفظوں میں ادیبوں اور شاعروں نے صرف ادب کی خدمت کی۔ وہ نہیں سوچتے کہ اردو پڑھنے والوں کا حلقہ پھیلے گا یا سکڑ جائے گا۔ ان کی کارکردگی کے مطابق صرف ادب کا ذوق رکھنے والے انہیں پڑھیں۔ باقی کورس کی کتابیں پڑھ کر تعلیم یافتہ کہلائیں۔

لیکن تعلیم حاصل کر لینے سے اردو زبان عام نہیں ہوتی۔ اپنے ملک کی تعلیمی شرح یہ ثابت کرتی ہے۔ کسی بھی زبان کو عوام تک پہنچانے کے لیے اس میں دلچسپی اور اثر انگیزی پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ غالب کے دور میں بھی [illegible] ادب تھا، جو [illegible] ادب اعلا ما ہے۔ ہماری زبان کی اشاعت اور ترویج میں مترجم تیرتھ رام فیروز پوری کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس کے بعد ابن صفی مرحوم نے ہر طبقے میں پڑھنے کا چسکا پیدا کیا۔ اردو کی پہلی، دوسری کتاب پڑھنے یا اٹک اٹک کر پڑھنے والے اس زبان کی لطافت اور چٹخارے کو سمجھنے لگے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ برصغیر میں اردو زبان کو آفاقی شہرت دینے والوں کی فہرست میں پہلا نام ابن صفی کا ہونا چاہیے۔

موجودہ دور ڈائجسٹوں کا دور ہے۔ ان ڈائجسٹوں نے ہماری زبان کو شہر شہر گاؤں گاؤں گلی گلی اور گھر گھر تک پہنچانے کا جو کارنامہ انجام دیا ہے، اس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ ایک مخصوص حلقہ کہتا ہے کہ ڈائجسٹ پڑھ کر ہمارے بچے بگڑتے ہیں اور بچے کہتے ہیں کہ ہمارے بزرگ بگڑتے ہیں۔

ڈائجسٹوں کی ابتدا میں کچھ بے راہ روی تھی۔ بچہ چلنا شروع کرتا ہے تو ڈگمگاتا ہے، گرتا ہے اور سنبھلتا جاتا ہے۔ آج یہ ڈائجسٹ مثبت انداز کی تعمیری کہانیاں پیش کر رہے ہیں۔

ڈائجسٹوں نے جہاں پڑھنے والوں کا وسیع حلقہ پیدا کیا ہے وہاں اردو کو نئے لکھنے والے بھی دیے ہیں۔ ایسے لکھنے والے جن کی تحریروں کا قارئین بے چینی سے انتظار کرتے ہیں۔ جن مصنفین کی تحریروں کا شدت سے انتظار کیا جاتا ہے ان میں ایک محی الدین نواب بھی ہے۔

ایک سچا ادیب اپنے ماحول اور معاشرے سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ جن معاشرتی خامیوں اور برائیوں پر ایک عام آدمی کڑھ کر رہ جاتا ہے، مصنف انہیں اس انداز سے قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے کہ پڑھنے والے کے دل میں ان کی طرف سے نفرت پیدا ہوتی ہے اور یوں مصنف کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

محی الدین نواب نے بے شمار معاشرتی اور سماجی کہانیاں لکھی ہیں، اور قارئین کے ایک وسیع حلقے سے داد و تحسین وصول کی ہے۔ نواب کی تحریر کی دوسری بڑی خوبی اس کی دلچسپی اور رواں اندازِ بیان ہے۔ چھوٹے چھوٹے، تیز، نوکیلے فقرے آپ کو نواب کی ہر کہانی میں نظر آئیں گے۔ بات سے بات پیدا کرنا اور باتوں ہی باتوں میں کام کی باتیں کہہ جانا نواب کی تحریر کی ایسی خصوصیت ہے جو عام طور پر مصنفین میں نظر نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ سسپنس اور جاسوسی ڈائجسٹ کے لاکھوں قارئین ہر ماہ بے چینی سے نواب کی تحریروں کا انتظار کرتے ہیں۔

معراج رسول

کچرا گھر

❁

تمہارے تھوکنے کے لیے اُگالدان ہے

تمہاری غلاظتیں کچھ دریا اور

کچھ گٹر میں بہہ جاتی ہیں۔

تمہارے گھر کا کوڑا کرکٹ میونسپلٹی کے کچرا گھر میں

جمع ہوتا ہے۔

لیکن ابتدائے تہذیب سے آج تک

تم نے کوئی کچرا گھر نہیں بنایا، جہاں

تم اپنی نفرتوں اور عداوتوں کو پھینک کر آسکو۔

بچوں کے عالمی سال پر لکھی گئی یہ کہانی تہذیب

کے منہ پر جھاڑو پھیرتی ہے۔

کچرا گھر

۳۱ دسمبر ۱۹۷۸ء کی رات ہے۔ آدھی رات کو ٹھیک بارہ بجے کی پہلی "ٹن" کے ساتھ یہ سال گزر جائے گا۔ پھر بارہ بجے کی آخری "ٹن" کے ساتھ بچوں کا عالمی سال شروع ہو جائے گا۔ ابھی گھڑی کا چھوٹا کانٹا بارہ پر ہے اور بڑا کانٹا بارہ پر آنے والا ہے۔ جب دونوں کانٹے مل جائیں گے اور بارہ بج جائیں گے تو پھر اس دنیا کے تمام بڑے کانٹے پھول جیسے بچوں کے بارہ بجانا شروع کر دیں گے۔

دسمبر کی رات سرد اور کہر آلود ہے۔ کہر کے دھند لکے میں ایک کچرا گھر کی چار دیواری نظر آ رہی ہے۔ آس پاس جتنے مکانات اور دکانیں، اسکول اور پارک وغیرہ ہیں ان سب کا کچرا وہاں آ کر جمع ہوتا رہتا ہے۔ اب وہ کچرا گھر ہاؤس فل ہو چکا ہے۔ ایک پیٹو کی طرح بد ہضمی کا شکار ہو کر قے کر رہا ہے اور کچرے کو باہر سڑک کی طرف اگلتا جا رہا ہے۔

اب دونوں کانٹے مل رہے ہیں۔ گھڑی کا پنڈولم لرزتے ہوئے پہلی آواز دے رہا ہے۔ ٹن......

ٹن...... ایک بڑی سی قیمتی کار سڑک کے کنارے آ کر رک رہی ہے۔ اس کی ہیڈ لائٹیں بجھ رہی ہیں۔ کار کے اندر تاریکی ہے۔ اگلی سیٹ پر دو سائے نظر آ رہے ہیں۔ وہ انسان ہیں مگر تاریکی میں وہ بھوت نظر آ رہے ہیں۔

ٹن...... وہ کار میں چھپے ہوئے محتاط نظروں سے باہر دور تک دیکھ رہے ہیں۔ وہ مجرم ہو سکتے ہیں۔

ٹن...... وہ جاسوس ہو سکتے ہیں۔ چھپ کر یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ جرائم کی تکمیل کیسے ہوتی ہے؟

ٹن...... وہ میونسپلٹی کے آفیسر ہو سکتے ہیں جو یہ سمجھنے آئے ہیں کہ ان کے محکمے کے لوگ اس کچرا گھر میں کچرے کی تاریخ کیسے مرتب کر رہے ہیں؟"

ٹن...... ایک سایہ کار کا دروازہ کھول کر باہر آگیا ہے اور اب پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول رہا ہے۔

ٹن...... دروازہ کھلنے سے کار کے اندر دھیمی سی روشنی ہو جاتی ہے۔ اس روشنی میں پچھلی سیٹ پر کچرا نظر آرہا ہے۔"

ٹن...... ہمارے شہروں میں کچرا پھینکنے والوں کے لئے معقول انتظام نہیں ہے۔ کچرا گھر گھر سے اتنی دور ہوتا ہے کہ بعض بیچاروں کو کار میں کچرا لاد کر لانا پڑتا ہے۔

ٹن...... اس نے کچرے کی باسکٹ اٹھالی ہے اور پچھلا دروازہ بند کر رہا ہے۔

ٹن...... رات بڑی سرد ہے۔ وہ باسکٹ اٹھائے تھر تھر کانپ رہا ہے اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے کچرا گھر کی طرف بڑھتا جا رہا ہے۔ ٹن...... بچوں کا عالمی سال۔ کچرے کی سیج باہر تک بچی ہے۔ اس نے اس سیج پر باسکٹ رکھ دی ہے اور اب واپس جا رہا ہے۔

آخری ٹن...... بچوں کا عالمی سال شروع ہو چکا ہے۔ باسکٹ کی گود میں ایک بچہ رو رہا ہے۔ نئے سال کی پہلی آواز سنا رہا ہے۔

کچرے کی تعریف یہ ہے کہ غیر ضروری سامان، تن کی غلاظتیں اور انسان کی نجاستیں جو گھر سے باہر پھینکی جاتی ہیں، وہ کچرا کہلاتی ہیں اور کچرا گھر کی تعریف یہ ہے کہ کوئی انگلی اٹھا کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ کون سا کچرا کس کے گھر سے آیا ہے۔ وہ سارے عالم کا کچرا ہے اور وہاں وہ سارے عالم کا بچہ ہے۔ وہ بچہ میرا ہے، وہ آپ کا ہے اور وہ بچہ آپ سب کا ہے۔ عالمی سال کا عالمی بچہ ہے۔

میرا نام نظام ہے۔ چونکہ میں بوڑھا ہوں اس لئے تمام بچے مجھے نظام بابا کہتے ہیں۔ میں مملکت کچرا آباد کا حاکم ہوں۔ میرے حکم کے بغیر کچرے کا ایک تنکا بھی ادھر سے ادھر

نہیں ہل سکتا ہے اور نہ ہی کوئی بچہ میری اجازت کے بغیر ٹوٹے پھوٹے کھلونے اور روٹی کے ٹکڑے وہاں سے چن سکتا ہے۔ میرے پاس ہمیشہ ایک چابک رہتا ہے۔ اسے دیکھ کر کچرا چننے والے بوڑھے اور بچے سہم کر دور بھاگ جاتے ہیں یا پھر میرے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔

میں گرمی کے موسم میں کچرا گھر کے باہر سوتا ہوں۔ سردی اور بارش کے دنوں میں کوڑا کرکٹ کا کچھ حصہ اس گھر سے باہر نکال دیتا ہوں۔ اس طرح وہاں میرے رہنے اور سونے کی جگہ بن جاتی ہے۔

اس رات میں بڑے آرام سے کچرے کی سیج پر سو رہا تھا کہ اچانک ہی آنکھ کھل گئی۔ ایک بچے کے رونے کی آواز آرہی تھی، آواز بہت ہی قریب تھی۔ میں نے کچرا گھر سے سر نکال کر دیکھا۔ پہلے تو کچھ نظر نہ آیا پھر ایک کار اسٹارٹ ہو کر مڑنے لگی تو اس کی ہیڈ لائٹوں کی روشنی گھومتی ہوئی ایک باسکٹ پر سے پھسلتی ہوئی گزر گئی۔ اس کے بعد وہ کار تیز رفتاری سے بھاگتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

بچہ رو رہا تھا۔ شاید اسے ٹھنڈ لگ رہی تھی۔ میں کچرے پر سے چاروں ہاتھ پاؤں سے رینگتا ہوا باسکٹ کے پاس آیا اور اسے قریب کھینچ کر اس کے اندر ہاتھ ڈالا۔ بچہ کمبل میں لپٹا ہوا تھا۔ صرف اس کا سر کمبل سے باہر تھا۔ وہاں کچھ تاریکی تھی اور کچھ میری نظریں کمزور تھیں۔ اس کی صورت نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بس اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ بچہ نہیں بچی ہے۔

میں نے کمبل سمیت اسے اٹھا کر سینے سے لگایا پھر وہاں سے اٹھ کر دور دور تک دیکھتے ہوئے چیخنے لگا۔

"یہ بچی کس کی ہے؟ اسے کس نے یہاں پھینکا ہے؟ ارے یہ کچرا نہیں ہے......"

میں چیختے ہوئے بچی کو اٹھائے ادھر سے ادھر بھاگنے لگا۔ شاید اسے چھوڑنے والے نظر آجائیں۔ شاید میری آواز پر کسی باپ کی غیرت واپس آجائے۔ بچی آواز دے رہی تھی۔ شاید کسی ماں کی ممتا جاگ جائے۔ مگر یہ رات کی تاریکی بڑی حرام زادی ہوتی ہے۔ حرام جننے کے بعد گونگی بہری بن جاتی ہے۔

میں چیختے چیختے تھک گیا۔ مجھے سردی لگ رہی تھی۔ میرے دانت بج رہے تھے۔ بچی

بھی روئے جا رہی تھی۔ میں باسکٹ اٹھا کر کچرا گھر میں آ گیا۔ اسی وقت بچی تھوڑی دیر کے لئے چپ ہو گئی۔ شاید اسے حرارت مل رہی تھی۔ کوڑا کرکٹ کے ڈھیر میں بڑی گرمی ہوتی ہے۔ سگریٹ کے ٹوٹے سے بکھرے ہوئے تمباکو کی بو۔ مچھلی' گوشت اور انڈے وغیرہ کی بساند' باسی چیزوں کی سڑاند اور طرح طرح کی بدبوئیں جن کو نام نہیں دیئے جا سکتے لیکن جن کی تاثیر سمجھ میں آتی ہے۔ اس ساری عفونت کے باعث کچرا گھر کی فضا گرم ہو جاتی ہے۔

جب وہ حرارت پا کر چپ ہوئی تو میں سوچنے لگا۔ اس بچی کا کیا کروں؟ اسے کہاں چھوڑ کر آؤں؟ میں نے آج تک اپنے گھر کا کچرا کسی دوسرے کے دروازے پر نہیں پھینکا۔ دوسروں کی پھینکی ہوئی چیزوں کو سمیٹتا رہا ہوں۔ اب تقدیر نے زندہ کچرا لا کر میری گود میں ڈال دیا تھا۔ مجھے بچے پالنا نہیں آتا تھا۔ میں بھلا اس کی پرورش کیسے کر سکتا تھا؟

وہ پھر رونے لگی۔ بڑی نخریلی تھی۔ کسی بڑے گھر کی بیٹی تھی۔ میں "او۔ او۔ آ۔ آ۔ کی آوازیں نکالتے ہوئے اسے اپنے بازوؤں میں جھلانے لگا لیکن وہ چپ نہیں ہو رہی تھی۔ یقیناً اسے بھوک لگ رہی تھی۔ میں اسے دودھ کہاں سے پلاتا؟ بڑے گھر کے لوگ دودھ کے ڈبے پھینکتے تو انہیں کھرچنے سے تھوڑا بہت دودھ کا پاؤڈر نکل آتا تھا لیکن اس وقت وہ بھی نہیں تھا۔

پھر میں نے سوچا کہ جو اسے چھوڑ گیا ہے' وہ اس کا گلا دبا کر مار بھی سکتا تھا لیکن اس خیال سے چھوڑ گیا ہے کہ شاید زندہ بچ جائے۔ اگر ایسا ہے تو پھر اس کی زندگی کا کچھ سامان بھی کیا ہوگا۔ اس خیال کے آتے ہی میں باسکٹ میں ہاتھ ڈال کر ٹٹولنے لگا۔ وہاں بچی کے چھوٹے چھوٹے لباس تھے۔ لباس کے اندر کاغذوں کی ایک گڈی بھی تھی۔ سکہ رائج الوقت اندھیرے میں نظر آ جاتا ہے۔ نوٹوں کی بو ہزاروں میں پہچانی جا سکتی ہے۔ میرا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ وہ بچی تو میرا مقدر چمکانے آئی تھی۔

وہ کتنی رقم ہوگی؟ نوٹوں کو گننے کے لئے دل مچل رہا تھا لیکن وہ رو رہی تھی۔ اس کی آواز سن کر رات کو پہرہ دینے والا چوکیدار یا گشت کرنے والے سپاہی آ سکتے تھے اور ہاتھ آئی ہوئی دولت تک پہنچ سکتے تھے۔ میں نے باسکٹ کی مزید تلاشی لی تو ایک چھوٹی سی شیشی ہاتھ میں آئی اسے کھول کر سونگھنے سے پتہ چلا کہ شہد ہے۔ میں نے فوراً ہی ایک انگلی شہد

میں بھگو کر بچی کے منہ میں رکھ دی۔ وہ ایک دم سے چپ ہو گئی۔

وہ میری انگلی کو چوس رہی تھی۔ اس کے ننھے سے ہونٹ ایسے ملائم تھے کہ مکھن کی ملائمت بھی کچھ نہ ہوگی۔ وہ میری انگلی کو منہ میں کھینچ رہی تھی اور میرا دل اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ ماؤں کے دل کتنی شدت سے اپنی تخلیق کی طرف کھنچے جاتے ہوں گے۔ سچ کہتا ہوں' اس وقت میرے اندر ممتا پیدا ہو رہی تھی۔ ایسا یقین پیدا ہو رہا تھا کہ وہ ساری کی ساری میری ہے۔ میں اب تک کچروں کا مالک تھا۔ اب ایک جیتی جاگتی بچی کا بلا شرکت غیرے مالک بن گیا تھا۔

وہ انگلی چوستے چوستے سو گئی۔ میں نے بڑی آہستگی سے اسے سوکھی گھاس اور سڑی ہوئی سبزیوں کے بستر پر سلا دیا۔ اس کی ماں اگر سنگ دل نہیں ہوگی' تو اپنی ایئر کنڈیشنڈ خواب گاہ کے معطر ماحول میں اس بدبو سے گھبرا کر بار بار سانس روک رہی ہوگی جو اس کی نوزائیدہ بیٹی کے بستر سے اٹھ رہی تھی۔ ایسی بدنصیب بدعقل عورتیں بھی ہوتی ہیں جو اپنے بدن کی خوشبو نوچ کر پھینک دیتی ہیں اور ساری عمر پچھتاوے کی بدبو میں سانس لیتی رہتی ہیں۔

میں نے نوٹوں کی گڈی اٹھائی۔ اس گڈی میں سو سو کے نوٹ تھے۔ میں نے گنتی شروع کی ایک سے پچاس تک گنتا چلا گیا یعنی پورے پانچ ہزار روپے تھے۔ مجھے یاد نہیں آیا کہ میں نے کبھی اتنے سارے روپے اکھٹے دیکھے تھے۔ وہ روپے اب میرے تھے۔ بالشت بھر کی بچی انہیں خرچ نہیں کر سکتی تھی۔ اتنی بڑی رقم اس کے ساتھ اس لئے رکھی گئی تھی کہ اسے اٹھانے والا بچی کو بھی اٹھائے۔ دوسرے لفظوں میں وہ بچی کو گود لینے کا معاوضہ تھا۔

لیکن اتنی بڑی رقم دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے کہ میں اسے کہاں چھپاؤں؟ پولیس والے مجھے اس رقم کے ساتھ دیکھ کر یہی کہیں گے کہ میں نے کسی کے گناہ کو چھپانے کا معاوضہ لیا ہے پھر وہ میرے پیچھے پڑ جائیں گے کہ میں بچی کے ماں باپ کا نام پتا بتاؤں۔ نہیں بتا سکوں گا تو ڈنڈے پڑیں گے۔ میں بینک میں اکاؤنٹ نہیں کھول سکتا تھا۔ کیونکہ میں بعض سیاسی پارٹیوں کی طرح حساب نہیں دے سکتا تھا۔ یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ پانچ ہزار کی فارن ایڈ مجھ تک کیسے پہنچی ہے؟

دولت آتی ہے تو پریشانیاں لے کر آتی ہے۔ مزید پریشانی یہ تھی کہ وہ رقم کوڑا کرکٹ کی تہ میں چھپا کر نہیں رکھ سکتا تھا۔ میونسپلٹی والوں کی طرف سے خطرہ نہیں تھا کہ وہ کچرا گھر کی صفائی کے لئے آئیں گے۔ خطرہ سیاسی لیڈروں سے تھا۔ الیکشن کے دن قریب آرہے تھے۔ لیڈر حضرات اپنی کارکردگی سے متاثر کرنے کے لئے اپنے اپنے علاقوں میں اسکول اور ہسپتال کھولنے' سڑکیں بنوانے' پانی فراہم کرنے اور تمام علاقوں کو صاف ستھرا رکھنے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ کسی دن وہ مہتروں کو لے کر اس کچرا گھر کی صفائی کے لئے بھی آسکتے تھے۔ اس لئے میں وہ رقم کچرے کی تہ میں چھپا کر نہیں رکھ سکتا تھا۔

سوچتے سوچتے بہت دیر ہوگئی۔ رات گزرنے لگی۔ تب سمجھ میں آیا کہ دولت آتی ہے تو نیند کیوں نہیں آتی۔ غریب دولت مند چوروں کے ڈر سے نہیں سوتے اور امیر دولت مندوں کو انکم ٹیکس والے سونے نہیں دیتے۔ آخر میرے دماغ نے سمجھایا کہ میں یہ دولت لے کر کیا کروں گا؟ مجھے تینوں وقت جھوٹا اور باسی کھانے کو مل جاتا تھا۔ پہننے کے لئے چیتھڑے میسر تھے۔ رہنے کے لئے مکان تھا۔ دل میں کوئی آرزو نہیں تھی ورنہ اس کی تکمیل کے لئے پیسوں کی ضرورت ہوتی۔ جینے کی امنگ بھی نہیں تھی کہ مستقبل کے لئے بچت اسکیم پر عمل کرتا۔ پھر رقم میرے کس کام آسکتی تھی؟

بے شک میں اتنی بڑی رقم دیکھتے ہی خوشی سے کھل گیا تھا۔ یہ اس لئے کہ انسان کو دولت کی ہوس ورثے میں ملتی ہے۔ پیسے کی ضرورت ہو یا نہ ہو' اسے دیکھ کر ضرور خوشی ہوتی ہے۔ بہرحال جلد ہی یہ بات سمجھ میں آگئی کہ مجھے خوش نہیں ہونا چاہئے۔ میں نے اپنی زندگی میں جتنا پایا' اس سے زیادہ کھو دیا۔ یہ رقم اور یہ بچی صبح ہوتے ہی چلی جائیں گی۔

کچرا آباد کی صبح اس طرح ہوتی ہے کہ اذان کے بعد سب سے پہلے میری حکومت کا راشننگ آفیسر آتا ہے۔ وہ بارہ برس کا ایک لڑکا ہے۔ اس کا نام کھاتو ہے۔ اس لئے کہ بہت کھاتا ہے۔ اس کی ڈیوٹی یہ ہے کہ باہر سے کھانے کا جتنا سامان میری مملکت میں پھینکا جاتا ہے وہ ان سب کو بٹور کر ایک جگہ رکھتا ہے۔ آس پاس کے فلیٹ' کوٹھیوں اور دکانوں سے صبح پانچ بجے سے لے کر دن کے گیارہ بجے تک ہمارے لئے ناشتہ پہنچتا رہتا ہے۔ گیارہ بجے سب سے پہلے اچھی چیزوں کا انتخاب کرکے میں خود کھاتا ہوں۔ کھاتو اور

کچرا چننے والے دوسرے بچے میرا منہ تکتے رہتے ہیں۔ جب میرا پیٹ بھر جاتا ہے تو کھاتو میرا جھوٹا کھانے کے لئے بیٹھتا ہے اور دوسرے بچے اسی طرح منہ تکتے رہتے ہیں پھر اس کا جھوٹا کھانا کھانے کے لئے دس برس کی ایک لڑکی کچرے کے دسترخوان پر آکر بیٹھتی ہے۔

اس لڑکی کا نام سکینہ ہے۔ کچرا آباد میں جو خالی ڈبے اور خالی بوتلیں درآمد ہوتی ہیں' انہیں سکینہ سنبھال کر رکھتی ہے۔ چھوٹے بڑے کاغذات چن کر ان کا پلندہ بنا کر باندھتی ہے۔ یہ تمام مال' ردی اور شیشے بوتل خریدنے والوں کو فروخت کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد دوسرے بچے' راشد' خالدہ' للو اور منور وغیرہ اس کچرے سے بھوسی ٹکڑے' ٹوٹے ہوئے کھلونے' بٹن اور ہیرپن جیسی بہت سی چیزیں نکال کر جمع کرتے ہیں۔ تمام دن محنت کرتے ہیں۔ اس لئے میں انہیں تین وقت بچا ہوا کھانا دیتا ہوں۔ ردی بیچنے سے جو تھوڑی بہت رقم ہاتھ آتی ہے۔ اس میں سے مہتروں کو دیتا ہوں تاکہ وہ صفائی نہ کریں۔ پولیس والوں کو دیتا ہوں تاکہ وہ مجھے کچرا گھر سے بے دخل نہ کریں۔ کچھ اپنے کھانسی بخار کے لئے رکھتا ہوں۔ باقی پیسے بچوں میں تقسیم کردیتا ہوں۔

○☆○

نئے سال کی پہلی صبح میری گود میں ایک ننھی سی بچی کو دیکھ کر تمام بچے ٹھٹک گئے۔ وہ بچی اتنی حسین تھی کہ اس گندگی کے ڈھیر میں اسے دیکھ کر خود مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ میری گود میں رکھی ہوئی ہے لیکن دوسرے بچے کچھ اور ہی سوچ کر ٹھٹک گئے تھے۔ راشد نے پوچھا۔

"نظام بابا یہ بھی ہمارے حصے سے کھایا کرے گی؟"

وہ بڑا اہم سوال تھا۔ کوئی اپنے حصے کی روٹی کسی کو نہیں دینا چاہتا۔ کچرا آباد کی آبادی میں ایک بچی کا اضافہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔ میں نے کہا۔

"فکر نہ کرو میں اس بچی کو ٹھکانے لگا کر آتا ہوں۔ میرے واپس آنے تک کوئی یہاں کھانے میں بے ایمانی نہ کرے۔ ورنہ میں چابک سے کھال ادھیڑ ڈالوں گا۔"

میں بچی کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر وہاں سے اٹھ گیا۔ کتنے ہی لڑکے لڑکیاں صاف ستھرے لباس پہنے اسکول جارہے تھے۔ ایک دکاندار نے پوچھا۔

"اے بڈھے کیا لے جا رہا ہے؟"

"ایک بچی ہے۔"

"کس کی ہے؟"

"آپ ہی کی ہے جی......."

وہ ہنسنے لگا۔ پتا نہیں لوگ بات سمجھے بغیر کیوں ہنس دیتے ہیں۔ آگے ایک فلیٹ کے دروازے پر ایک عورت اپنے بیٹے کو اسکول کے لئے رخصت کر رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔

"نظام بابا! اتنے صاف ستھرے کپڑے میں کیا لے جا رہے ہو؟"

میں نے قریب پہنچ کر اسے بچی دکھائی۔ وہ حیرانی سے بولی۔

"اللہ کتنی خوب صورت ہے۔ کس کی ہے؟"

"آپ ہی کی ہے بی بی جی!"

"اے خدا نہ کرے کہ میری ہو۔" وہ ناراض ہوگئی۔ "کیا مجھے میرے میاں سے جوتیاں کھلانا چاہتے ہو۔ سچ بتاؤ۔ اسے کہاں سے لائے ہو؟"

"بی بی جی! میں کسی کچرے کا حساب نہیں لگا سکتا کہ وہ کس کے گھر سے آیا ہے۔ اس کچرا گھر میں بہت سی قابل نفرت اور شرمناک چیزیں آتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔"

میں آگے بڑھ گیا۔ میرے ساتھ ساتھ اس علاقے میں یہ بات پھیل گئی کہ کچرا گھر کے بڈھے کی گود میں کوئی ایک نوزائیدہ بچی کو چھوڑ گیا ہے۔ میں سوالوں اور جوابوں سے گزرتا ہوا پولیس اسٹیشن کے احاطے میں پہنچ گیا۔ سپاہی نے مجھے اندر نہیں جانے دیا۔ میرے بدن پر گرد و غبار کی اتنی تہیں جمی رہتی ہیں کہ لوگ مجھے دیکھتے ہی ناک سکوڑنے لگتے ہیں۔ اتفاق سے تھانے کا انچارج اس وقت ڈیوٹی پر حاضر ہونے کے لئے آ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"جناب! کل رات کچرا گھر میں کوئی اس بچی کو چھوڑ گیا ہے؟"

تھانیدار کی بھویں سکڑ گئیں۔ تیور بدل گئے۔ اس نے غرا کر پوچھا۔

"ہوں کوئی چھوڑ کر گیا ہے یا تمہیں دے گیا ہے؟ اندر آؤ۔"

آخر وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ اگر کوئی چوری کا مال پاکر واپس کرنے جائے تو تھانے کے دروازے پر پہنچتے ہی خود چور کہلانے لگتا ہے۔ تھانیدار نے دفتر کے کمرے میں پہنچتے ہی میز پر سے بید کی لمبی چھڑی اٹھالی پھر گرج کر کہا۔

"سچ سچ بتادے۔ اگر کسی رئیس کی بچی ہے تو میں اس سے نمٹ لوں گا۔"

"جناب! یہ کسی بہت ہی مالدار کی بیٹی ہے مگر میں اسے جانتا نہیں ہوں۔"

"ابے جب تو جانتا نہیں ہے تو یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ بہت مالدار ہے؟"

"وہ ایسے معلوم ہوا جی کہ جس باسکٹ میں یہ بچی تھی' اس میں پانچ ہزار روپے بھی تھے۔"

"پانچ ہزار!" تھانیدار کے ہاتھ سے چھڑی گر پڑی۔ وہ ایک دم سے محتاط ہوگیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا لیکن ایک سپاہی کمرے میں داخل ہونا چاہ رہا تھا۔ اس نے سپاہی سے کہا۔

"تم دروازہ بند کر کے باہر کھڑے رہو۔ میں اس بڈھے سے بچی کے ماں باپ کا پتا معلوم کر رہا ہوں۔"

سپاہی نے جا کر دروازہ بند کر دیا۔ تھانیدار نے بڑی رازداری سے پوچھا۔

"کہاں ہیں وہ پانچ ہزار؟"

میں نے بچی کو میز پر لٹا دیا پھر اپنے میلے چیکٹ اوور کوٹ کی اندرونی جیب سے پانچ ہزار کی گڈی نکال کر اس کے آگے رکھ دی۔ اس نے لپک کر اسے اٹھایا محتاط نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا پھر نوٹ گننے لگا اور ہانپنے لگا۔ اضطراب کی حالت میں بار بار گنتی بھولنے لگا۔ پھر گڈی کو جیب میں ٹھونستے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہی ہوں گے۔ میں جانتا ہوں تم بہت ایماندار ہو۔ ایک عرصے سے اس کچرا گھر میں رہتے آ رہے ہو۔ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو میں اسے حوالات میں بند کر دیتا۔"

"مہربانی ہے جناب! اب میں جاؤں۔"

"ٹھہرو میں ابھی رپوٹ لکھوں گا۔ پھر آج کسی وقت اخبارات کے رپوٹرز اور فوٹو گرافرز تمہارے پاس آئیں گے۔ تم ان سے کہنا کہ باسکٹ میں صرف بچی تھی۔ پانچ ہزار کا ذکر نہ کرنا۔"

"نہیں کروں گا۔ اب میں جاؤں۔"

"ہاں۔ مگر اچھی طرح یاد رکھو۔ پانچ ہزار کا ذکر کسی کے سامنے نہ کرنا ورنہ میں تمہیں کچرا گھر سے بھگا دوں گا۔"

"نہیں جناب! ایسی غلطی کبھی نہیں کروں گا۔ آپ مجھے وہاں سے نہ نکالیں۔"

"اچھا جاؤ۔ میں رپوٹ درج کرلوں گا۔"

میں دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے ڈانٹ کر بچی کی طرف اشارہ کیا۔

"ابے اس لعنت کو تو لے جا۔"

میں نے پلٹ کر بچی کی طرف دیکھا پھر پریشان ہو کر پوچھا "آ۔ آپ اسے تھانے میں جمع نہیں کریں گے؟"

"تیرا دماغ چل گیا ہے۔ یہ کوئی جمع کرنے والی چیز ہے؟ اٹھا کر لے جا' اس حرام کی اولاد کو......"

کیسی عجیب بات ہے' وہ بچی حرام سمجھی جا رہی تھی۔ اس کے پیسے حرام نہیں تھے۔ تھانیدار نے سپاہی کو دروازہ کھولنے کے لئے کہا۔ میں نے بچی کو اٹھالیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"بچی کی ذمے داری تجھ پر ہے۔ اگر تو اسے کہیں پھینکے گا یا ہماری اجازت کے بغیر کسی کو دے گا تو پھر سمجھ لے تیری شامت آجائے گی۔"

میں بوجھل قدموں سے چلتا ہوا پولیس اسٹیشن سے باہر آگیا۔ پانچ ہزار کا بوجھ سر سے اتر گیا تھا۔ اب میں رات کو آرام سے سو سکتا تھا۔ صرف وہ بچی مصیبت بن کر چپک گئی تھی۔ اب تو اس کی ذمے داری بھی مجھ پر عائد کردی گئی تھی۔ میں بڑبڑاتا ہوا اپنے محلے میں داخل ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی ایک سرے سے دوسرے سرے تک یہ خبر پھیل گئی کہ نظام بابا بچی کو لے کر واپس آرہا ہے۔

دکانوں سے لوگ باہر آگئے۔ مکانوں کے کھڑکی دروازے کھلتے چلے گئے۔ موٹر ورکشاپ میں کام کرنے والے مجھے دیکھنے لگے۔ زیر تعمیر بلڈنگ کی نچلی منزل سے پانچویں منزل تک کام کرنے والے مزدور کام چھوڑ کر دور سے ہی گود کی بچی کو دیکھ رہے تھے۔

جہاں جہاں سے میں گزرتا تھا' وہیں سے آوازیں آتی تھیں۔ کوئی پوچھتا تھا۔

"کیا یہ زندہ ہے؟"

کسی نے مشورہ دیا۔ "اسے تھانے میں لے جا کر رپورٹ لکھواؤ۔"

کسی نے پوچھا۔ "کون اسے چھوڑ گیا تھا؟ کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟"

میں انہیں جواب دیتا ہوا ایک گلی میں داخل ہوا۔ ایک عورت نے نفرت سے تھوک کر دروازہ بند کرلیا۔ ذرا آگے بڑھا تو ایک عورت نے کھڑکی سے سرگوشی کی۔

"اے ذرا دکھاؤ تو؟"

میں نے کھڑکی کے قریب جا کر اسے دکھایا۔ بچی رونے لگی۔ عورت نے کہا۔

"ہائے کتنی خوب صورت ہے۔ اسے بھوک لگ رہی ہے۔"

"بی بی جی! آپ کے بچے کا جھوٹا دودھ ہو تو دے دیں۔ میں اسے پلاؤں گا۔"

دوسری کھڑکی سے ایک بوڑھی عورت نے کہا۔

"اے بڈھے! بچی کو دو دن تک دودھ نہ پلانا۔ صرف شہد چاٹنے کے لئے دینا۔"

میں جلدی جلدی کچرا گھر کی طرف جانے لگا تاکہ شہد چٹا کر اسے چپ کرا سکوں۔ آگے ایک مکان کا دروازہ کھلا۔ ایک مرد نے چھوٹی سی شیشی بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ لو' اس میں شہد ہے۔"

میں شہد لینے کے لئے آگے بڑھا۔ اس سے پہلے ہی ایک عورت نے اس مرد کا ہاتھ پکڑ کر اسے مکان کے اندر کھینچ لیا۔ دروازہ ایک دھڑاکے سے بند ہوا۔ پھر اندر سے آواز آنے لگی۔ وہ بول رہی تھی۔

"آپ کو اس سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟ سچ سچ بتائیے کیا یہ آپ کی اسی چہیتی نے تو جن کر نہیں پھینکا۔"

مرد کی آواز آئی۔ "بانو! میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ آہستہ بولو ورنہ محلے والے مجھے سچ مچ گناہ گار سمجھیں گے۔ پولیس والے مجھے پکڑ کر لے جائیں گے۔"

"آپ میرے سر کی قسم کھائیں کہ آپ شازیہ سے نہیں ملتے ہیں۔"

"میں تمہارے سر کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے پچھلے تین ماہ سے شازیہ کو دیکھا بھی نہیں ہے۔"

میں نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا۔

"بھائی جی آپ تین ماہ سے نہیں ملے مگر تین ماہ پہلے تو کسی شازیہ سے ملے تھے۔ یہ

بچی تو نو ماہ کا سفر کر کے آئی ہے۔ بس میں سمجھ گیا۔ اب باہر آ کر بچی کو لے لو۔"

میری بات پوری ہوتے ہی دروازہ کھلا۔ دو ہاتھوں نے ایک جھٹکے سے مجھے اندر کھینچا پھر دروازہ بند ہو گیا۔ بچی اب تک رو رہی تھی۔ شازیہ کے عاشق نے کہا۔

"یہ لو شہد پہلے بچی کو چپ کراؤ۔"

میں نے بچی کو اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں کیوں چپ کراؤں۔ تمہاری بچی ہے۔ تم سنبھالو۔"

اس شخص نے مجھے غصے سے دیکھا' پھر اپنی بیوی سے کہا۔

"بانو! دیکھو تمہارے ذرا سے شک نے میرے لئے کیسی مصیبت کھڑی کر دی ہے۔ کیا تمہارا چیخنا کم تھا کہ اب یہ بچی بھی میرے خلاف چیخنے لگی ہے۔ ارے خدا کے لئے اسے چپ کراؤ۔"

اسے بھلا کون چپ کراتا؟ وہ میری نہیں تھی۔ وہ بانو کی بھی نہیں تھی۔ گناہ گار خود اپنے گناہ کی آواز کو دباتا ہے۔ مجبوراً شازیہ کے عاشق نے بچی کو مجھ سے لے لیا پھر شہد میں انگلی ڈبو کر اس کے چیختے ہوئے منہ میں ڈال دی۔ بچی فوراً ہی چپ ہو گئی۔ تب بانو نے ہاتھ نچا کر کہا۔

"ہاں۔ اب بتاؤ۔ یہ تمہاری نہیں ہے تو تمہارے پاس آتے ہی چپ کیسے ہو گئی؟"

اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"خدا کے لئے عقل سے کام لو۔ یہ میرے پاس آ کر نہیں' شہد کی مٹھاس پا کر چپ ہوئی ہے۔"

"شہد کی مٹھاس پا کر نہیں' اپنے باپ کی مٹھاس پا کر۔ آپ مجھے بے وقوف نہیں بنا سکیں گے۔"

شوہر نے بڑی بے بسی اور عاجزی سے کہا "اے میری شریک حیات! اگر تم میری زندگی کی ساتھی ہو تو میری جان کی دشمن نہ بنو۔ ذرا عقل سے کام لے کر یہ سوچو کہ یہ بات جب گھر کی چار دیواری سے باہر جائے گی تو لوگ مجھے گناہ گار سمجھ کر پتھر ماریں گے۔ میری بے عزتی ہو گی اور مجھے جان سے مار ڈالا جائے گا۔ کیا تم بیوہ ہو کر زندگی گزار سکو گی؟"

بانو گھبرا گئی۔ ہچکچاتے ہوئے بولی

"م۔ میں باہر والوں سے کہنے نہیں جا رہی ہوں گھر کے اندر ہی اپنے نصیبوں کو رو رہی ہوں۔"

"تم اپنے نصیبوں کو رو رہی ہو۔ یہ نہیں سمجھتیں کہ یہ نظام بابا گھر سے باہر جا کر سارے محلے میں ڈنکا پیٹنا شروع کر دے گا کہ یہ بچی میری ہے۔ تب کیا ہو گا؟"

تب بانو کو جیسے عقل آ گئی۔ اس نے گھور کر میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارے اس کی کیا مجال ہے۔ یہ تو ہمارا پھینکا ہوا کھاتا ہے۔ ہمارا کھائے گا اور ہم پر ہی غرائے گا؟ واپس کرو اس کی بچی........"

اس نے بچی کو واپس دیا۔ میں لینا نہیں چاہتا تھا لیکن میرے ہاتھ آپ ہی آپ آگے بڑھ گئے۔ یہ ایک فطری عمل تھا۔ برسوں سے مجھے کچرا سمیٹنے کی عادت تھی۔ جب بھی کوئی کچھ پھینکتا ہے میرے دونوں ہاتھ آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس لئے میرے بڑھے ہوئے ہاتھوں میں وہ بچی واپس آ گئی پھر اس سے پہلے کہ میں احتجاج کرتا۔ وہ دروازہ دوبارہ کھلا۔ مرد نے مجھے دھکا دیا۔ عورت نے انگلی اٹھا کر دھمکی دی۔

"بڈھے خبیث! اگر کسی سے کچھ کہا اور میرے سرتاج کو بدنام کرنے کی کوشش کی تو تجھے کچرا گھر سے بھگا دوں گی۔ پھر تجھے بھیک مانگنے سے بھی اتنی روٹیاں نہیں ملیں گی جتنی کہ اس محلے سے مل جایا کرتی ہیں۔ چل جا' اب یہاں سے بھاگ جا......."

میں وہاں سے بھاگ آیا کیونکہ اقتدار کی کرسی خواہ کتنے ہی کچرے میں ہو' کوئی اسے چھوڑنا پسند نہیں کرتا۔ جب میں کچرا گھر میں پہنچا تو وہاں لوگوں کا ہجوم لگا ہوا تھا۔ صرف مرد ہی مرد نظر آ رہے تھے اگر ایک عورت گناہ کرتی ہے تو دوسری عورتیں بھیڑ نہیں لگاتیں۔ شرم انہیں روکتی ہے۔ مردوں کو شرم کبھی نہیں روکتی۔ وہ لوگ پوچھنے آئے تھے کہ وہ بچی کس کی ہے۔ میں نے کہا۔

"اگر مجھے معلوم ہوتا تو یہ بچی اسی کی گود میں نظر آتی۔ میں کیا بتاؤں کہ یہ آپ لوگوں میں سے کس کی ہے؟"

یہ بات سن کر لوگوں کے منہ بن گئے۔ میں نے کہا۔

"برا ماننے کی بات نہیں ہے۔ یہ انسان کی بچی ہے اور آپ سب انسان ہیں۔ اس

رشتے سے کہتا ہوں کہ یہ آپ کی نہیں ہے تو آپ کے کسی بھائی کی ہے۔ اسے آپ اس کے ماں باپ تک نہیں پہنچا سکتے۔ اگر یہ پہنچ سکتی تو اسے یہاں پہنچانے والے چھوڑ کر نہ جاتے۔ اب تو ہمدردی اور محبت والی بات ہے۔ کسی کے دل میں انسانیت کا درد ہے تو آگے بڑھ کر اسے گود میں اٹھالے۔

میری بات سن کر ایک صاحب لاحول پڑھتے چلے گئے۔ کسی نے ہمدردی سے کہا۔

"بیچاری!" کہیں سے آواز آئی۔ "غلاظت کی پوٹ کو کون ہاتھ لگائے گا؟"

کسی نے پیش گوئی کی "قیامت قریب ہے۔"

اور قیامت اس طرح سے قریب تھی کہ ایک دہی بھلے اور چاٹ والا مین روڈ کے گاہک چھوڑ کر اپنی بارہ مسالے کی گاڑی کچرا گھر کی طرف لے آیا تھا۔ ایک مونگ پھلی والا آوازیں لگا رہا تھا۔ دو لڑکے ادھر سے ادھر گھومتے پھرتے پان اور سگریٹ فروخت کر رہے تھے۔ ایک بوڑھے نے چائے کی چلتی پھرتی دکان کھول لی تھی۔ لوگ خرید رہے تھے کھا رہے تھے پی رہے تھے اور قیامت کی پیش گوئیاں کر رہے تھے۔

شام تک بڑی چہل پہل رہی۔ لوگ آتے رہے اور جاتے رہے۔ پھر پولیس والے آگئے۔ ان کے ساتھ بہت سے پریس رپوٹرز اور فوٹو گرافرز تھے۔ میں فوراً ہی بچی کو کچرے میں لٹا کر کچرا گھر کے اندر آیا۔ وہاں آئینے کا ایک ٹکڑا پڑا تھا۔ ایک ٹوٹی ہوئی کنگھی بھی تھی۔ میں اپنے بال سنوارنے لگا۔ اور کوٹ کی آستین سے چہرے کو رگڑ رگڑ کر پونچھنے لگا۔ بڑی مدت کے بعد کچھ لوگ میری اور میرے کچرا گھر کی تصویریں اتارنے آئے تھے۔ جب میں اچھی طرح تیار ہونے کے بعد بچی کے پاس آیا تو ان میں سے ایک نے پوچھا۔

"تم نے کس وقت اس بچی کو یہاں پایا تھا؟"

میں نے جواب دیا۔ "جناب! آدھی رات کے بعد میں نے اس معصوم کے چیخنے کی آواز سنی۔ اس کچرا گھر سے باہر جھانک کر دیکھا تو ایک گاڑی گھومتی ہوئی جا رہی تھی۔ اس وقت بچی زور زور سے رو رہی تھی۔ میں اسے اٹھا کر چیخنے لگا آوازیں دینے لگا لیکن وہ سنگدل میری آواز کی پہنچ سے دور چلے گئے تھے۔"

یہ کہہ کر میں نے بچی کو گود میں اٹھالیا پھر مسکراتے ہوئے پوز بنا کر کہا۔

"ہاں تو جناب! میں تیار ہوں۔ آپ تصویریں اتاریں......"

فوٹو گرافر نے کہا۔ "ہم تصویریں اتار چکے ہیں۔"

میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"لیکن میں تو ابھی آیا ہوں۔ ابھی میں نے بچی کو گود میں لیا ہے۔ اب آپ تصویریں اتاریں۔"

میری باتیں سن کر سب ہنسنے لگے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

"ہمارا سبجیکٹ یہ نوزائیدہ بچی ہے' تم نہیں ہو۔ جو ہمارا موضوع ہے' ہم اس کی تصویریں لے چکے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "جناب! میں بھی سبجیکٹ ہوں بلکہ بہت بڑا سبجکٹ ہوں۔ ایسے وقت جب کہ لوگ اس بچی کو ہاتھ لگانا پسند نہیں کر رہے ہیں' اسے گناہ کی پوٹ سمجھ رہے ہیں' یہ انسان ہے اور لوگ اسے انسان نہیں سمجھ رہے' میں اسے اٹھا کر کلیجے سے لگائے ہوئے ہوں' رات سے اب تک اس کی حفاظت کر رہا ہوں' ایک باپ کی طرح' ایک ماں کی طرح' ایسے ماں باپ کی طرح نہیں جو اسے جنم دینے کے بعد ایک سبجیکٹ بنا کر چھوڑ گئے ہیں۔ اگر میں نہ ہوتا تو پچھلی رات آپ کا یہ سبجیکٹ سردی سے ٹھٹھر کر مر جاتا۔"

انہیں توقع نہیں تھی کہ مجھ جیسا کوڑا کرکٹ کے ڈھیر میں رہنے والا بوڑھا ایسی متانت اور ذہانت سے بول سکتا ہے۔ وہ مجھے حیرانی سے دیکھ رہے تھے اور میری باتوں کو نوٹ کر رہے تھے پھر ایک نے پوچھا۔

"تمہاری گفتگو کے پیچھے ایک اچھی تعلیم بول رہی ہے۔ کیا تم تعلیم یافتہ ہو؟ کون ہو تم؟"

"میں آپ کی طرح انسان ہوں۔ اور اس ننھی بچی کی طرح اس دنیا کا ایک فالتو سامان ہوں۔ دس برس پہلے حالات نے مجھے اس کچرا گھر میں پھینک دیا تھا۔ اس وقت میں پچپن برس کا تھا' اب میں پینسٹھ برس کا ہوں۔ اس وقت میں نظام الدین ایم اے آنرز کہلاتا تھا اور اردو لٹریچر کا معلم تھا۔ اب میں نظام بابا کہلاتا ہوں اور اس کچرا گھر میں ایک طالب علم کی طرح کچرے کی زبان پڑھ رہا ہوں۔"

کچھ دیر پہلے وہ مجھ پر ہنس رہے تھے۔ اب حیرانی سے منہ کھولے مجھے دیکھ رہے تھے

اور بڑی بے یقینی سے کہہ رہے تھے۔

"تم ایم اے آنرز ہو؟ نہیں......"

"تم اردو لٹریچر کے استاد تھے؟ نہیں......"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تمہارے جیسا قابل آدمی یہاں کیسے آ سکتا ہے؟"

"کیسے نہیں آ سکتا۔" میں نے کچرے میں سے ایک ٹوٹی ہوئی، پچکی ہوئی گڑیا کو اٹھا کر کہا۔ "یہ کیسے آ گئی؟ جب یہ گڑیا مکمل تھی تو کسی صاف ستھرے گھر میں کسی بچی کی گود میں رہتی تھی۔ پھر یہ پرانی ہو گئی اور ٹوٹنے لگی، پچکنے لگی تو نئی گڑیا خرید کر اسے پھینک دیا گیا۔ وہ دیکھو، وہ جو ٹوٹی ہوئی بوتل ہے، اس میں دوا آئی تھی۔ اس بوتل کا منہ دعا کی طرح کھلتا تھا اور بیماروں کو شفا دیتا تھا۔ جب شراب پر پابندی عائد ہوئی تو ایک شرابی نے قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے دوا کا لیبل رہنے دیا اور اس کے پیٹ میں شراب بھر دی۔ پھر اس بوتل کا منہ گالیوں کی طرح کھلنے لگا۔ ایک رات وہ یہاں پیتے ہوئے گزر رہا تھا۔ جب یہ بوتل خالی ہو گئی تو اس نے بوتل کو ایک گندی سی گالی دی پھر کچرا گھر کی دیوار پر اسے زور سے دے مارا۔ یہ ٹوٹ گئی۔ یہ جو بیماریوں سے ٹوٹنے والوں کو جوڑتی تھی، اسے ریزہ ریزہ کر دیا گیا۔

مجھ سے یہ نہ پوچھو کہ میں تعلیم کی ایک ایک خوراک دوا دینے والا معلم کس طرح ٹوٹ پھوٹ کر یہاں آ گیا۔ یہاں تمام ٹوٹی پھوٹی چیزوں کے پیچھے انسان کی کتنی ہی نازیبا حرکتیں، خود غرضیاں اور مکاریاں چھپی ہوئی ہیں۔ میں صرف اتنا ہی کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ انسان کو جو چیز ناپسند ہوتی ہے، اسے وہ کچرے میں پھینک دیتا ہے۔ خواہ دودھ کی بوتل ہو، گود کا بچہ ہو، یا پرانی نسل کا بوڑھا۔"

وہ لوگ میری باتوں کو لکھتے جا رہے تھے۔ مجھے اپنی اور کچرا گھر کی تصویریں اتروانے کا شوق نہیں تھا مگر میرے دل کی گہرائیوں سے جو باتیں نکل رہی تھیں، ان سے میرے ماضی کا زخم ہرا ہو گیا۔ میرا دماغ پھوڑے کی طرح دکھنے لگا۔ ان لوگوں نے مجھ سے کتنے ہی سوالات کئے۔ میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ انہوں نے مختلف زاویوں سے تصویریں دوبارہ اتاریں پھر خاموشی سے بے زار ہو کر چلے گئے۔

رات آئی لوگوں کی بھیڑ چھٹ گئی۔ اس رات میں نے کچھ نہیں کھایا۔ میرا دل

بھاری ہو رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ ماضی کے کچرے میں جھانک کر خوب آنسو بہاؤں لیکن اس نوزائیدہ بچی کی وجہ سے آنسو بہانے کی بھی فرصت نہیں مل رہی تھی۔ اس وقت میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس بچی کی کہانی تجسس اور اسرار لئے کتنی دور تک جائے گی۔

کچرا گھر کے آس پاس سناٹا ہو جانے کے بعد یہی سوچا جا سکتا تھا کہ اب صبح تک کوئی پریشان کرنے نہیں آئے گا۔ لیکن یہ تو رات ہی کا وقت ہوتا ہے جب گناہ گار منہ چھپا کر نکلتے ہیں۔

آدھی رات ادھر تھی اور آدھی رات ادھر، تب میں نے ماضی کا دریچہ کھولنا چاہا۔ اسی وقت بچی رونے لگی۔ مجھے بڑا غصہ آیا۔ پتہ نہیں نوزائیدہ بچے دن رات میں کتنی بار شہد چاٹنا چاہتے ہیں۔ میں نے پھر شہد میں انگلی ڈبو کر اس کے منہ میں ڈال دی۔ وہ ایک لمحے کے لئے چپ ہوئی۔ دوسرے لمحے پھر رونے لگی۔ میں نے اس کے منہ میں کچھ اور شہد ٹپکایا پھر بھی وہ خاموش نہ ہوئی۔ میں اسے اٹھا کر ٹہلانے لگا۔ اسے سمجھانے اور منانے لگا۔ جانے وہ کس ضدی باپ کی بیٹی تھی، چپ ہونا ہی نہیں جانتی تھی۔ رات کی تاریکی اور خاموشی میں چیخ چیخ کر اپنوں کو پکار رہی تھی۔ اور اپنوں کی پکار پر اپنے ضرور آتے ہیں۔ میں نے دیکھا، کچرا گھر سے ذرا فاصلے پر وہ چادر میں منہ چھپائے کھڑی تھی۔ اور بار بار ادھر ادھر سر گھما کر سہمے ہوئے انداز میں دیکھ رہی تھی کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا ہے؟

میں فوراً ہی سمجھ گیا کہ یہ شازیہ ہی ہو سکتی ہے۔ وہی شازیہ جس پر بانو کا شوہر عاشق تھا اور ان دونوں کے عشق کے انجام پر وہ بچی رو رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"کون ہو تم؟"

وہ آگے بڑھی ذرا لڑکھڑائی پھر میرے پاس پہنچ کر سردی یا پھر خوف سے کانپتے ہوئے بولی۔

"بچی کو مجھے دو۔ میں اسے چپ کرانے کے بعد لے آؤں گی۔"

"کیا یہ بچی تمہاری ہے؟"

"نہیں، میری نہیں ہے۔ دیر نہ کرو۔ مجھے دو۔"

"تمہاری نہیں ہے تو تمہیں کیوں دوں۔ تم اسے کہاں لے جا کر چپ کراؤ گی۔"

"میں اسے اپنے گھر لے جاؤں گی۔ دیکھو بحث نہ کرو' کوئی آجائے گا۔"

"تھانیدار صاحب نے کہا ہے کہ جو بچی کو لینے آئے میں اسے تھانے لے آؤں۔ تم تھانے چلوگی؟"

وہ منہ پھیر کر جانے لگی۔ میں نے اس کے پیچھے چلتے ہوئے پوچھا۔

کیا اسے چپ نہیں کراؤ گی؟ ڈرتی بھی ہو اور بچی کے لئے مرتی بھی ہو۔ یہ کیسی محبت ہے؟"

وہ خاموشی سے چلتی رہی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لئے تھے تاکہ بچی کے رونے کی آواز سنائی نہ دے۔ مگر کوکھ سے اٹھنے والی چیخیں ماں کے کلیجے میں چبھ رہی تھیں۔ اس نے تیزی سے پلٹ کر بچی کو مجھ سے چھین لیا پھر وہیں سڑک کے کنارے دیوار کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئی۔ میں نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ چند لمحے بعد ہی بچی چپ ہوگئی لیکن بالکل ہی خاموشی نہیں ہوئی تھی۔ اب ماں کی سسکیاں اور آہیں سنائی دے رہی تھیں۔

یہ ہماری دنیا میں کیا ہوتا ہے بچے چپ ہوجاتے ہیں تو مائیں رونے لگتی ہیں۔ چشمہ بہتا ہے تو اس کی لہروں سے ترنم پھوٹتا ہے۔ ماں کی چھاتیوں سے دودھ بہتا ہے تو آہوں کے سر جاگتے ہیں۔ میں نے پوچھا۔

"جب اپنی تخلیق کو مٹانا ہی تھا تو اسے جنم کیوں دیا؟ اور جب مٹانے کے لئے چھوڑ ہی دیا تھا تو اسے دودھ پلانے کیوں آگئیں؟"

وہ آہستگی سے بولی۔ "تم غلط سمجھ رہے ہو۔ یہ بچی میری نہیں ہے۔"

"تم غلط کہہ رہی ہو۔ یہ بچی تمہاری ہی ہے اور تمہارا نام شازیہ ہے۔ یہاں فلیٹ نمبر ایف اکیاسی (F-81) میں بانو نام کی ایک عورت رہتی ہے۔ اس کے شوہر سے تمہارے ناجائز تعلقات رہے ہیں۔"

"بکواس مت کرو۔" وہ غصے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ "میں کسی بانو اور اس کے شوہر کو نہیں جانتی۔ پتہ نہیں تم کس شازیہ کی بات کر رہے ہو۔ میرا نام شازیہ نہیں ہے۔ میں نے کسی ناجائز بچے کو جنم نہیں دیا۔ میں ایک بیاہتا عورت ہوں۔"

"بہت خوب! بیاہتا ہو۔ اب میں آگے سوال کروں گا تو تم جواب میں کہوگی کہ تمہارا شوہر اور تمہارا بچہ گھر میں ہیں۔ تم ممتا سے مجبور ہوکر یا انسانی ہمدردی کے تحت ایک لاوارث بچی کو دودھ پلانے آئی ہو۔"

"یقین کرو' یہی بات ہے۔ میں صبح سے بچی کے بارے میں سوچ رہی تھی اور تڑپ رہی تھی کہ پتہ نہیں کس ماں نے اپنے جگر کا ٹکڑا پھینک دیا ہے۔ ابھی میں سونے کی کوشش کر رہی تھی مگر نیند نہیں آرہی تھی مجبوراً اپنے بچے کے حصے کا دودھ اسے پلانے آگئی۔"

"دوسرے تمہاری بات کا یقین کرسکتے ہیں۔ میں نے تو کچرا گھر میں بیٹھ کر یہی دیکھا ہے کہ کوئی اپنے حصے کا کھانا دوسرے کو نہیں دیتا۔ بچ جائے تو پھینک دیتا ہے۔ اور ایسی ماں تو کہیں نہیں دیکھی جو اپنے بچے کے منہ سے دودھ چھڑا کر پرائے بچے کے منہ میں دے۔ مجھے سچ بتاؤ ورنہ بچی کو چھین کر لے جاؤں گا۔"

وہ خاموش رہی۔ شاید مجھے گھور کر دیکھ رہی تھی۔ اندھیرے میں اس کی آنکھیں نظر نہیں آرہی تھیں۔ میں نے کہا۔

"اگر تم گناہ گار نہیں ہو تو پولیس کا نام سن کر گھبرا کیوں گئیں؟"

"میں یہ بدنامی پسند نہیں کرتی کہ میں نے کسی لاوارث بچی کو دودھ پلایا ہے۔"

"یہ بدنامی نہیں بہت بڑی انسانیت ہے۔"

"دنیا والے انسانیت نہیں سمجھیں گے' وہ مجھے زبردستی بچی کی ماں بنا ڈالیں گے۔"

"کنیز! یہ کیا حماقت ہے۔ میں نے تمہیں سمجھایا تھا کہ کہیں بچی کو چھپ کر دودھ پلا دینا مگر تم تو سڑک کے کنارے......"

کنیز نے جلدی سے بچی کو میری گود میں واپس کرتے ہوئے' آنے والے سے پوچھا۔

میرا بچہ کہاں ہے؟ آپ اسے کہاں چھوڑ آئے ہیں؟"

میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کنیز کا شوہر ہے اور کنیز اس کا گریبان پکڑ کر اپنے بچے کا مطالبہ کر رہی ہے۔ اس نے کہا۔

"اطمینان رکھو بچہ گھر میں سو رہا ہے۔ میں نے باہر سے تالا لگا دیا ہے۔"

"نہیں میرا بچہ لاوارث نہیں ہے کہ آپ اسے بے سہارا چھوڑ آئے ہیں۔ اگر اسے کچھ ہوگیا تو......"

اس کی آواز گھٹ گئی۔ شاید اس کے شوہر نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔
"آہستہ بولو۔ رات کے وقت آواز دور تک جاتی ہے۔"
میری کمزور نگاہوں کے سامنے دو سائے جیسے ہاتھا پائی میں مصروف تھے۔ کنیز اپنے بچے کے لئے تڑپ رہی تھی۔ پھر وہ خود کو چھڑا کر بھاگنے لگی۔ مرد اس کے پیچھے دوڑا پھر رک گیا۔ اس نے واپس آکر مجھ سے پوچھا۔
"بچی کا پیٹ بھر گیا ہے نا؟ یہ سو گئی ہے نا؟ ہاں آواز تو نہیں آرہی ہے۔ دیکھو اس کی اچھی طرح حفاظت کرنا۔ سردی سے بچا کر رکھنا۔ اس کے ساتھ جو پانچ ہزار روپے رکھے گئے تھے' اس کا حساب میں بعد میں آکر کروں گا۔"
یہ کہتے ہی وہ بھی اپنی بیوی کے پیچھے بھاگتا چلا گیا۔ ان دونوں کے جاتے ہی پھر وہی سناٹا چھا گیا کچھ دیر پہلے جو کردار سامنے آئے تھے وہ تاریکی میں گم ہو چکے تھے۔ لوگوں کو دن کے اجالے میں کچھ سمجھ میں نہیں آتا پھر بھلا رات کی تاریکی میں اتنی جلدی یہ حقیقت کیسے واضح ہو جاتی کہ وہ دونوں میاں بیوی کون تھے؟ اور گھر میں جائز بچہ رکھ کر، ناجائز بچے کو دودھ پلانے کیوں آئے تھے؟
میں اس ننھی سی جان کو سینے سے لگا کر کچرا گھر میں واپس آگیا۔ اسے مہکتی سیج پر لٹا کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ باہر اندھیرے میں دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا کہ شاید پھر کوئی آجائے۔
کوئی اور تو نہیں آیا۔ باہر کی تاریکی میں' میں خود ہی نظر آیا۔ میں بہت ہی صاف ستھرے لباس میں تھا۔ میری عمر پینتیس برس تھی۔ سردی کی راتوں میں لوگ لحافوں میں دبک کر اپنی کسی محبوبہ کو یاد کرتے ہیں یا فحش کتابیں پڑھتے ہیں۔ میں لحاف اوڑھے نفسیات کی خشک کتاب پڑھ رہا تھا۔ میری شفیق ماں دودھ کا گلاس لے کر میرے کمرے میں آئی اور کہنے لگی۔
"بیٹے! اب شادی کرلو۔ بیوی آئے گی تو اتنی رات تک جاگ جاگ کر تمہاری خدمت کرے گی۔" میں نے کتاب کا ایک ورق الٹتے ہوئے کہا۔
"امی! میں کئی بار کہہ چکا ہوں کہ مجھے شادی بیاہ سے دلچسپی نہیں ہے۔ میری دلچسپی کا مرکز صرف دو ہی چیزیں ہیں۔ ایک تو کتابیں اور دوسرے اسکول کے بچے۔ میں ان معصوم

بچوں کی دنیا میں اپنی زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔"
"بیٹے! جب اپنی بیوی آئے گی اور اپنے بچے ہوں گے تو پھر تمہارے یہ خیالات نہیں ہوں گے۔ اپنے بچوں کے سامنے تم دوسرے بچوں کو بھول جاؤ گے۔"
"یہی تو بڑی برائی ہے کہ ہم اپنے بچوں کے آگے دوسرے بچوں کی خوب صورتی کو' ان کے معصوم جذبات کو اور ان کی اہمیت کو فراموش کر دیتے ہیں۔ امی! میں کسی کو خاص طور سے اپنا نہیں بناؤں گا تو مجھ میں خود غرضی نہیں ہوگی۔ تب ساری دنیا کے بچے میرے اپنے ہوں گے۔ بلکہ اپنے ہیں۔ آپ مجھے صرف ایک بیوی اور چند بچوں تک محدود نہ کریں۔"
میری امی بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔ جب تک وہ زندہ رہیں' مجھ سے بحث میں شکست کھاتی رہیں لیکن مرتے وقت انہوں نے یہ کہہ کر مجھے شکست دے دی کہ میں جب تک شادی نہیں کروں گا' ان کی روح بے قرار رہے گی۔ ان کی وفات کے ایک سال بعد میں نے شادی کرلی۔ ناہید میری دلہن بن کر آئی تو پتہ چلا کہ زندگی کا دوسرا رخ کتنا حسین اور رنگین ہے۔
میں نے اسکول سے کبھی چھٹی نہیں لی۔ اکثر بیمار ہونے کے باوجود بچوں کو پڑھانے جاتا تھا۔ ناہید کی قربت میں پہلی بار دل میں یہ خیال آیا کہ مجھے کچھ روز اسکول سے چھٹی لے کر ناہید کی زلفوں کے سائے میں وقت گزارنا چاہئے۔ میری راتیں کتابیں پڑھتے گزرتی تھیں۔ شادی کی پہلی رات اپنی شریک حیات کو پڑھتے گزر گئی۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے' پھولوں کی سیج مہک رہی تھی۔ ناہید کے بدن سے حنا کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ ایسے وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ میں نے پیار سے کہا۔
"ناہید! تمہارے پاس سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ مگر جا کر دیکھنا ہی ہوگا۔ میرا کوئی ضرورت مند شاگرد ہوگا۔"
شادی کی پہلی رات عورت گونگی ہوتی ہے۔ اسے کوئی بات ناگوار گزرے' تب بھی تو وہ ذرا صبر کرلیتی ہے۔ میں وہاں سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں گیا۔ دوسرے کمرے کا دروازہ کھولنے کے بعد ایک نوجوان نظر آیا۔ وہ میرا شاگرد نہیں تھا۔ کوئی اجنبی لڑکا تھا۔ اس نے مجھے سلام کرتے ہوئے کہا۔

"سر! میں فرسٹ ایر کا طالب علم ہوں۔ آج مجھے کیمسٹری کا پرچہ حل کرنا ہے۔ میری کتاب کا ایک ورق پھٹ کر کہیں گم ہو گیا ہے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ اگر آپ ہائیڈروجن کے چند خواص بتا دیں۔"

میں نے کہا۔ "اندر آجاؤ۔ ایک سپاہی اپنی جان سے زیادہ اپنی تلوار کی حفاظت کرتا ہے۔ کیونکہ وہی تلوار اس کی جان بچاتی ہے۔ ایک طالب علم دل سے اپنی کتابوں کی حفاظت کرتا ہے کیونکہ وہی کتابیں اسے انسان بناتی ہیں۔ مجھ سے کچھ پوچھنے اور سیکھنے سے پہلے وعدہ کرو کہ آئندہ اپنی جان سے زیادہ کتابوں کو عزیز رکھو گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔" وہ اندر آکر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

میں نے کہا "برخوردار! انسانوں کی فرداً فرداً ایک کمزوری ضرور ہوتی ہے۔ مگر ہماری اجتماعی اور قومی کمزوری یہ ہے کہ ہم نے رسولؐ خدا کی دی ہوئی کتاب ایک نادان طالب علم کی طرح گم کر دی ہے۔ یاد رکھو جو شخص یا جو اہل مذہب اپنی بنیادی کتاب کھو دیتے ہیں یا فراموش کر دیتے ہیں' وہ سوال بن کر دوسروں سے پوچھتے پھرتے ہیں اور دوسروں کے طور طریقوں پر چل پڑتے ہیں۔"

"ہاں تو تم ہائیڈروجن کے خواص معلوم کرنے آئے ہو۔ چلو نوٹ کرو۔ ہائیڈروجن گیس بے رنگ' بے بو اور بے ذائقہ ہوتی ہے۔ دنیا میں سب سے ہلکی گیس اور وزن کے لحاظ سے ہوا کا چوتھائی حصہ ہے۔ چونکہ یہ پانی میں بہت مشکل سے حل ہوتی ہے۔ اس لئے پانی پر اس گیس کا ذخیرہ کیا جاسکتا ہے اور ٹھنڈک اور دباؤ کے زیر اثر اسے مائع اور ٹھوس حالت میں لایا جاسکتا ہے۔"

وہ لکھتا جا رہا تھا۔ میں بولتا جا رہا تھا۔ جب میں علم کے خزانے کو اپنے سینے سے بچوں کے سینے میں منتقل کرتا ہوں تو ایسے وقت ساری دنیا کو اور سارے رشتوں کو بھول جاتا ہوں۔ میں بچوں کے عالمی سال میں اپنی طرف سے یہی کہہ سکتا ہوں کہ ہم خود غرضی کو' کینہ پروری کو اور اپنے پرائے کی تعریف کو بھول کر ہی بچوں کو ایک صحت مند دنیا تحفے کے طور پر دے سکتے ہیں۔

دو دنوں تک ناہید چپ چاپ تماشہ دیکھتی رہی پھر بچوں کے خلاف بولنے لگی۔ کیونکہ پڑھنے والے بچے جوانی کے دن اور امنگوں کی آدھی آدھی راتیں مجھ سے لے

لیتے تھے۔ دن کو میں اسکول چلا جاتا تھا اور رات گئے تک پڑوس کے بچے کبھی پڑھنے اور کبھی پوچھنے چلے آتے تھے۔ ایک ہفتے کے اندر ہی ناہید پھٹ پڑی۔

"یہ گھر ہے اسکول نہیں ہے۔ آپ بچوں کو یہاں آنے سے منع کر دیں۔"

"ناہید! یہ گھر اور اسکول کی بات نہیں ہے۔ نماز اور کتاب کہیں بھی پڑھی جاسکتی ہیں۔ آخر تم ناراض کیوں ہوتی ہو؟ آدھی رات کے بعد سے صبح تک تمہارا ہی ہوتا ہوں۔"

آدھی رات کے بعد الو جاگتے ہیں۔ میں جاگ کر محبت نہیں کر سکتی۔ آپ کی زندگی بچوں کے ساتھ گزر رہی تھی پھر مجھے اس جہنم میں لانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"تعجب ہے۔ تم بچوں کی پیار بھری دنیا کو جہنم کہہ رہی ہو۔ اگر تم چاہتی ہو کہ میں ساری عمر تمہاری عزت کرتا رہوں تو تم بچوں کی قدر کرو۔ تم بھی انہیں کچھ نہ کچھ سکھایا پڑھایا کرو۔"

"لیکن ناہید نے مجھ سے تعاون نہیں کیا۔ ایک ماہ بعد میں نے رفتہ رفتہ یہ دیکھا کہ بچے میرے دروازے پر کچھ پوچھنے اور سیکھنے نہیں آتے ہیں۔ بچوں کو میں نے فرداً فرداً پکڑ کر پوچھا۔ "بھئی میرے گھر کیوں نہیں آتے ہو؟"

جواب ملا "ماسٹرنی صاحبہ غصہ کرتی ہیں" میرے تمام شاگرد ناہید کو ماسٹرنی صاحبہ کہتے تھے۔ میں نے پہلی بار ناہید کو غصہ دکھایا۔ اس نے بھی پہلی بار غصے سے کہا۔

"آپ مجھے بھگا کر نہیں لائے ہیں۔ باقاعدہ نکاح پڑھا کر اپنا گھر بسانے کے لئے یہاں لائے ہیں یہ میرا گھر ہے۔ میری مرضی کے بغیر آپ کے وہ کیڑے مکوڑے یہاں نہیں آئیں گے۔"

وہ چیخ چیخ کر بول رہی تھی۔ میں بے عزتی کے ڈر سے سہم گیا۔ محلے میں میری بڑی عزت تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے گھر کی آواز باہر والے سنیں۔ میں نے کہا۔

"آہستہ بولو۔ یہاں سے اسکول تک میری عزت ہے۔ چھوٹے بڑے سب ہی مجھے ماسٹر صاحب کہہ کر سلام کرتے ہیں۔"

میرے بھائی جان کو تو شہر کے تمام دولت مند اور تمام پولیس افسران سلام کرتے ہیں۔ اگر وہ ڈی سی نہ ہوتے اور چار برس پہلے آپ کو اسکول میں ملازمت نہ دلواتے تو یہ

عزت کہاں سے ملتی؟ لوگ آپ کی قابلیت کی وجہ سے نہیں، میرے بھائی جان کی وجہ سے سلام کرتے ہیں۔"

وہ اس شہر کے ڈی سی طفیل احمد کی سگی بہن نہیں تھی۔ اگر سگی ہوتی تو اتنا بڑا سرکاری افسر ایک غریب اسکول ماسٹر کو اپنا بہنوئی نہ بناتا۔ ناہید سے بہت دور کا رشتہ تھا۔ چونکہ وہ ایک بڑا افسر تھا اس لئے ناہید اسے بھائی جان کہنے میں فخر محسوس کرتی تھی۔ میں نے کہا۔

"مجھے تمہارے بھائی جان کی سفارش سے نہیں، اپنی صلاحیتوں کے باعث اسکول کی ملازمت ملی ہے۔ چار برس سے اسکول میں میرا ریکارڈ رہا ہے کہ میں نے کسی کے نااہل بچے کو امتحان میں پاس کرنے کے لئے نہ تو بڑے لوگوں کی سفارش پر توجہ دی ہے اور نہ ہی کبھی رشوت قبول کی ہے۔ ایمان کی تعلیم دینے کے لئے سب سے پہلے معلم کو ایماندار بننا چاہئے۔ یہ میرے معبود کا کرم ہے کہ میں اب تک صاحب عزت ہوں اور آئندہ بھی رہوں گا۔"

ناہید نے اس وقت میری بات کا جواب نہیں دیا۔ "اونہہ" کہہ کر باورچی خانے میں چلی گئی جب وہ رات کو سونے کے لئے آئی تو اس کا غصہ ڈھل چکا تھا۔ وہ میری آغوش میں پیار محبت کی باتیں کرتی رہی۔ پھر اس نے مہنگائی کی بات چھیڑی۔ پھر یہ ثابت کیا کہ میری تنخواہ میں اچھی طرح گزارا نہیں ہوگا۔ میں نے پوچھا۔

"تو پھر کیا کیا جاسکتا ہے؟ دوسرے ٹیچرز اسکول سے چھٹی ہونے کے بعد بچوں کو ٹیوشن پڑھاتے ہیں اور اضافی آمدنی پیدا کرتے ہیں۔ لیکن مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب پڑھانے کے عوض اسکول سے تنخواہ مل جاتی ہے تو پھر مجھے فاضل وقت میں بچوں کو مفت سمجھانا پڑھانا چاہئے۔ کتابیں کاپیاں مہنگی ہیں۔ تعلیم کے اخراجات اتنے زیادہ ہیں کہ بچوں سے مزید رقم لینا ظلم ہے۔"

"سارے جہاں کے لوگ جتنا کماتے ہیں، اس سے کچھ اور زیادہ کمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک اچھی زندگی گزارنے کے لئے، اچھا کھانے اور پہننے کے لئے اور گھر میں اچھا آرائشی سامان رکھنے کے لئے انسان کو زیادہ کمانا ہی پڑتا ہے۔ اگر میرے میکے سے میرے ملنے والے آئیں تو انہیں گھر میں کیا دکھاؤں گی؟ ایک ریڈیو تک نہیں ہے۔ بیٹھنے

کے لئے باوا آدم کے زمانے کی کرسیاں ہیں۔ اگر مہنگا نہیں تو کم از کم سستا سا صوفہ تو ہونا چاہئے۔ آپ کو ٹیوشن کی فیس لینی چاہئے۔"

"ناہید میرے کچھ اصول ہیں اور مجھے فخر ہے کہ میرے ان اصولوں سے نادار، یتیم اور غریب بچوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ جو بے چارے بھاری فیس ادا نہیں کرسکتے، وہ میرے پاس آتے ہیں۔ کچھ پوچھتے ہیں، کچھ سیکھتے ہیں۔ میں ان سیکھنے والوں کے ساتھ کاروباری انداز اختیار نہیں کر سکتا۔"

وہ تھوڑی دیر چپ رہی۔ سوچتی رہی پھر بولی۔

"اچھی بات ہے۔ میں آپ کے اصولوں سے اختلاف نہیں کروں گی مگر آپ میری ایک بات مان لیں۔"

میں نے پوچھا۔ "کہو کیا بات ہے؟"

آپ کل ہی ڈی سی کے نام درخواست لکھئے کہ آپ ہیڈ ماسٹر کے عہدے پر ترقی پانا چاہتے ہیں۔ آپ درخواست لکھ کر مجھے دیں۔ باقی میں نمٹ لوں گی۔"

"کیا نمٹ لوگی؟ تم کیا کرنا چاہتی ہو؟ ہوں۔ سمجھ گیا۔ تم اپنے ڈی سی بھائی جان کے سامنے میری درخواست پیش کروگی اور ان کے ذریعے مجھے اسکول کا ہیڈ ماسٹر بنوادوگی۔ دیکھو ناہید! نہ تو میں کسی کی سفارش سنتا ہوں اور نہ اپنے لئے کسی کی سفارش کا محتاج رہتا ہوں۔ پھر یہ کہ ہمارے اسکول میں ایک قابل ہیڈ ماسٹر موجود ہیں۔ میں کسی کا حق نہیں مارنا چاہتا۔"

وہ غصے سے الگ ہوگئی۔ چڑ کر بولی۔

"پھر آپ زندگی میں کیا کریں گے؟ یوں تو کتے بلیوں کا بھی پیٹ بھر جاتا ہے۔ ہم صرف پیٹ بھرنے کے لئے زندہ نہیں ہیں۔ سوسائٹی میں اعلیٰ مقام حاصل کرنا اور اونچی سطح پر زندگی گزارنا آپ کو اچھا کیوں نہیں لگتا؟"

میں نے جواب نہیں دیا۔ اپنی روٹھی ہوئی شریک حیات کو نہیں منایا۔ کیونکہ منانے کا مطلب یہی ہوتا کہ میں اس کی غلط باتوں کو تسلیم کر رہا ہوں۔ اگر میں اس سے التجا کرتا کہ مجھے اپنے اصولوں پر چلنے دو اور میری آمدنی کے مطابق گزارا کرو تو پھر عورتوں کی نظروں میں اسے منانا نہیں کہتے۔ وہ کبھی نہ مانتی۔ اس لئے ہم دونوں ایک دوسرے

سے منہ پھیر کر خاموش پڑے رہے۔ پھر میری آنکھ لگ گئی۔

دو دن بعد میرے سسر صاحب تشریف لائے۔ انہوں نے آرام سے بیٹھ کر مجھے دنیا کی اونچ نیچ سمجھائی۔ مثالیں دیں کہ لوگ کس طرح ایکسٹرا آمدنی کے ذریعے کوٹھیاں بنوا لیتے ہیں۔ اگر میں غریب بچوں سے فیس لینا پسند نہیں کرتا تو نہ سہی۔ مجھے کم از کم اپنی قابلیت کے مطابق ترقی تو کرنی چاہئے۔ میں ایم اے آنرز ہوں اور آسانی سے ایک اسکول کا ہیڈ ماسٹر بن سکتا ہوں۔ اگر میں ان کی بات مان جاؤں تو میرا عہدہ بھی بڑھے گا تنخواہ بھی بڑھے گی۔ اور زندگی کی دوسری سہولتیں بھی میسر ہوں گی۔ ان کی بیٹی گھٹ گھٹ کر زندگی نہیں گزارے گی۔

میں نے ان کے سامنے بھی صاف صاف کہہ دیا۔ "میں ہیڈ ماسٹر نہیں بنوں گا۔"

ایک ہفتے بعد ڈی سی طفیل احمد نے مجھے اپنی کوٹھی میں طلب کیا۔ چونکہ دور کی رشتے داری تھی اس لئے مجھے ایک پیالی چائے پلائی۔ چائے پلانے کے دوران انہوں نے پوچھا۔

"کیوں مسٹر! تم ہیڈ ماسٹر کیوں نہیں بننا چاہتے؟"

مجھے ان کے انداز تخاطب سے دکھ پہنچا۔ وہ مجھے تم کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ بیشک وہ ایک بڑے افسر تھے لیکن میں ایک باعزت انسان ہوں۔ میں اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بننا چاہتا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ جو آئندہ نسل کو تعلیم دیتا ہے۔ بچوں کو صحیح طور پر انسان بنانے کے اصولوں پر عمل کرتا ہے۔ اس سے زیادہ اعلیٰ اور افضل کوئی نہیں ہو سکتا۔ مجھے دولت کی ہوس نہیں ہے۔ میں اپنی آمدنی بڑھانے کی فکر نہیں کرتا کسی عالیشان کوٹھی میں نہیں رہنا چاہتا۔ جو مل جائے' صبر و شکر سے گزارا کر لیتا ہوں لیکن ایک چیز ضرور چاہتا ہوں اور وہ ہے عزت۔ میں چاہتا ہوں کہ سب لوگ میری عزت کریں۔ میرا نام کریں کہ میں سچ مچ ایک ذمے دار معلم ہوں۔ ساری دنیا کے بچوں کو سمجھاتا ہوں کہ علم کی سند حاصل کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ کرشن چندر کا گدھا بھی وائس چانسلر بن سکتا ہے۔ اصل مقصد علم کو سمجھ کر حاصل کرنا ہے۔

جب میں اتنی اچھی باتیں سمجھاتا ہوں تو اس تعلیم کے عوض قابل عزت ہونے کا حقدار کہلا سکتا ہوں۔ کوئی مجھے تخت پر نہ بٹھائے' اپنے سامنے تختے پر ہی بٹھائے لیکن

آپ کہہ کر تو مخاطب کرے۔

انہوں نے اپنی بات کا جواب نہ پا کر مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"کیا تم اونچا سنتے ہو؟ ابھی میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔"

میں نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"جناب! میرا مقصد صرف بچوں کو پڑھانا ہے۔ اگر میں ہیڈ ماسٹر بن گیا تو اسکول کے دفتری کاموں میں الجھ کر رہ جاؤں گا۔ میرا تعلق صرف اسکول ماسٹروں سے رہے گا۔ کبھی کوئی ماسٹر غیر حاضر ہوا تو اس کی جگہ کلاس لینے کا موقع ملے گا۔ جبکہ میں اسکول کا تمام وقت بچوں کو پڑھاتے ہوئے گزارنا چاہتا ہوں۔ اس طرح جو مجھے روحانی خوشی حاصل ہوتی ہے' وہ ہیڈ ماسٹر بن جانے سے حاصل نہیں ہوگی۔"

"تم انتہائی احمق انسان ہو۔ لوگ میری خوشامدیں کرتے ہیں اور تم....."

ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اپنی توہین سے لرزتے ہوئے کہا۔

"آ.... آپ کیا اپنے سامنے کسی کو انسان نہیں سمجھتے؟ بے شک آپ بہت بڑے افسر ہیں لیکن میں بھی اسکول ماسٹر ہوں۔ آپ مجھے آپ کہہ کر مخاطب نہیں کر سکتے۔ کوئی بات نہیں مگر میرے لئے احمق جیسے الفاظ تو استعمال نہ کریں۔ اگر میں احمق ہوں تو آپ ہی بتائیں کہ میں اپنی قوم کے بچوں کو کیا بنا رہا ہوں؟"

انہوں نے غصے سے چیخ کر ملازم کو آواز دی۔ ملازم دوڑتا ہوا آیا تو انہوں نے کہا۔

"اس ماسٹر کو دھکے دے کر یہاں سے باہر نکال دو۔"

یہ کہہ کر وہ غصے میں پاؤں پٹختے ہوئے چلے گئے۔ بیچارے ملازم نے مجھے ہاتھ نہیں لگایا لیکن ان کا اتنا کہنا ہی کافی تھا کہ مجھے دھکے دے کر نکال دیا جائے۔ میں بوجھل قدموں سے چلتا ہوا عالیشان کوٹھی سے باہر آ گیا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس وقت میں کس طرح اندر ہی اندر توہین کے احساس سے مرا جا رہا تھا۔ میں بڑے سے بڑا صدمہ سہ سکتا ہوں۔ مگر اپنی بے عزتی کا دکھ برداشت نہیں کر سکتا۔

اس وقت اپنی حالت زار پر قہقہے لگانے کو جی چاہ رہا تھا۔ مگر میں اس جنونی خواہش کو بڑی مشکلوں سے دبا رہا تھا۔ کیونکہ صدمات سے ٹوٹ کر قہقہے لگانے والے پاگل کہلاتے

ہیں۔ میں گھر پہنچا تو ناہید میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"جو لوگ اپنی بیوی کی بات نہیں مانتے، بزرگوں کے مشوروں پر عمل نہیں کرتے، انہیں کم از کم اپنے حاکم کے سامنے جھکنا ہی پڑتا ہے۔ اب بتایئے۔ آخر آپ کو میرے بھائی جان کا حکم ماننا پڑا نا؟"

میں غصے سے بے قابو ہو رہا تھا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو ناہید کو قتل کر دیتا۔ بچوں کی معصوم دنیا میں رہنے والا استاد خون خرابے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔ غصے کی حالت میں مجھ سے یہی ہو سکا کہ اپنی عادت کے مطابق ناہید کے کان پکڑ لئے۔ وہ ایک جھٹکے سے اپنے کان چھڑاتے ہوئے بولی۔

"میں کوئی اسکول کی بچی نہیں ہوں کہ آپ کان پکڑ کر سزا دیں گے۔ آپ میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے؟"

میں نے ناگواری سے جواب دیا۔

"میں نے تمہارے بھائی جان کی پیشکش کو ٹھکرا دیا ہے۔"

ناہید کا چہرہ مرجھا گیا۔ تب میں بے اختیار قہقہے لگانے لگا۔ پہلے تو اپنی ہنسی خود میری سمجھ میں نہیں آئی پھر پتہ چلا کہ میں انتقاماً قہقہے لگا رہا ہوں کیونکہ میں نے ہیڈ ماسٹر نہ بن کر صرف ناہید کو ہی نہیں اس کے ڈی سی بھائی جان کو بھی اصولوں کے میدان میں شکست دی تھی۔ انہوں نے مجھے گھر سے نکال کر میری بے عزتی کی تھی۔ جواباً یہ ان کی بے عزتی تھی کہ جسے وہ معمولی ماسٹر سمجھ رہے تھے، اس نے ان کی پیش کش کو ٹھکرا دیا تھا۔

میرا جواب سن کر اس نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں۔ دانت پیستے ہوئے مجھے دیکھا۔ پھر پاس رکھا ہوا ایک گلدان اٹھا کر زمین پر دے مارا۔ اس کے بعد چیخ کر بولی۔

"میں ابھی اور اسی وقت اپنے میکے چلی جاؤں گی۔ میرا آپ کے ساتھ گزارا نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں ہو سکتا....."

یہ کہہ کر وہ تنتناتی ہوئی اپنا سامان سمیٹنے چلی گئی۔ میں جانتا تھا کہ ایسا ایک دن ضرور ہو گا۔ واقعی میرے ساتھ اس کا گزارا نہیں ہو سکتا تھا۔ اب وہ میکے جا کر بیٹھنے والی تھی۔ میں نے اسے نہیں روکا۔ بعد میں، میں نے سوچا کہ اسے سمجھا منا کر روک لینا چاہئے تھا۔

میں ایک ہفتے تک اس کا انتظار کرتا رہا۔ وہ واپس نہیں آئی۔ محلے پڑوس کے لوگ میری گھر والی کو پوچھنے لگے۔ اس دنیا میں رہنے کے لئے اپنے پرائے سب ہی کے سوالوں کے جواب دینے پڑتے ہیں۔ ورنہ عزت نہیں رہتی۔ میں نے باتیں بنائیں کہ میرے سسر علیل ہیں۔ اس لئے بیوی کو وہاں چھوڑ دیا ہے۔

میں نے زندگی میں پہلی بار جھوٹ بولا تھا۔ میرا ضمیر ملامت کرنے لگا۔ جب استاد جھوٹا ہو تو شاگردوں کو سچا علم نہیں دے سکتا۔ میں ضمیر کی مار کھا کر ناہید کے پاس پہنچ گیا۔ وہ بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ ایک ہی ہفتے میں پیلی پڑ گئی تھی۔ میری ساس یہ خوش خبری سنا کر چلی گئیں کہ میں باپ بننے والا ہوں۔

اچانک ہی میرا دل خوشیوں سے بھر گیا۔ میں نے چشم تصور میں دیکھا۔ بچہ میری گود میں کھیل رہا تھا۔ میں اسے سامنے بٹھا کر پڑھا رہا تھا۔ اسے اعلیٰ تعلیم دلا رہا تھا۔ اسے انسان بنا رہا تھا۔ ناہید کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"بیٹھ جائیں۔ اب تو ہمارے اختلافات مٹ جانے چاہئیں۔"

میں اس کے قریب بستر پر بیٹھ گیا۔ پھر محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

"اختلافات تم ہی ختم کر سکتی ہو۔ کیا اب بھی تم نہیں چاہو گی کہ ہمارا بیٹا ایماندار اور با اصول انسان کہلائے؟"

"ضرور چاہوں گی مگر یہ برداشت نہیں کروں گی کہ میرا بچہ پیدل اسکول جائے اور کار میں بیٹھنے والے بچوں کو دیکھ کر احساس کمتری میں مبتلا رہے۔ اگر آپ ابھی سے آمدنی نہیں بڑھائیں گے تو میں اپنے بچے پر آپ کا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گی۔"

"دیکھو تم پھر جھگڑا بڑھانے والی باتیں کر رہی ہو۔ کیا مجھے اپنے بچے کے مستقبل کی فکر نہیں ہو گی؟ میں اسے اعلیٰ تعلیم دلاؤں گا۔ ایک سچا انسان بناؤں گا۔"

"جیسے آپ ہیں۔" وہ چڑ کر بولی۔ "میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔"

میرا دل ڈوبنے لگا۔ اب ناہید کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ اب وہ صرف ضدی شریک حیات نہیں بلکہ میرے ہونے والے بچے کی ماں بھی تھی۔ اور اس بچے کو میری کمزوری بنا کر مجھ سے اپنی ضد منوا سکتی تھی۔ ہمارے درمیان پھر تو تو میں میں شروع ہو گئی۔ میرے ساس، سسر، سالے، سالیاں سب ہی جمع ہو گئے اور مجھے الزام دینے لگے۔ طعنے بھی دیئے

کہ جب مجھے درویشانہ زندگی گزارنی تھی تو میں نے شادی کر کے ناہید کی زندگی کیوں برباد کی؟

میں انہیں سمجھا نہیں سکتا تھا اور ان کی باتیں میری سمجھ سے باہر تھیں اس لئے ناہید کے بغیر ہی گھر واپس آگیا۔ اصول اپنی جگہ اٹل ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود جذبات پریشان کرتے ہیں۔ پہلے ناہید کے لئے پیار کا جذبہ تھا۔ اب ایک ننھے کی محبت کا اضافہ ہو گیا تھا۔ میرے چند روز بڑی بے چینی میں گزرے پھر میں بچوں کو پڑھانے میں زیادہ سے زیادہ وقت صرف کرنے لگا۔ تمام بچوں کے چہروں پر اپنے آنے والے بچے کی صورت دیکھ کر بہلنے لگا۔

اسی طرح وقت گزرنے لگا۔ نو ماہ بعد خوشخبری ملی کہ بیٹا پیدا ہوا ہے۔ میں پھر ناہید کے دروازے پر پہنچ گیا۔ میری ساس نے بچے کو میری گود میں لا کر رکھا۔ وہ ناہید کی طرح خوبصورت تھا مگر اس کے تیور میری طرح تھے۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ میرے جسم کا ایک حصہ تھا۔ میرا نام لیوا تھا۔ میرے اصولوں کو آگے بڑھانے والا تھا۔ لیکن اس وقت میں نے دانستہ اصولوں کی بات نہیں چھیڑی۔ اس خوشی کے موقع پر میں دوبارہ جنگ چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔

پھر میں اسی طرح آنے جانے لگا۔ سوا مہینے کے بعد میری ساس نے کہا۔

"ہم نے بیٹی کو بہت عرصہ اپنے پاس رکھ لیا۔ اب تم اپنے گھر لے جاؤ۔"

"میں بھی بہت عرصے سے یہی چاہتا ہوں مگر آپ کی بیٹی راضی نہیں ہوتی۔"

ناہید نے کہا۔ "آپ میری بات مان لیں۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔"

"جو باتیں میری دانست میں غلط ہیں۔ میں انہیں نہیں مان سکتا۔"

میرے سسر نے فیصلہ سنایا۔

"تو پھر تمہیں اپنی بیوی اور بچے کے اخراجات یہاں پورے کرنے ہوں گے۔ ہر ماہ ساڑھے تین سو روپے نان نفقہ کے لئے دینا پڑیں گے۔"

ان دنوں آج جیسی مہنگائی نہیں تھی۔ تنخواہ کم ملتی تھی۔ اس وقت مجھے چار سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ مکان کے کرائے اور بجلی پانی کی مد میں سو روپے چلے جاتے تھے۔ باقی تین سو روپے میرے اور ناہید کے کھانے کپڑے اور ناگہانی ضروریات میں خرچ

ہو جاتے تھے۔ میں نے سسر صاحب کو حساب بتاتے ہوئے کہا۔

"اگر میں نان نفقہ میں ساڑھے تین سو ادا کروں گا تو پھر میں کہاں رہوں گا اور کیا کھاؤں گا؟"

انہوں نے جواب دیا۔ ایکسٹرا آمدنی کرو۔ اگر نہیں کر سکتے تو چوری کرو۔ شادی کی ہے اور بچے کے باپ بنے ہو تو جس طرح بھی ہو سکے اپنی ذمے داریاں پوری کرو۔ اگر نہیں کرو گے تو یہاں پھر نہ آنا۔ ہم تمہیں بچے کی صورت بھی نہیں دیکھنے دیں گے۔"

میں پریشان حال وہاں سے چلا آیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ لوگ اتنی بڑی دنیا میں کسی ایک انسان کو بھی ایماندار رہنے کا موقع کیوں نہیں دیتے۔ اگر ناہید بچے کو لے کر میرے ساتھ رہتی تو چار سو روپے ماہوار میں ہم آسانی سے گزارا کر سکتے تھے لیکن اب صورت حال یہ تھی کہ اپنے بچے کو سینے سے لگا کر رکھنے کے لئے نادار اور غریب بچوں سے فیس کے نام پر ایکسٹرا آمدنی کرنا لازمی تھا۔ اگر میں پرائے بچوں کا استحصال کرتا تو پھر بے ایمانی کے راستے کھلتے چلے جاتے۔ تعلیم کا مقصد فوت ہو جاتا۔ نااہل بچوں کو رشوت لے کر امتحان میں پاس کر دیا جاتا۔ ہمارے ملک کے کتنے ہی معلم ایسی مجرمانہ زندگی گزار رہے ہیں لیکن میں کیا کروں۔ میرا ضمیر کسی جرم کے معاملے میں میرا پارٹنر نہیں بنتا۔

میں یہ آخری فیصلہ سنانے کے لیے ناہید کے دروازے پر گیا کہ میں اپنے بچے کی خاطر دنیا کے تمام بچوں کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ وہاں جا کر پتہ چلا کہ ناہید بچے کو لے کر مجھ سے بہت دور حیدر آباد اپنے بھائی کے ہاں چلی گئی۔ جب تک میں اس کی شرائط تسلیم نہیں کروں گا' وہ واپس آ کر اپنا اور اپنے بچے کا منہ نہیں دکھائے گی۔

پانچ برس گزر گئے۔ میں نے صبر کرنا سیکھ لیا۔ ۲۰ر نومبر ۱۹۵۹ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اتفاق رائے سے بچوں کے حقوق کا عالمی منشور منظور کیا تو میری آنکھ میں آنسو آ گئے۔ سارے عالم کے بچے میرے پاس تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ ایک میرا اپنا ہی بچہ میرے پاس آ کر نہیں پڑھتا تھا۔ اب وہ پانچ برس کا ہو گیا تھا۔

ناہید بچے کو لے کر کراچی آ گئی تھی۔ میں اس سے ملنے گیا تو بچے کو چھپا دیا گیا۔ اب ان کے مطالبے میں شدت پیدا ہو گئی۔ میرے سسر نے کہا۔

تم نے پانچ برس تک بیوی بچے کے اخراجات پورے نہیں کیے۔ ہم بچے کو تمہارے حوالے کردیں گے کیونکہ وہ تمہارا ہے لیکن ہمارا قانونی مطالبہ ہے کہ بچے کو لے جانے سے پہلے ناہید کا حق مہر اور پانچ برس کے اخراجات پورے کرو۔

میں نے جھلا کر کہا۔ "آپ لوگ میری شرافت سے فائدہ اٹھا کر مجھ پر ظلم کر رہے ہیں۔"

"تم نے میری بیٹی پر ظلم کیا ہے۔ تم نے پانچ برس تک اس کی خبر نہیں لی وہ کیا کھاتی پیتی ہے اور کس حال میں رہتی ہے۔ ہم شریف لوگ ہیں ورنہ اب تک قانونی چارہ جوئی کرتے تو تمہارے ہوش ٹھکانے آجاتے۔"

میں نے کہا۔ "میں بھی یہی کر سکتا تھا۔ لیکن اپنے گھر کی عزت کو عدالت تک لے جانا نہیں چاہتا تھا۔"

"ارے تو اب لے چلو نا عدالت میں۔ پانچ برس میں پچاس روپے کی ترقی پانے والے ماسٹر میں کتنا دم خم ہے، یہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ برخوردار خود کو بیچ کر بھی مقدمے کے اخراجات پورے نہیں کر سکو گے۔"

میرے سسر درست فرما رہے تھے۔ مجھ جیسا غریب اسکول ماسٹر مقدمے بازی نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی بیوی کا پانچ برس کا نان نفقہ مجھ پر قرض کی طرح تھا۔ وہ قرض میں ادا نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے مہر کی رقم نہیں دے سکتا تھا۔ میں ایک ماسٹر تعلیم کے سوا کسی کو کچھ نہیں دے سکتا تھا۔

نو برس اور گزر گئے۔ ناہید اور اپنے بیٹے سے جیسے ہمیشہ کے لیے رشتہ ٹوٹ گیا۔ ناہید نے طلاق نہیں لی۔ شاید اس لیے کہ طلاق کے بعد بیٹا میرے پاس آجاتا۔ میں اس لیے طلاق نہ دے سکا کہ ایمانداری سے ساری عمر مہر کی رقم جمع نہیں کر سکتا تھا۔ میرے سب ہی جان پہچان والے میرے گھریلو حالات سے واقف ہوگئے تھے۔ وہ بظاہر میری ایمانداری اور اصول پرستی کی تعریفیں کرتے تھے مگر ڈھکے چھپے الفاظ میں مجھے الزام دیتے تھے۔ مثلاً ایک اسکول ماسٹر نے پہلے میری بہت تعریفیں کیں پھر کہا۔

"نظام صاحب آپ کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے مگر یہ دنیا والے آپ کی قدر نہیں کرتے۔ میں نے کسی سے سنا ہے۔ مجھے یاد نہیں آرہا ہے کہ کس سے سنا ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ ماسٹر اپنے دل کی بات کسی دوسرے کے حوالے سے کہہ رہا ہے۔ وہ کہنے لگا۔

"بہرحال ایسا تو کتنے ہی لوگ کہتے ہیں کہ آپ اپنی بیوی اور بچے پر ظلم کر رہے ہیں۔ آپ کی شریک حیات اگر کوئی غلط عورت ہوتی تو طلاق لے کر دوسری شادی کر لیتی لیکن اس وفادار عورت نے اپنی جوانی کے چودہ سال آپ کی جدائی میں گزار دیے۔"

"جدائی میں نہیں ضد میں گزار دیے۔"

"آپ جو کچھ بھی کہیں لیکن لوگ آپ کی بیوی کی حمایت میں بولتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ آپ بچوں کی دنیا میں رہ کر بچے بن گئے ہیں۔ ایک عورت کی آرزوؤں اور امنگوں کو نہیں سمجھتے۔ آپ سینما اس لیے نہیں دیکھ سکتے کہ بچوں نے آپ کو وہاں دیکھ لیا تو یہی سمجھیں گے کہ فلمیں دیکھنا اچھی بات ہے۔ آپ کہیں تفریح کے لیے نہیں جاتے۔ آپ کے ساتھ آپ کی شریک حیات بھی گھر کی چار دیواری میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اس مظلوم عورت کی تفریح کے لیے گھر میں کم از کم ایک ٹی وی تو ہونا چاہیے تھا۔ بہت سے اسکول ماسٹروں کے ہاں ٹی وی، ریڈیو، صوفے اور سنگار میز وغیرہ ہیں۔ آپ بھی یہ تمام سامان اپنے گھر میں لا سکتے ہیں۔ مگر کچھ لانے کے بجائے بیوی کو گھر سے نکال دیا۔ دیکھئے میں نہیں کہتا۔ یہ دنیا کہتی ہے۔"

ہاں دنیا اسی طرح کہتی ہے، جس طرح وہ کہہ رہا تھا۔ ان دنوں امتحانات شروع ہونے والے تھے۔ میں مختلف جماعتوں کے لیے سوال نامے تیار کر رہا تھا۔ ہر سال کی طرح طلبا میرے پیچھے پڑ گئے کہ میں ان سوال ناموں کو پوشیدہ نہ رکھوں۔ انہیں کچھ بتا دیا کروں۔ دوسرے ماسٹروں نے سمجھایا کہ بچوں کو پہلے سے سوال کے پرچے معلوم ہو جائیں گے تو دوسرے اسکولوں کے مقابلے میں ہمارے اسکول کا رزلٹ بہتر ہوگا۔ لیکن میری طرف سے وہی پرانا انکار تھا۔ میں نہیں چاہتا کہ بچے چند سوالات کے جواب طوطے کی طرح رٹ کر پاس ہو جائیں اور محض نمائشی تعلیم کی سند حاصل کریں۔

تقریباً دس برس گزر جانے کے بعد ایک دن یوں ہوا کہ میں ایک کلاس کے طلبا کی نگرانی کر رہا تھا۔ لڑکے ریاضی کے سوالات حل کر رہے تھے۔ میں نے دور بیٹھے ہوئے ایک طالب علم کو نقل کرتے دیکھ لیا اور اسے آواز دی۔

"جعفر نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اچھی صحت اور قد میں میرے برابر تھا۔ میں نے اسے بلایا تو اس نے طنزیہ انداز میں مجھے دیکھا۔ پھر اپنی جیب سے چاقو نکال کر اسے کھولا۔ اس کے بعد چیلنج کے انداز میں چاقو کی نوک میز کی سطح میں پیوست کر دی۔ یعنی چاقو ایک معلم کے سینے میں بھی پیوست ہو سکتا تھا۔

میرے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ یہ ہمارے ملک کے بچے ہیں۔ یہ ہماری تعلیم ہے۔ قصور بچوں کا نہیں، ہماری طرز تعلیم کا ہے۔ اگر ہم تمام استاد صحیح اصولوں پر عمل کریں۔ طلبا کے جارحانہ اقدامات سے مرعوب ہو کر یا رشوت لے کر امتحانات کے سوال ناموں کو ظاہر نہ کریں تو بچوں کی نادان ضد بڑھتے بڑھتے خنجر کی نوک تک نہ پہنچے۔ میں نے جعفر کے قریب پہنچ کر کہا۔

"جب میں تعلیم دینے آیا ہوں تو تمہیں یہ بھی سکھاؤں گا کہ سچائی کو قائم رکھنے کے لیے پاکستانی بچوں کو تیر اور تلوار سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔"

یہ کہتے ہی میں نے چاقو کا دستہ پکڑ کر اسے اپنے قبضہ میں لے لیا پھر دروازے پر کھڑے ہوئے چپراسی سے کہا کہ وہ ہیڈ ماسٹر کو بلا کر لائے۔ تھوڑی دیر بعد ہیڈ ماسٹر تشریف لائے۔ انہوں نے صورت حال کو سمجھنے کے بعد مجھے ایک طرف لے جا کر کہا۔

"نظام صاحب! میری درخواست ہے کہ آپ جعفر کو پہلی وارننگ دے کر معاف کر دیں۔"

میں نے کہا "کاظمی صاحب! کسی بچے کی ابتدائی چوری کو نظرانداز کرنے کا مطلب ہوگا کہ ہم آئندہ اپنے معاشرے کے لیے اپنے ہاتھوں سے ایک بڑے چور کو ابھی سے تیار کر رہے ہیں۔ اگر یہ قانون داں بنے گا تو قانون کے مسودے چرا کر اس میں ترمیم اور اضافے کرے گا۔ اگر یہ حاکم بنے گا تو عوام کے سینوں پر خنجر کی نوک رکھ کر حکومت کرے گا۔ بچوں کے ذہن میں یہ خوف بٹھانا چاہیے کہ جرم کے بعد سزا لازمی ہوتی ہے۔"

"نظام صاحب! آپ جیسے سچے اور با اصول انسان سے کوئی بحث میں جیت نہیں سکتا۔ ہم سب آپ کی قدر کرتے ہیں لیکن جعفر محلے کے چیرمین کا لڑکا ہے اور چیرمین صاحب کے بہنوئی وزارت تعلیم کے شعبے میں ایک بہت بڑے افسر ہیں۔"

"ہونے دیجیے۔ ایک سچا حاکم اور افسر میرے اس اقدام کو سراہے گا۔ اور بے ایمان افسروں سے تو میں نے ڈرنا نہیں سیکھا ہے۔ پھر یہ کہ میں اس امتحان ہال کا نگراں ہوں مجرمانہ حرکت کرنے والے بچوں کا محاسبہ کرنا میرا فرض ہے۔ آپ صرف ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے جعفر کی کاپی پر یہ لکھ کر دستخط کر دیں کہ میرا اقدام درست ہے۔"

ہیڈ ماسٹر کو میری ضد کے آگے دستخط کرنے پڑے۔ میں نے بھی اس کاپی پر دستخط کیے پھر جعفر کو امتحان ہال سے نکال دیا۔ ایک بجے امتحان کا وقت ختم ہو گیا۔ دو بجے میں اسکول سے نکل کر اپنے گھر کی طرف جانے لگا۔ ایک تنگ سی گلی سے گزرتے ہوئے نویں اور دسویں جماعت کے چھ طلبا نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ان میں جعفر بھی تھا۔ میں نے کہا۔

"میرے بچو! میں پہلے بھی سمجھا چکا ہوں کہ سچائی تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو سکتی ہے تمہارے ہاتھوں ہسپتال پہنچ سکتی ہے۔ مگر مر نہیں سکتی۔ میں اچھی باتیں سمجھاتا ہوں۔ تم سمجھنے کی کوشش کرو۔"

وہ سمجھنا نہیں چاہتے تھے۔ اچانک انہوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ ایک کے ہاتھ میں ہاکی تھی۔ اس ہاکی سے میرے سر پر ضرب لگائی گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ مجھے سنبھلنے کا موقع نہ ملا۔ چاروں طرف سے لاتیں اور گھونسے پڑ رہے تھے۔ میں زمین پر گر کر ہوش و حواس کھو بیٹھا۔

جب ہوش آیا تو میں ہسپتال کے ایک بستر پر پڑا ہوا تھا۔ میرے سر پر اور ایک ہاتھ پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ شام کے وقت ایک پولیس انسپکٹر میرا بیان لینے آیا۔ اس نے میری خیریت پوچھنے کے بعد سوال کیا۔

"آپ پر کس نے حملہ کیا تھا؟ میرا خیال ہے وہ ایک سے زیادہ ہوں گے۔"

"جی ہاں۔ وہ سب میرے اور آپ کے بچے تھے۔ نویں اور دسویں جماعت کے طلبا تھے۔"

میں ان کے نام بتانے لگا۔ انسپکٹر نے تمام لڑکوں کے نام لکھنے کے بعد کہا۔

"میں اپنی ڈیوٹی کے مطابق رپورٹ درج کر لوں گا لیکن اس کا نتیجہ کچھ نہیں نکلے گا۔ اوپر سے احکامات ملے ہیں کہ ملک کے سیاسی حالات خراب ہیں۔ طلبا کو نہ چھیڑا

جائے۔ آپ جانتے ہیں کہ ایک اسکول یا کالج کی اسٹوڈنٹ یونین کے کسی ایک طالب علم
کو حراست میں لیا جائے تو تخریب پسند سیاستدان تمام اسکولوں اور کالجوں کے طلبا طالبات
کو بھڑکا کر سڑکوں پر لے آتے ہیں۔ ماسٹر صاحب ہمارا ملک تعلیم کے بدترین دور سے گزر
رہا ہے۔"

"انسپکٹر صاحب! ہم سب بچوں کا عالمی دن مناتے ہیں۔ ہمیں پہلے یہ سمجھنا چاہیے
کہ ہر دور کے بچے جوان ہوتے ہیں۔ تو وہ دور ان کے مزاج کے مطابق بدلتا ہے اور
بچوں کا ابتدائی مزاج والدین اور استادوں کے ذریعے بنتا ہے۔ میں نے ان بچوں کی خاطر
اپنی بیوی اور بچے کو چھوڑ دیا۔ تمام ماسٹر ایسا نہیں کرسکتے کیونکہ اپنی آمدنی پر قناعت کرنا
بہت کم لوگوں کو آتا ہے۔"

انسپکٹر نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"صرف قناعت کی بات نہیں ہے۔ میں اپنی تعریف نہیں کرنا چاہتا مگر سچ کہتا ہوں کہ
میں رشوت یا حرام کے پیسے کسی سے نہیں لیتا۔ اس کے باوجود آپ کے اس کیس کو
دیانت داری سے آگے نہیں بڑھا سکوں گا۔ میری ملازمت خطرے میں پڑ جائے گی۔ اگر
آپ کو اسکول سے نکال دیا گیا تو آپ ٹیوشن پڑھا کر گزارا کرلیں گے لیکن میری ملازمت
چھوٹنے کے بعد میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔ بہرحال میں کوشش کروں گا کہ ان لڑکوں کو
تنبیہہ کے طور پر تھوڑی بہت سزا ضرور ملے۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ چھ دن بعد ہسپتال سے چھٹی مل گئی۔ ساتویں دن اسکول پہنچا تو
وہ تمام لڑکے ایک ساتھ آئے۔ جنہوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ انہوں نے ہیڈ ماسٹر اور
اپنے بزرگوں کے سامنے کان پکڑ کر مجھ سے معافی مانگی۔ میں نے کہا۔

"اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ اگر تم سب نیک نیتی سے معافی مانگ رہے ہو اور
تم نے اس غلط روش کو چھوڑ دیا ہے تو میں تمہیں صدق دل سے معاف کرتا ہوں۔"

تمام ماسٹروں اور بزرگوں نے خوش ہو کر تالیاں بجائیں۔ پھر جعفر کے باپ نے کہا۔

"نظام صاحب! ریاضی کی کاپیاں آپ کے پاس جائیں گی۔ ان میں میرے بیٹے کی
کاپی نہیں ہے کیونکہ آپ نے اسے امتحان ہال سے نکال دیا تھا۔ اب جب کہ آپ اسے
صدق دل سے معاف کرچکے ہیں تو اسے صرف پاس مارک دے کر امتحان میں پاس

کردیں۔"

میں نے کہا۔ "چیرمین صاحب! میں آپ سب کے سامنے جعفر کو چند سوالات دیتا
ہوں۔ اگر وہ انہیں حل کرکے پاس مارک حاصل کرلے تو یہ تعلیم دینے کا صحیح طریقہ
ہوگا۔ آپ بھی فخر کریں گے کہ آپ کا بیٹا سفارش کے بغیر اپنی صلاحیتوں کے بل پر
کامیاب ہوا ہے۔"

جعفر کا منہ لٹک گیا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر چیرمین کی سمجھ میں آگیا کہ بیٹا سفارش کے بغیر
کامیاب نہیں ہوسکے گا۔ دونوں باپ بیٹے نے سہارے کے لیے دوسروں کو دیکھا۔ اسکول
کے ایک ماسٹر نے کہا۔

"نظام صاحب! آپ کبھی تو کسی کے لیے کچھ گنجائش رکھ لیا کریں۔ جعفر امتحان سے
پہلے بیمار تھا اس لیے اچھی طرح تیاری......"

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی ایک کار اسکول کے احاطے میں آکر رکی۔
چپراسی دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے اطلاع دی کہ ڈی سی طفیل احمد صاحب تشریف لائے
ہیں۔ تمام لوگ ان کے استقبال کے لیے ہال سے باہر آگئے۔ طفیل احمد نے لوگوں کے
ہجوم میں مجھے دیکھا۔ پھر چیرمین سے دریافت کیا۔

"کیا نظام صاحب سے تصفیہ ہوچکا ہے؟"

چیرمین نے جواب دیا "کسی حد تک ہوچکا ہے؟" ماسٹر صاحب نے جعفر کو معاف
کردیا ہے لیکن امتحان لیے بغیر اسے پاس کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔"

"اچھا میں بات کرتا ہوں۔" طفیل احمد مجھے اشارے سے بلا کر لوگوں سے ذرا دور
لے گئے پھر آہستگی سے بولے۔

"تم سے بیوی چھوٹ گئی، بچہ چھوٹ گیا۔ اتنے برسوں کے بعد اب تو تمہیں عقل
آجانی چاہیے۔ دیکھو میں زیادہ باتیں کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ میرا حکم ہے کہ جعفر کو
پاس کردو۔"

"جناب میں جواب دے چکا ہوں۔"

انہوں نے دانت پیستے ہوئے مجھے دیکھا پھر کہا۔

ناہید اور تم سے میرا دور کا رشتہ ہے۔ اس لیے میں یہ بتا رہا ہوں کہ میری آٹھ سالہ

لڑکی فوزیہ سے جعفر کی نسبت طے ہو چکی ہے۔ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو میری بیٹی کی ہونے والی سسرال میں میری سبکی ہوگی۔"

"جناب! یہ اسکول ہے۔ آپ رشتے داریوں کا واسطہ کیوں دے رہے ہیں۔"

"بے وقوف کے بچے......" یہ کہتے ہی انہوں نے ایک زور کا طمانچہ میرے منہ پر رسید کیا۔ جیسے میرا منہ گھوما ویسے ہی دنیا گھومنے لگی۔

کسی کا دماغ کب پھر جاتا ہے؟ جب اس کی خودداری اور ایمانداری کے منہ پر طمانچہ پڑتا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ تیس برس سے جو تعلیم دیتا آرہا تھا۔ اس کی روشنی کی ایک رمق بھی نہ تھی۔ اتنی جدوجہد کے بعد اندھیرا میرے حصے میں آیا تھا۔

میں نے بچوں کو تعلیم دینے کے لیے کبھی طمانچے مارے ہوں گے۔ اس دنیا کے بڑے اپنی انا کے لیے تمام علوم کے منہ پر تھپڑ مارتے ہیں۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ اچھا ہے کچھ نظر نہ آئے۔ میں بے حس انسانوں کے لیے اندھا بن جاؤں۔ میں اس دنیا کے لیے مر جاؤں۔ تب میں نے چیخ کر کہا۔

"میں تمہاری دنیا میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ میں زندہ نہیں......"

یہ کہتے ہی میں دھڑام سے فرش پر گر کر مر گیا۔

○☆○

میں نہیں جانتا کہ اس دن کے بعد میری زندگی کے دس برس ماضی کی قبر میں کیسے گزرے بعض حالات میں کتاب زندگی کے اوراق گم ہو جاتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کچرا گھر تک کیسے پہنچ گیا۔ سوچنے سے سمجھ میں آتا ہے کہ منہ پر طمانچہ کھاتے ہی توہین کا احساس اتنی شدت اختیار کر گیا تھا کہ میرا ذہنی توازن برقرار نہ رہا۔ پھر بے ضرر پاگل سمجھ کر مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا ہوگا۔

انسان اگر ہوش و حواس کھو بیٹھے اور کسی کام کا نہ رہے تو وہ انسانی سماج کا کچرا بن جاتا ہے اس لیے میں بھی کچرا گھر میں پہنچ گیا۔ وہاں بھی کچرا چننے والے بچے میرے پاس آتے تھے۔ میں مملکت کچرا آباد کا حاکم تھا۔ وہاں کا راشننگ آفیسر تھا۔ جو باسی اور جھوٹے کھانے جمع کرتا تھا۔ سکینہ اور دوسرے بچے خالی ڈبے، بوتلیں، کپڑوں کے

چیتھڑے، کاغذ اور بھوسی ٹکڑے وغیرہ چنتے تھے۔ سب کام کرتے تھے میں کسی کو تعلیم نہیں دیتا تھا کیونکہ تعلیم نے مجھے کچھ نہیں دیا تھا۔

اب میں علم کی بات کرتا ہوں تو چشم تصور میں وہی طمانچہ میرے منہ پر پڑتا ہے۔ لہٰذا میں طمانچے کھانے والی سچائی کا سبق کسی کو نہیں دے سکتا۔ لوگ کہیں گے کہ سچائی پر سے میرا ایمان اٹھ گیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اٹھا نہیں بلکہ اٹھا کر کچرا گھر میں پھینک دیا گیا۔

وہ گمنام معصوم بچی میری گود میں تھی۔ نوزائیدہ بچے بہت جلد اپنے ماحول سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ میں اسے جہاں لٹاتا تھا، وہ وہیں سو جاتی تھی۔

اس بچی کے ماں باپ کون تھے؟ پہلے میں سمجھا تھا کہ بانو کے شوہر اور شازیہ کا یہ گناہ ہے۔ پھر کنیز نام کی ایک عورت اسے دودھ پلانے آئی تھی۔ اس کا بیان تھا کہ یہ اس کی اپنی بچی نہیں ہے وہ اپنے بچے کے حصے کا دودھ پلانے آئی تھی۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ خود اس کے شوہر نے اسے اس مقصد کے لیے کچرا گھر میں بھیجا تھا۔

اس رات کی صبح کنیز کا شوہر میرے پاس آیا پھر اس نے رازداری سے پوچھا۔

"بچی کے ساتھ جو پانچ ہزار روپے تھے، وہ کہاں ہیں۔"

میں کہنا چاہتا تھا کہ رقم تھانیدار نے لے لی ہے۔ پھر تھانیدار کی دھمکی یاد آئی۔ اگر میں یہ بات کہہ دیتا تو اس کچرا گھر سے بے دخل کر دیا جاتا۔ اب تو مجھے اتنی بڑی دنیا کے کچرا گھر میں رہنے کے لیے جھوٹ بولنا آ گیا تھا۔ میں نے کہا

"اس بچی کے ساتھ پانچ ہزار روپے تو کیا پانچ پیسے بھی نہیں تھے۔ تم کون ہو؟ ایسی الٹی باتیں کیوں کر رہے ہو؟"

اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"بڑے میاں جھوٹ نہ بولو۔ اس بچی کا نانا لکھ پتی ہے۔ میں اس گھر کا ڈرائیور ہوں۔ وہاں کے تمام راز جانتا ہوں۔ میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے وہ بوڑھا لکھ پتی اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا کہ بچی کو اس علاقے کے کچرا گھر میں اس نے رکھ دیا ہے۔ کوئی نہ کوئی اسے اٹھا کر لے جائے گا۔ اس کی باسکٹ میں پانچ ہزار روپے رکھ دیے گئے ہیں۔"

اتنا کہہ کر ڈرائیور میرے ردعمل کو بھانپنے لگا۔ میں نے یوں بے پروائی کا اظہار کیا

جیسے وہ بکواس کر رہا ہو۔ اس نے کہا۔

"جس رات بچی کو یہاں پھینکا گیا تھا۔ اس کے دوسرے دن مجھے یہ بات معلوم ہوئی۔ میں یہاں آیا تو بہت سے لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ کچھ لوگ تمہاری اور اس بچی کی تصویریں کھینچ رہے تھے۔ میں رات کو دوبارہ یہاں آنے کے خیال سے واپس چلا گیا۔"

میں نے کہا۔ "اچھا تو پانچ ہزار روپے مجھ سے حاصل کرنے کے لیے تمہاری بیوی نے اس بچی کو دودھ پلایا تھا۔"

"ہاں یہی سمجھ لو۔ نکالو پانچ ہزار......"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آج تک دنیا کے کسی بچے نے اتنا مہنگا دودھ نہیں پیا ہوگا۔ بھئی اسے ایک وقت دودھ پلانے کی کیا ضرورت تھی۔ تم اس کے بغیر ہی مجھ سے اتنی بڑی رقم مانگنے آسکتے تھے۔"

اس نے کہا۔ "میں اس بچی کو زندہ رکھنا چاہتا ہوں۔ تم میرا ساتھ دو گے تو ہم دولت میں کھیلیں گے۔ اس بچی کو زندہ رکھ کر اس کے لکھ پتی نانا کو بلیک میل کریں گے۔"

"اس کا نانا کون ہے۔"

"میں یہ راز نہیں بتاؤں گا۔ تم صرف میرے پارٹنر رہو گے۔ اس پانچ ہزار میں سے تمہیں پانچ سو روپے دوں گا۔"

"میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔"

"جھوٹ نہ بولو۔ میں تمہیں ایک ہزار دوں گا۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میرے عقلمند بھائی! جب پورے پانچ ہزار میں ہضم کر سکتا ہوں تو تمہارا پارٹنر بن کر اپنے چار ہزار کا نقصان کیوں کروں۔"

اس نے غصے سے میرا گریبان پکڑ کر کہا

"مکار بوڑھے! میں تیرا گلا دبا دوں گا۔ زندگی چاہتا ہے تو روپے نکال کر سامنے رکھ دے۔"

"میں زندگی نہیں چاہتا۔ زندگی کا مذاق اڑانا چاہتا ہوں اسی لیے کچرا گھر میں بیٹھا

ہوں۔ تم مجھے دھمکی نہ دو البتہ میں تمہیں وارننگ دیتا ہوں کہ اگر تم نے میرا گریبان نہ چھوڑا تو میں چیخنا شروع کر دوں گا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بھیڑ لگ جائے گی۔ پولیس والے آجائیں گے پھر میں ان سے کہوں گا کہ تم بچی کے ماموں جان ہو......"

وہ گریبان چھوڑ کر مجھے گھورنے لگا پھر مجھے گھونسہ دکھاتے ہوئے بولا۔

"اب اگر تم نے مجھے بچی کا ماموں کہا تو میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔ میری بہن کی شادی اگلے ماہ ہونے والی ہے۔ وہ بے حیا' بے غیرت نہیں ہے۔ تو اسے بدنام کرے گا تو......"

اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر میرا گلا گھونٹنے کی دھمکی دی۔ میں نے کہا

"تمہیں ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچنا چاہیے۔ بچی کے سلسلے میں میری گواہی سب سے اہم اور قابل قبول ہوگی کیونکہ بچی کو یہاں چھوڑ کر جانے والا میری نظروں سے گزرا ہوگا اور میں نے اسے پہچان لیا ہوگا۔ اگر تم کسی کی بہن' بیٹی کو بلیک میل کرو گے تو میں یہی بیان دوں گا کہ تم اپنی بہن کا گناہ چھپانے کے لیے اس بچی کو میرے پاس چھوڑ گئے تھے۔"

وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ پریشان ہو کر میرا منہ تکنے لگا۔ اب وہ جابر اور سنگ دل بلیک میلر نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ تھکے ہوئے انداز میں کچرے پر بیٹھ گیا پھر ہارے ہوئے جواری کی طرح بولنے لگا۔

"میں نے اپنی بہن کو باپ بن کر پالا ہے۔ اسے گود میں کھلایا ہے اور اب ہر وقت اسے دلہن بنا کر رخصت کرنے کا خواب دیکھتا رہتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "ہم اپنے بھائیوں اور بہنوں کو بھی اولاد کی طرح پالتے ہیں۔ اپنے بچوں کی طرح ان کا مستقبل بھی اچھا بنانا چاہتے ہیں۔ بچوں کے اس عالمی سال میں ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم ان کے لیے کس انداز میں کیا کرنا چاہتے ہیں اور نتیجہ کیا نکلتا ہے؟"

اس نے کہا۔ "میں اچھے انداز میں بہن کی ڈولی اٹھانا چاہتا تھا۔ جب میری محدود آمدنی سے خواب پورے نہ ہوئے تو میں مالک کی کار سے پرزے اور پٹرول چرانے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کبھی میں پکڑا جاتا تو میری بہن چور کی بہن کہلاتی لیکن ہم اپنے خوابوں کی تعبیر تک پہنچنے کے لیے برے انجام کا خطرہ مول لیتے ہیں۔"

"تو پھر خطرہ تمہارے سامنے ہے۔ یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ تم کسی دوسرے کی بہن کو کانوں میں گھسیٹ کر اپنی بہن کو پھولوں کا سہرا نہیں پہنا سکو گے۔"

"میں کسی کو بلیک میل نہیں کروں گا۔ تم مجھ پر مہربانی کرو۔ میری بہن کو اپنی بہن سمجھ کر اس کے جہیز کے لیے پانچ ہزار روپے دو۔"

میں نے کہا۔ "بہن میری ہوتی تو میں اسے جہیز میں یہاں کا کچرا دیتا۔ یعنی انسان کو اپنی اوقات کے مطابق لین دین رکھنا چاہیے۔ اگر تمہاری اوقات کے مطابق تمہاری بہن کو کوئی بیاہنا نہیں چاہتا تو سمجھ لو کہ وہ بے چاری بھی دوسری بے چاریوں کی طرح اس سماج کا کچرا ہے۔ اسے یہاں بھیج دو۔ یہاں کم از کم ردی خریدنے یا قبول کرنے والے تو آہی جاتے ہیں۔"

وہ غصے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا بس چلتا تو پانچ ہزار کے لیے مجھے قتل کر دیتا۔ مگر ہر شخص قتل کرنا نہیں جانتا۔ وہ پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اس نے مجھے بچی کے لکھ پتی نانا کا نام نہیں بتایا۔ میں اس سے اس لیے نہ پوچھ سکا کہ یہ راز معلوم کرنے کے لیے اسے پانچ ہزار کی رشوت نہیں دے سکتا تھا۔

پورا ایک ہفتہ گزر گیا۔ بچی اپنے ماحول سے بہت زیادہ مانوس ہو گئی تھی۔ اسے وہاں کی غلاظت کا احساس نہیں تھا۔ بڑے گھر کے نخرے بھول گئی تھی۔ آرام سے کچرے میں پڑی، اپنے ہاتھ پاؤں جھٹک کر کھیلتی رہتی تھی۔ ایک شام کی بات ہے۔ ایک نوجوان کچرا گھر کے سامنے نظر آیا۔ وہ مجھے دور سے دیکھ رہا تھا بچی میری گود میں کھیل رہی تھی۔ وہ ہچکچاتے ہوئے قریب آکر بولا۔

"بڑے میاں کیا آپ میری عزت رکھیں گے؟"

اس نوجوان کا چہرہ دیکھ کر جانے کیوں اپنائیت کا احساس ہو رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کے چہرے پر بے شمار دکھوں کا سایہ تھا۔ میں نے کہا۔

"شاید تم یہ کہنے آئے ہو کہ یہ بچی تمہاری ہے۔ اور میں یہ بات کسی سے نہ کہوں؟"

"ہاں۔ مگر پہلے یہ یقین ہو جائے کہ یہ میری ہے۔ اس بچی کے ساتھ جو سامان تھا، وہ مجھے دکھائیں، میں پہچان لوں گا۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اچھا تو تم بھی پانچ ہزار کے لیے آئے ہو۔ جاؤ برخوردار اپنا کام کرو یہاں سے تمہیں ایک پیسہ نہیں ملے گا۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "اوہ تو یہ میری ہے۔ جس کی باسکٹ میں پانچ ہزار تھے۔ مجھے ایک پیسہ بھی نہیں چاہیے۔ بس مجھے یقین ہو گیا کہ یہ میری ہے۔"

یہ کہتے ہی اس نے بچی کو میری گود سے اٹھا کر چومنا شروع کر دیا۔ پھر ذرا منہ بنا کر بولا۔

"کیسی بو آ رہی ہے۔ کیا آپ اسے صاف ستھرا نہیں رکھ سکتے۔"

میں نے کہا۔ "سال دو سال میں کچرا گھر کی صفائی ہوتی ہے تو میں بھی غسل کر لیتا ہوں۔ جب وہ وقت آئے گا تو میں بچی کو بھی غسل کرا دوں گا۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بچی کو سینے سے لگا کر بولا۔

"خدایا میں نے کوئی گناہ نہیں کیا پھر میری بچی غلاظت کے جہنم میں کیوں پہنچ گئی؟"

"خدا سے کیا پوچھتے ہو؟ اولاد کی ذمے داری والدین پر ہوتی ہے۔ تم خود اپنے سوال کا جواب دو۔ اگر یہ گناہ نہیں ہے۔ تم گناہ گار نہیں ہو تو یہ کچرے میں کیسے پہنچ گئی؟ تمہاری بیوی، اس بچی کی ماں کہاں ہے؟"

"بابا مجھ سے آپ کچھ نہ پوچھیں۔ میں نہیں بتا سکوں گا۔ اس کی ماں بہت معصوم اور مظلوم ہے۔ میں اسے بدنام نہیں کروں گا۔"

میں نے کہا۔ "کوئی دوسرا اسے بدنام کرے گا۔ تمہاری بیوی ایک لکھ پتی کی بیٹی ہے۔" وہ گھبرا کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے پھر کہا۔

"اس کوٹھی کے ڈرائیور کو معلوم ہو چکا ہے کہ اس بچی کے ساتھ یہاں پانچ ہزار روپے آئے ہیں۔ وہ مجھ سے رقم وصول کرنے آیا تھا اور کہہ رہا تھا کہ اس بچی کے نانا کو بلیک میل کر کے آئندہ بھی رقمیں وصول کرتا رہے گا۔"

وہ خوف زدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ جیسے معلوم کرنا چاہتا ہو کہ بدنامی کس طرف سے بڑھتی آ رہی ہے۔

"بیٹے!" میں نے نرمی سے کہا۔ "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اس ڈرائیور کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ میرے تعاون کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکے

گا۔"

وہ مطمئن ہو کر مجھے احسان مندی سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"بابا! آپ بہت اچھے ہیں۔ میں آپ کے احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتا۔"

"چکا سکتے ہو۔ صرف اتنا بتا دو کہ جب تمہاری شادی ہو چکی ہے۔ یہ بچی جائز ہے تو پھر یہاں کیوں پھینکی گئی۔"

وہ ہچکچانے لگا۔ میں نے اسے دھمکی دی کہ اگر وہ حقیقت نہیں بتائے گا تو میں بچی کو اس سے چھین لوں گا۔ اس کی گود میں نہیں جانے نہیں دوں گا۔ اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس نے کہا۔

جو کچھ مجھ پر' میری بیوی پر اور میری بچی پر بیت رہی ہے' وہ میں بتا رہا ہوں مگر کسی کا نام اور پتہ نہیں بتاؤں گا۔

"صرف اپنا نام بتا دو۔ تاکہ میں تمہیں مخاطب کر سکوں۔"

"بیٹا۔ آپ مجھے بیٹا کہہ کر مخاطب کریں۔ جب سے میں نے خون کے رشتوں کو سمجھنا شروع کر دیا۔ تب سے میری آرزو رہی کہ میرا کوئی باپ ہوتا اور مجھے بیٹا کہہ کر مخاطب کرتا۔"

میرے دل میں نشتر چبھنے لگے۔ یہ آرزو میری بھی رہی کہ میرا بیٹا کبھی سامنے آتا تو میں اسے بیٹا کہہ کر سینے سے لگا لیتا۔ میں نے بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بیٹے! تم باپ سے محروم ہو اور میں بیٹے سے......"

"کیا وہ مر چکا ہے؟"

"نہیں' ایسا نہ کہو۔ میرا بیٹا زندہ ہو گا۔ ضرور کہیں اچھی زندگی گزار رہا ہو گا۔ کیا تمہارے والد کا انتقال ہو چکا ہے؟"

"نہیں' آپ ایسا نہ کہیں۔ وہ بھی یقیناً زندہ ہوں گے۔ پہلے میری امی غصے میں کہتی تھیں کہ وہ مر گئے ہیں۔ جب میں پندرہ برس کا ہوا تو انہوں نے بتایا کہ میرے والد بہت ہی ضدی اور اصول پرست ہیں اور ایک اسکول ماسٹر ہیں۔"

میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ میں نے تڑپ کر پوچھا۔

"کیا تمہارے والد کا نام نظام الدین ہے؟"

"ہاں؟" اب وہ چونک کر میرا منہ تکنے لگا۔ "آ- آپ کیسے جانتے ہیں؟ نہیں' نہیں میں اپنے والد کا نام نہیں بتاؤں گا۔"

"نام نہ بتانا اور بات ہے اور اپنے باپ کے نام کو تسلیم نہ کرنا اور بات ہے۔ جو اپنے باپ کے نام سے انکار کرتا ہے' وہ خود کو اور اپنی محترم والدہ کو گالی دیتا ہے۔"

وہ جھلا کر بولا۔ "آپ کو ایسی بات کہنے کی جرات کیسے ہوئی؟"

"عقل کی باتیں سمجھانے کے لیے جرات کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ میں نے تمہیں اچھی بات سمجھائی ہے۔ ناراض کیوں ہوتے ہو؟"

اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"میں اپنی بچی کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"نہیں بیٹے! یہ قانون کے کھاتے میں اور اخبارات کے کالموں میں آ چکی ہے۔ اسے زبردستی لے جانا چاہو گے تو میں شور مچاؤں گا۔"

وہ نرم پڑ گیا۔ "میں آپ سے عزت کی بھیک مانگ رہا ہوں۔"

"میں تم سے تمہارے باپ کا نام پوچھ رہا ہوں لیکن نام بتانے سے پہلے اچھی طرح یقین کر لو کہ خود کو گالی نہیں دے رہے ہو۔"

وہ مجبور ہو کر بولا۔ "ہاں میرے والد کا نام نظام الدین ہے۔ اب سے دس برس پہلے میری امی نے مجھے بتایا کہ وہ اسکول ماسٹر ہیں تو میں ان سے ملنے کے لیے اس اسکول میں پہنچا۔ وہاں ہیڈ ماسٹر نے بتایا کہ وہ مینٹل ہسپتال میں ہیں۔ میں اپنی امی کو لے کر دماغی مریضوں کے ہسپتال میں گیا۔ وہاں پتہ چلا چونکہ وہ بے ضرر پاگل تھے' کسی کو ان سے نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا اس لیے انہیں جنرل وارڈ میں رکھا گیا تھا۔ پچھلی رات وہ اپنے بستر سے اٹھ کر چلے گئے اور اب تک واپس نہیں آئے۔ پتہ نہیں کہاں بھٹک رہے ہوں گے۔"

وہ کہہ رہا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ آنسو بھری آنکھوں کے سامنے میرے جگر کا ٹکڑا دھندلا رہا تھا۔ شام کی پھیلتی ہوئی تاریکی میں مجھے یوں لگا جیسے وہ پھر گم ہو جائے گا۔ میں نے تڑپ کر کہا۔

"بیٹے! اس سے پہلے کہ میں مرجاؤں' میرے سینے سے لگ جاؤ۔ میں ناہید کا شوہر

اور تمہارا باپ ہوں۔"

میری زبان سے اپنی ماں کا نام سن کر وہ چونک گیا۔ میں نے اس کے نانا کا نام بتایا تو مقناطیسی رشتوں نے اسے میرے سینے سے لا کر لگا دیا۔ میری خوشیوں کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس کا بیٹا بچپن میں بچھڑ گیا ہوں اور جوانی میں آ کر گلے ۔ سے لگ گیا ہو۔ تھوڑی دیر تک میں اسے چومتا رہا' وہ مجھے پیار کرتا رہا۔ میرے بدن سے کچرے کی بو اٹھ رہی تھی۔ مگر جذبات کے ہجوم میں غلاظتوں کا احساس مٹ جاتا ہے۔

"ابا جان! آپ نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔"

میں نے کہا۔ "انسان کی امیدیں دم توڑ دیتی ہیں اور جب وہ خدا کی طرف سے ہونے والے فیصلوں کا انتظار نہیں کرتا تو وہ اسی حال کو پہنچ جاتا ہے۔ اب سے چھ برس پہلے ہی مجھے رفتہ رفتہ احساس ہونے لگا تھا کہ میں پاگل نہیں ہوں۔ یہاں کی ہر چیز کو ایک ہوشمند کی طرح سمجھ رہا ہوں۔ اس کے باوجود میں اس کچرا گھر میں بیٹھا رہا۔ اس لیے کہ میں اپنے اصولوں کو ہر قدم پر شکست کھاتے دیکھ کر تھک گیا تھا۔"

"بیٹے! میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب کسی کو تعلیم نہیں دوں گا لیکن اب اپنی اولاد کو دیکھ کر غلطی کا احساس ہو رہا ہے۔ جب تک بچوں کی محبت قائم رہے گی' تعلیم کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ اگر مفاد پرست لوگ بچوں کو غلط تعلیم کا زہر پلا رہے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ آخری سانس تک اس زہر کا توڑ کرتے رہیں۔ اسکولوں اور کالجوں کو بچوں کا کچرا گھر بنانے کا موقع نہ دیں۔ کیا تم میری طرح معلم بنو گے؟"

میرے بیٹے نے ندامت سے سر جھکا کر کہا۔

"جب میں اسکول میں پڑھتا تھا اور چھوٹی کلاس کے طلبا کو ٹیوشن پڑھا کر اخراجات پورے کرنا چاہتا تھا تو امی غصے سے کہتی تھیں۔ خبردار! اسکول ماسٹر کبھی نہ بننا۔ تم میرے بیٹے ہو۔ میرا بیٹا ڈپٹی کمشنر بنے گا۔ اس طرح یہ بات میرے دماغ میں بیٹھ گئی کہ مجھے معلم نہیں بننا چاہیے۔ اب تو میں ڈپٹی کمشنر بھی نہیں بن سکتا۔ میں آپ جیسے قابل استاد کا بیٹا' نویں جماعت سے آگے تعلیم بھی حاصل نہ کر سکا۔"

میرے دل پر ایک پتھر سا لگا۔ میں نے صدمے سے چور ہو کر کہا۔

"بیٹے تمہیں آگے پڑھنا چاہیے تھا۔"

"کیسے پڑھتا؟ جب میں نویں جماعت میں اول آیا تو امی نے کہا یہ باپ کی ذہانت لے کر کیا کرو گے؟ تعلیم سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ تمہارے جیسے نوجوان لڑکے ویلڈنگ کا کام سیکھ کر دبئی اور سعودی عرب جاتے ہیں اور ہزاروں روپے کما کر لاتے ہیں۔ تم ویلڈنگ کا کام سیکھو۔ میں تمہارے ڈی سی ماموں سے کہہ کر تمہیں سعودی عرب بھجوا دوں گی۔"

آہ! ناہید ہزاروں روپے کی آمدنی کا خواب مجھ سے پورا نہ کر سکی تو میرے بیٹے کے ہاتھوں اس کی تعبیر چاہتی رہی۔ والدین کی حرص اور آرزوئیں' اولاد سے تعلیم کا حق چھین لیتی ہیں۔ میرا بیٹا کہہ رہا تھا۔

"میں نے تعلیم چھوڑنے سے انکار کیا تو امی رونے لگیں۔ میرے دل نے کہا کہ آپ انہیں ساری عمر رلاتے رہے اب مجھے تو نہیں رلانا چاہیے۔ میں نے ان کی بات مان لی۔ گھر میں پڑھتا رہا۔ جب دسویں جماعت کے امتحانات قریب آئے تو امی نے میرے ہاتھوں میں پاسپورٹ لا کر رکھ دیا۔ سعودی عرب میں میری ملازمت کا بندوبست ہو گیا تھا۔ میں نے امی سے التجا کی کہ مجھے دسویں پاس کرنے کا موقع دیں۔ وہ میری التجا کو انکار سمجھ کر پھر رونے لگیں۔"

افسوس! بعض عورتیں بیوی کے روپ میں آنسو بہا کر ناکام ہو جاتی ہیں تو آنسوؤں کا وہی حربہ اپنے بچوں پر آزماتی ہیں۔ میں نے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا۔"

پھر فوزیہ آ گئی۔ اس نے امی سے کہا کہ مجھے تعلیم مکمل کرنے دیں۔ امی کو جب پتہ چلا کہ میں اور فوزیہ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں تو خوشی سے کھل گئیں۔ وہ شروع سے ہی بڑے گھر کی لڑکی کو بہو بنا کر لانا چاہتی تھیں۔ انہوں نے مجھے دوسرے کمرے میں لے جا کر کہا۔

"ارے پگلے تو نے کیوں نہیں بتایا کہ فوزیہ تمہیں چاہتی ہے۔ اب میں تجھے ملک سے باہر نہیں بھیجوں گی۔ فوزیہ کے پپا تجھے کسی محکمے میں افسر لگا دیں گے۔ تو دس جماعت پاس کر لے۔"

دوسرے دن امی فوزیہ کے ہاں رشتہ مانگنے گئیں۔ وہاں ان کی بڑی بے عزتی ہوئی۔ فوزیہ کے پپا نے غصے سے کہا۔

"ناہید! اپنی اوقات سے بڑھ کر بات نہ کرو۔ تم برسوں پہلے اپنے شوہر کے لیے آئی تھیں کہ میں اسے اسکول کا ہیڈ ماسٹر بنادوں۔ تمہارے شوہر نے بعد میں میری بے عزتی کی' اسے میں بھول نہیں سکتا۔ اس کے باوجود مجھے تمہاری غریبی پر ترس آیا تو میں نے تمہارے بیٹے کو سعودی عرب بھیجنے کا بندوبست کردیا۔ یہ سچ ہے کہ چھوٹے لوگوں کو زیادہ منہ نہیں لگانا چاہیے۔ اب تم اتنی منہ چڑھ گئی ہو کہ اپنے چھوکرے کے لیے میری بیٹی کا رشتہ مانگنے آگئی ہو۔ نکل جاؤ میرے گھر سے' اور خبردار ادھر کا رخ نہ کرنا......"

امی وہاں سے روتی ہوئی واپس آگئیں۔ ان کی زبانی تمام باتیں سن کر مجھے بہت غصہ آیا۔ ایک گھنٹے بعد فوزیہ مجھ سے ملنے آئی۔ میں نے اسے خوب سنائیں۔ وہ روتے ہوئے بولی۔

"آپ مجھے غصہ کیوں دکھا رہے ہیں۔ اگر پپا کا فیصلہ میرا فیصلہ ہوتا تو میں یہاں کبھی نہ آتی۔"

امی نے کہا۔ "فوزیہ! اگر تم میری بہو بننا چاہتی ہو تو ابھی فیصلہ کرو کہ میرے عامر سے شادی کرو گی۔ کل جمعہ کا مبارک دن ہے۔ میں تم دونوں کا نکاح پڑھوا دوں گی۔ شادی کے بعد پپا مخالفت نہیں کرسکیں گے۔"

فوزیہ اتنا بڑا قدم اٹھاتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ وہ مجھے دل و جان سے چاہتی تھی۔ انکار بھی نہیں کرسکتی تھی۔ پھر امی نے اسے پیار محبت سے سمجھایا کہ وہ اپنے والدین سے بغاوت پر آمادہ ہوگئی۔ امی نے میرے نانا' نانی اور ماموں ممانی وغیرہ کو اپنا رازدار بنا کر دوسرے دن گھر میں بلایا اور ہمارا نکاح پڑھوادیا۔

اس رات فوزیہ دلہن بن کر ہمارے گھر میں رہی۔ دوسرے دن امی نے فون پر فوزیہ کے والدین کو بتادیا کہ فوزیہ اب ان کی بہو بن گئی ہیں۔ یہ خبر سنتے ہی اس کے والدین دوڑے چلے آئے۔ پہلے تو انہوں نے گرمی دکھائی پھر بات نہ بنی تو نرمی سے کہا۔

"اچھی بات ہے۔ جو ہونا تھا' وہ ہوگیا۔ مگر فی الحال یہ بات چھپا کر رکھی جائے۔ ہم فوزیہ کو لے جاتے ہیں۔ تم اگلے جمعے عامر کی بارات لے کر آؤ تاکہ چار لوگوں میں ہماری عزت رہے اور ہم سب کے سامنے بیٹی کو دلہن بنا کر رخصت کریں۔"

امی راضی نہیں تھیں لیکن فوزیہ نے کہا۔

"عامر! میں نے آپ سے وفا کی' آپ کی بن گئی۔ اب آپ میرے والدین کی عزت رکھ لیں۔"

میں نے امی کو مجبور کیا تو انہوں نے فوزیہ کو اس کے والدین کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ میں شرافت میں مارا گیا۔ انہوں نے فوزیہ کو کہیں غائب کردیا۔ میں امی کے ساتھ وہاں گیا تو ڈرائنگ روم میں فوزیہ کا باپ ایک پولیس انسپکٹر کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اس نے کہا۔

"انسپکٹر! یہ وہی دونوں ماں بیٹے ہیں۔ اس عورت نے مجھے فون کیا تھا کہ میری بیٹی اس کی قید میں ہے۔"

امی نے کہا۔ "قید نہیں کیا تمہاری بیٹی کی مرضی سے میرے بیٹے کے ساتھ نکاح ہوا ہے۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "اگر نکاح ہو چکا ہے تو یہ اچھی بات ہے۔ آپ مجھے فوزیہ سے ملائیں' میں اس کا بیان لوں گا۔"

"فوزیہ اپنے میکے میں ہے۔" میں نے کہا۔

"بکواس مت کرو۔" انسپکٹر ناگواری سے بولا۔ "وہ یہاں نہیں ہے۔ تم لوگوں نے اسے کہیں لے جا کر قید کردیا ہے۔"

اس بات پر بحث شروع ہوگئی۔ ہم کہہ رہے تھے کہ فوزیہ اپنے والدین کے ساتھ میکے آئی ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ہم نے ایک شریف زادی کو اغوا کیا ہے۔ فوزیہ کے باپ طفیل احمد نے کہا۔

"تم ثبوت کے طور پر نکاح نامہ دکھاؤ گے تو اس نکاح میں شریک ہونے والے تمہارے تمام رشتے دار بھی حوالات میں پہنچا دیے جائیں گے۔ جب تک میری بیٹی کو پیش نہیں کرو گے' تم لوگوں کے ساتھ مجرموں کا سا برتاؤ کیا جائے گا۔"

ہم ماں بیٹے ناکردہ جرم کی سزا پانے والے تھے۔ جو نکاح نامہ ہم پیش کرتے' وہ اس بات کا ثبوت ہوجاتا کہ میں نے فوزیہ سے زبردستی نکاح پڑھوا کر اسے کہیں قید کردیا ہے تاکہ وہ قانون کے دروازے تک نہ پہنچ سکے۔ ہماری بے گناہی صرف فوزیہ کی موجودگی سے ثابت ہوسکتی تھی اور ہم نہیں جانتے تھے کہ اسے کہاں غائب کردیا گیا ہے۔ طفیل

احمد نے ہمیں اپنے بیڈ روم میں لے جا کر امی سے کہا۔

"ناہید تم نے میری عزت کو مٹی میں ملانے کی جو کوشش کی ہے۔ اس کا تقاضہ تو یہ ہے کہ میں تم دونوں کو حوالات میں پہنچادوں۔ لیکن اب بھی میں مصلحتاً سمجھوتہ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم وہ نکاح نامہ مجھے دے دو اور عامر میری بیٹی سے دستبردار ہو جائے تو میں انسپکٹر کو کچھ دے دلا کر رخصت کردوں گا۔"

میں نے ان کے قدموں میں جھک کر کہا۔

"آپ میری اور فوزیہ کی زندگی برباد نہ کریں۔ وہ میرے بغیر زندہ نہیں رہے گی۔"

انہوں نے مجھے دھکا دے کر فرش پر گراتے ہوئے کہا۔

"میرے سامنے لیلیٰ مجنوں کی کہانی نہ سناؤ۔ فوزیہ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ اب وہ تمہاری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔ تمہاری ماں اچھی طرح جانتی ہے کہ اس کی منگنی بچپن ہی میں جعفر سے ہو چکی ہے۔ اگر نکاح نامہ واپس مل جائے تو یہ بات کسی کو معلوم نہیں ہو گی کہ فوزیہ نے تم سے شادی کرنے کی حماقت کی تھی۔ اس کی شادی اگلے ماہ تک جعفر سے ہو جائے گی۔"

میرا دل گواہی دیتا تھا کہ فوزیہ مجھ سے نفرت نہیں کر سکتی مگر امی یہ نہیں چاہتی تھیں کہ میں ناکردہ جرم کی سزا پاؤں۔ انہوں نے کہا۔

"عامر میں نہیں جانتی تھی کہ فوزیہ نکاح کے بعد بدل جائے گی۔ اب تم بھی اس رشتے پر لعنت بھیجو میں گھر جا کر نکاح نامہ لے آتی ہوں۔"

میں نے اعتراض کیا۔ ایک بار فوزیہ سے ملنے کی التجا کی۔ مگر امی اب میری سلامتی کے لیے طفیل احمد کا ساتھ دے رہی تھیں۔ میری ایک نہ چلی۔ مختصر یہ کہ امی نے وہ نکاح نامہ لا کر واپس کر دیا۔ میں نے فوزیہ کو طلاق نہیں دی۔ میرے طلاق دینے کی کوئی اہمیت نہیں تھی کیونکہ اب اس بات کا کوئی تحریری ثبوت نہیں تھا کہ فوزیہ کبھی میری شریک حیات بنی تھی۔

میں گھر آ کر فوزیہ کی جدائی کے غم میں بیمار پڑ گیا۔ وہ ایک رات کی دلہن بن کر آئی تھی۔ وہ ایک رات میری زندگی کا سرمایہ تھی۔ میں اسے کبھی بھلا نہیں سکتا تھا۔ بس ڈوبتے ہوئے دل سے انتظار کرتا رہا کہ ایک ماہ بعد جعفر کی دلہن بن جائے گی۔ میں دور ہی

دور سے اس کی کوٹھی کے چکر کاٹتا تھا مگر اس کوٹھی میں کوئی دولہا بارات لے کر نہیں آیا۔ پتہ چلا کہ شادی کی تاریخ آگے بڑھادی گئی ہے۔

میرے دل میں پھر امید کی ایک کرن چمکنے لگی۔ دل نے کہا کہ فوزیہ شادی سے انکار کر رہی ہے اسی لیے شادی کی تاریخ ٹل رہی ہے۔ اسی طرح پانچ ماہ گزر گئے۔ فوزیہ کی شادی نہیں ہوئی۔ میری بے چینی بڑھ گئی۔ اس کی کوئی خیر خبر معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ مجھ سے برداشت نہ ہوا تو میں نے اس کی کوٹھی میں فون کیا۔ دوسری طرف سے اس کی والدہ کی آواز سنائی دی۔ میں نے کہا۔

"میں فوزیہ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کی ماں نے پوچھا۔ "تم کون ہو اور میری بیٹی سے کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس کی اب تک جعفر سے شادی کیوں نہیں ہوئی؟"

"شٹ اپ۔ تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے؟"

"می! غصہ کرنے کے بجائے ٹھنڈے دل سے سوچیں۔ آپ ایک عورت ہیں۔ ماں ہیں۔ آپ کی بیٹی پر جو ظلم ہو رہا ہے' آپ ماں ہونے کے ناطے اسے کیسے برداشت کر رہی ہیں۔"

وہ چپ رہی۔ شاید ٹھنڈے دل سے سوچ رہی تھی۔ میں ایک ماں کی دکھتی رگ کو چھیڑنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ پھر مجھے ہلکی سی کلک کی آواز سنائی دی اس نے ریسیور رکھ دیا تھا۔ دوسرے دن میں نے پھر فون کیا۔ اس بار ایک ملازم نے ریسیور اٹھایا۔ میں نے کہا۔

"میں بیگم طفیل سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

جواب ملا کہ وہ پچھلی رات سے شہر سے باہر گئی ہیں۔ اس کے بعد تین ماہ تک فوزیہ کی والدہ سے رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ آج ابھی یہاں آنے سے پہلے میں نے اس کوٹھی میں فون کیا تو دوسری طرف سے آواز سنتے ہی میرا دل دھڑکنے لگا۔ وہ فوزیہ کی آواز تھی۔ میں نے کہا۔

"فوزیہ میں تمہارا عامر بول رہا ہوں۔ تم کہاں کھو گئی تھیں؟"

"عامر!" اس کے انداز تخاطب میں تڑپ اور بے چینی تھی۔ وہ بولی۔ "میں یہاں

سے فرار ہو کر تمہارے پاس پہنچنے ہی والی تھی۔ اچھا ہوا تم نے رابطہ قائم کرلیا۔ ہم لٹ رہے ہیں عامر! میں تمہاری بیٹی کی ماں بن چکی ہوں۔ مگر بیٹی میرے پاس نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "تم خوش خبری بھی سنا رہی ہو اور مایوس بھی کر رہی ہو۔ بتاؤ۔ ہماری بیٹی کہاں ہے؟"

"میں کیا بتاؤں۔ زچگی کے بعد میں بے ہوش ہوگئی تھی۔ ہوش آنے کے بعد مجھے بتایا گیا کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد مرگیا۔ میں نے رو دھو کر صبر کرلیا مگر آج پپا کا ایک ڈرائیور میرے پاس آیا۔ اس نے کہا۔

"بی بی اگلے ماہ میری بہن کی شادی ہے اگر آپ مجھے پانچ ہزار دیں گی تو میں آپ کو ایک راز کی بات بتاؤں گا۔"

میں نے سمجھا کہ شاید وہ تمہارے بارے میں کچھ بتائے گا۔ میں نے اس کی مطلوبہ رقم دینے کا وعدہ کرلیا تو اس نے بتایا کہ میری بچی زندہ ہے اور طارق روڈ کے پیچھے ایک کچرا گھر میں ایک بوڑھے کے پاس ہے۔ یہ سنتے ہی میں نے ممی کے پاس جاکر ان کا گریبان پکڑلیا۔ اور چیخ کر بولی۔

"آپ کیسی ماں ہیں؟ کیا آپ مجھے کچرا گھر میں پھینک سکتی ہیں؟ اگر نہیں تو بتایئے میری بیٹی کو کہاں پھینکا ہے۔ کیوں پھینکا ہے؟"

ممی نے روتے ہوئے کہا۔ "بیٹی! میں نے یہ ظلم نہیں کیا۔ تم نہیں جانتیں کہ تمہارے پپا نے بہت پہلے ہی مجھ سے کہا تھا کہ میں کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس تمہیں لے جا کر بچے کو ضائع کرادوں مگر تم نے چار ماہ تک یہ بھید چھپا رکھا تھا۔ بچے کو ضائع کرنے کا وقت گزر گیا تھا اس لیے انہوں نے صبر کرلیا۔ جب بچی پیدا ہوئی تو میں ان کے راستے کی دیوار بن گئی۔ میں نے ان سے کہا کہ بے شک آپ اپنی عزت کی خاطر بچی کو فوزیہ سے الگ کردیں مگر اسے ہلاک نہ کریں۔ انہوں نے میری بات مان لی۔ میں نے اپنی تسلی کے لیے تمہارے ماموں کو ان کے ساتھ بھیج دیا۔ وہ دونوں کار کی پچھلی سیٹ پر بچی کو باسکٹ میں رکھ کر کہیں لے گئے۔ واپسی میں تمہارے ماموں نے بتایا کہ اسے پانچ ہزار روپے کے ساتھ ایک کچرا گھر میں چھوڑ دیا گیا ہے۔"

فوزیہ فون پر ساری داستان سنا رہی تھی پھر اس نے آنسو بھرے لہجے میں کہا۔

"عامر! وہ ہماری محبت کی نشانی ہے۔ فوراً وہاں جاکر اسے حاصل کرو۔ نہیں تو میں مر جاؤں گی۔"

میں نے اس سے وعدہ کیا۔ اس نے بھی وعدہ کیا کہ جب میں فون پر اسے بچی کے ملنے کی خوشخبری سناؤں گا تو اس رات وہ میرے گھر چلی آئے گی اور مجھے ساری داستان سنائے گی کہ کس طرح اسے شہر سے دور لے جاکر قید کیا گیا تھا۔ بہرحال میں اپنی بچی کو یہاں لینے آگیا۔ آج تقدیر مہربان ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری بیٹی اپنے دادا کی گود میں کھیل رہی ہوگی۔"

یہ کہہ کر عامر خاموش ہوگیا۔ میں نے بیٹے کو مسکرا کر دیکھا۔ پھر پوتی کو سینے سے لگا کر کہا۔

"بچوں کو تمام جائز حقوق ملنے چاہئیں۔ تمہارا حق ہے کہ تمہیں باپ کی محبت اور توجہ ملے۔ میں تمہیں آگے بڑھاؤں گا۔ یہ بچی بھی اپنا حق چاہتی ہے کہ اسے تمہاری اور فوزیہ کی گود ملے۔ تم بچی کو لے کر یہاں بیٹھو۔ میں اپنی بہو کو یہاں لے کر آؤں گا۔"

"ابا جان! اب اس کچرا گھر میں بیٹھنا کیا ضروری ہے؟ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔"

نہیں بیٹے! ہر شخص کا محاسبہ ہونا چاہیے۔ جس نے جو کچرا پھینکا ہے' وہ اپنا کچرا سمیٹنے خود آئے گا۔ تم مجھے اپنی امی اور فوزیہ کا پتہ بتاؤ۔"

میں پتہ معلوم ہونے کے بعد کچرا گھر کے اندر گیا۔ وہاں سے اپنی جمع پونجی اٹھائی۔ کل بائیس روپے اور ستر پیسے تھے۔ لنڈے بازار کا ایک سوٹ رکھا ہوا تھا۔ آنے والا دن میرے لیے عید کا دن ہوگا اور آج کی رات "شب برات" تھی۔ اس لیے اب غسل کرنا اور کپڑے بدلنا لازمی تھا۔ میں نے ایک حمام میں جاکر بال کٹوائے' شیو بنوایا۔ غسل کرنے کے بعد لباس تبدیل کیا۔ میرا حلیہ ایک دم ہی بدل گیا۔ آئینے میں خود کو دیکھ کر یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ ضدی اور اصول پرست اسکول ماسٹر زندہ ہوگیا ہے۔

ناہید کے دروازے پر پہنچ کر میں نے دستک دی۔ یہ وہ دروازہ تھا جہاں سے میں ہمیشہ خالی ہاتھ واپس جاتا تھا۔ دروازہ کھلا تو ناہید یوں سہم گئی جیسے مردہ رات کے وقت زندہ ہو کر سامنے آگیا ہو۔ میں نے پوچھا۔

"مجھے پہچانتی ہو؟ پچیس برس سے ہمارے درمیان اصولوں کی جنگ جاری رہی۔ اب میں اس کا نتیجہ سننے آیا ہوں۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ میں نے اندر آکر دروازے کو بند کیا تو وہ میری گردن میں بانہیں ڈال کر بڑی مدت کے بعد میری آغوش میں چھپ گئی۔

میں ہار گئی۔ میں آپ کو پریشان کرتی رہی کہ شاید اس طرح میرے گھر میں اونچی کوالٹی کا فرنیچر سنگار میز اور ریفریجریٹر جیسا سامان آجائے گا۔ آپ بے ایمانی پر آمادہ نہ ہوئے تو میں نے عامر کے ذریعے ہاتھ پاؤں مارے مگر کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ میرے بیٹے کی تعلیم چھوٹ گئی۔ وہ دن رات پریشان رہتا ہے۔ اکثر راتوں کو میں نے سنا ہے' وہ نیند میں کراہتے ہوئے فوزیہ کو پکارتا ہے۔ اس کی کراہیں سن کر میرا کلیجہ کٹنے لگتا ہے۔ میں کیا کروں؟"

"جب تم ہار چکی ہو تو تم کچھ نہ کرو۔ میں کروں گا۔ میں ہارنے کے بعد ایک بار پھر جیتنے کے لیے میدان عمل میں آگیا ہوں۔ عامر سے ملاقات ہو چکی ہے اور ایک خوش خبری سنو۔ ہماری ایک بہت ہی خوب صورت سی پوتی ہے۔"

ناہید نے چونک کر مجھے حیرانی سے دیکھا۔ میں نے کہا۔

"تمہیں بتانے کے لیے بہت سی باتیں ہیں۔ چلو' کے پاس چلیں۔ میں تمہیں راستے میں سب کچھ بتا دوں گا۔"

وہ مجھ سے الگ ہو کر ایک صندوق کے پاس گئی۔ پھر اسے کھول کر میرا ایک پرانا لباس نکالا۔

"جب میں آپ کے گھر سے آخری بار نکل کر آئی تھی تو اپنے ساتھ آپ کا یہ لباس لے آئی تھی۔ آپ کے لباس سے عجیب سی بو آرہی ہے۔ آپ اسے بدل لیں۔"

میں نے کہا۔ "تعجب ہے' مجھ سے عداوت رہی اور میرے لباس کو بڑے جتن سے سنبھال کر رکھا ہے۔"

وہ سر جھکا کر بولی۔ "عداوت آپ سے نہیں' آپ کے اصولوں سے تھی۔ اب وہ بھی نہ رہی۔ جب عامر سوجاتا تھا۔ تب میں آپ کا لباس سینے سے لگاتی تھی۔ اسے چومتی تھی پھر آپ کو آنسوؤں سے پکارتے پکارتے سوجاتی تھی۔"

عورت کیا ہے؟ زحمت بھی ہے اور محبت بھی۔ وہ اپنی ضد اور انانیت کے ہاتھوں گھر کو جہنم بناتی ہے۔ شوہر سے الگ ہو جاتی ہے مگر اس کے لباس کو یا اولاد کو سینے سے لگا کر رکھتی ہے۔ یہ بھی محبت کی ایک ادا ہے لیکن بڑی مہنگی ادا ہے۔

لباس تبدیل کرنے کے بعد میں ناہید کے ساتھ طفیل احمد کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں' میں نے اپنی پوتی کے ملنے کی ساری داستان سنائی۔ ناہید سن رہی تھی اور بار بار خدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ پچیس برس تک کانٹوں میں زندگی گزارنے کے بعد پھول جیسے نازک اور لہو جیسے مستحکم رشتے پھر آپس میں مل رہے ہیں۔

رات کے دس بجے ہم کوٹھی پر پہنچے۔ فوزیہ کی ممی نے دروازہ کھولا۔ طفیل احمد صوفے پر بیٹھے سگار کا کش لگا رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی سگار کا دھواں حلق میں پھنس گیا۔ کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ کھانستے کھانستے ان کے دیدے آنکھوں کے حلقوں سے اس طرح ابھر گئے۔ جیسے وہ دیدے پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھ رہے ہوں' پہچان رہے ہوں۔ میں نے کہا۔

"طفیل صاحب! اچھی طرح پہچان لیجیے۔ میں وہی مقتول ہوں جسے آپ نے ایک طمانچے سے قتل کر کے کوڑا کرکٹ کے قبرستان میں پہنچا دیا تھا۔ اب یہ مردہ زندہ ہو کر تمہارا محاسبہ کرنے آیا ہے۔"

وہ کھانستے کھانستے بولے۔ "چلے جاؤ یہاں سے' بھاگ جاؤ......"

"خالی ہاتھ نہیں ہم اپنی بہو کو لے کر جائیں گے۔"

فوزیہ کی ممی دوسرے کمرے میں جا رہی تھیں۔ طفیل احمد نے غصے سے کہا۔

"یہاں تمہارا کوئی نہیں ہے۔ سیدھی طرح چلے جاؤ۔ ورنہ ملازم تمہیں دھکے دے کر نکال دیں گے۔"

"آپ نے پہلے بھی ایک بار اس کوٹھی سے دھکے دیے تھے مگر آج تقدیر آپ کو دھکے دے رہی ہے۔ جو کچھ آپ نے بویا' اسے کاٹنے کا وقت آگیا ہے۔ اگر آپ فوزیہ کو ہمارے حوالے نہیں کریں گے تو وہ بچی ہمارے پاس ہے۔ مجبوراً ہمیں قانون کے ذریعے فوزیہ کا طبی معائنہ کروانا پڑے گا۔ تب یہ راز فاش ہو جائے گا کہ آپ کی بیٹی میری پوتی کی ماں بن چکی ہے۔"

طفیل احمد کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ ایک مردے کا چہرہ نظر آنے لگا۔ وہ ہکلاتے

ہوئے بولے

"تت...... تم جھوٹ بول رہے ہو۔ کوئی بچی وچی تمہارے پاس نہیں ہے۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آپ نے اپنے جرم کو چھپانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن تقدیر کے اس مذاق کو کیا کہا جائے کہ ۳۱ر دسمبر اور پہلی جنوری کی درمیانی شب کو آپ کار میں بیٹھ کر کچرا گھر کے پاس آئے۔ آپ کا خیال تھا کہ آپ بچی کو کچرے میں پھینک رہے ہیں مگر قدرت یہ تماشا دیکھ رہی تھی کہ ایک نانا اپنی نواسی کو اس کے دادا کے پاس چھوڑ کر جا رہا ہے۔ میں وہاں موجود تھا کیونکہ تمہارے اعمال نے مجھے اس کچرا گھر میں دس سال پہلے ہی پہنچا دیا تھا۔"

وہ مجھے گھورتے رہے۔ میری باتوں کے وزن کو سمجھتے رہے پھر انہوں نے ڈھٹائی سے کہا۔

"میں سمجھتا تھا کہ اپنی بیٹی کو اپنی مٹھی میں رکھوں گا تو میری عزت رہ جائے گی۔ میں تم لوگوں کو بڑی سے بڑی رقم دینے کو تیار ہوں۔ تمہارے بیٹے کو اچھی ملازمت کے لیے ملک سے باہر بھجوا دوں گا۔ تم لوگ فوزیہ کا خیال چھوڑ دو۔ وہ جعفر سے شادی کے لیے راضی ہے۔ اسی لیے میں اسے یہاں لایا ہوں۔"

ان کی بات ختم ہوتے ہی فوزیہ کی ممی دوڑتی ہوئی آئیں اور ایک تہ کیا ہوا کاغذ اپنے شوہر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"فوزیہ راضی کب تھی۔ آپ اسے فریب دے رہے تھے۔ بیٹی آپ کو فریب دے کر یہاں آئی تاکہ یہاں سے فرار ہونے کا موقع مل جائے۔ اسے پڑھئے' وہ اپنی بچی کے پاس کچرا گھر میں گئی ہے۔"

"کچرا گھر؟" طفیل احمد نے بوکھلا کر کہا۔ اس کاغذ کی تحریر کو پڑھا پھر بھاگتے ہوئے باہر گئے۔ ہم سب ان کے پیچھے دوڑے۔ فوزیہ ان کی کار لے گئی تھی۔ انہوں نے ملازم سے چیخ کر کہا۔

"جاؤ بھاگو۔ جلدی سے ایک ٹیکسی لے کر آؤ۔"

ملازم بھاگتا چلا گیا۔ وہ اضطراب کی حالت میں کوٹھی کے احاطے سے باہر آگئے۔ ہم ان کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے جھلا کر کہا۔

"تم لوگ میرے پیچھے کیوں آ رہے ہو۔ بھاگ جاؤ یہاں سے......."

فوزیہ کی ممی نے کہا۔ "آپ نے اب تک اپنی سی کوششیں کرلیں لیکن ہونے والی بدنامی بدستور پیچھا کر رہی ہے۔ بہتر ہے آپ اب گھر میں بیٹھ رہیں۔ بیٹی اپنی سسرال پہنچ گئی ہے۔"

انہوں نے گھور کر اپنی بیوی کو دیکھا۔ میں نے کہا۔

"بچی کے سلسلے میں رپورٹ درج ہو چکی ہے۔ آپ زندہ رہیں یا مر جائیں۔ یہ مقدمہ عدالت تک پہنچے گا۔"

اتنے میں ٹیکسی آگئی۔ طفیل احمد سے پہلے ہی ہم لپک کر ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ وہ انکار نہیں کر سکتے تھے۔ مجبوراً انہیں بھی بیٹھنا پڑا۔ راستے میں فوزیہ کی ممی نے کہا۔

"میں تسلیم کرتی ہوں کہ میری بیٹی آپ کی بہو ہے۔ اگر آپ چاہیں تو ہم سب مل کر اس بدنامی سے بچ سکتے ہیں۔ ہم یہ بیان دیں گے کہ بچی پیدا ہوئی تو کوئی بدمعاش اسے اٹھا کر لے گیا تھا اور کچرا گھر میں پھینک گیا تھا۔ ایسی ہی بہت سی باتیں بنائی جا سکتی ہیں۔"

میں نے کہا "سچائی کو بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ خود بنتی چلی جاتی ہے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ میں نے دیانت داری سے تعلیم دینے کے لیے اپنی بیوی اور بچے کو چھوڑ دیا۔ آپ کے شوہر کے احکامات کو ٹھکرا دیا۔ زندگی کے دس برس کچرا گھر میں گزار دیئے۔ میں آج بھی وہی پتھر ہوں۔"

"محترمہ! بچوں کے عالمی سال میں بڑوں کا محاسبہ ہوگا کہ ہم اسکول کے بچوں کے ساتھ' اپنے عامر اور اپنی فوزیہ کے ساتھ اور اپنی نواسی کے ساتھ کس طرح خود غرض ہو کر سلوک کرتے ہیں۔ نئی نسل کی سوچ میں جو زہر ہوتا ہے' وہ ہماری غلط پرورش اور غلط روش کے چور دروازے سے ان کے دماغوں میں پہنچتا ہے۔ ان معاملات میں نظام الدین اسکول ماسٹر سے سمجھوتا ناممکن ہے۔"

ہماری ٹیکسی کچرا گھر کے قریب پہنچ گئی۔ وہاں طفیل احمد کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ ہم نے ٹیکسی سے باہر آکر دیکھا۔ کچرا گھر میں ایک موم بتی روشن تھی۔ فوزیہ دیوار کی طرف منہ کیے میری پوتی کو دودھ پلا رہی تھی۔ عامر اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ فوزیہ نے سر گھما کر دیکھا پھر اونچی آواز میں بولی۔

"پپا! اگر آپ جھوٹی عزت کا کفن لپیٹ کر آئے ہیں تو یہیں مرجایئے۔ آپ کو پپا کہتے ہوئے میری زبان جلتی ہے۔ رسولؐ اللہ کا حکم تھا کہ بیٹیوں کو زندہ دفن نہیں کیا جائے گا۔ آپ کیسے مسلمان ہیں؟ آپ نے میری بیٹی کو کچرے کی قبر میں زندہ دفن کر دیا تھا۔ آپ کے دماغ میں کیسا کچرا بھرا ہے؟"

یہ کہتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ہماری آنکھیں بھی بھیگنے لگیں۔ درد کے رشتے محبت سے آنسو بہا رہے تھے۔ طفیل احمد ہولے ہولے بڑبڑا رہا تھا۔

"بیٹی! رات ہے۔ سناٹا ہے۔ دوسرے لوگ نہیں دیکھ رہے ہیں۔ اب بھی وقت ہے۔ میری عزت رکھ لو۔ واپس چلو بیٹی......"

ایسا کہتے وقت وہ بھی رو رہا تھا۔ مگر آنسوؤں میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اس کے دماغ کے کباڑ خانہ سے آنسو کچرے کی طرح آنکھوں کے راستے بہہ رہے تھے۔

○☆○

شبابِ کہن

شباب انسانی حوصلے کا نام ہے
شباب فرہاد کا نہیں، تیشے کا نام ہے
اکثر بڑھاپے میں جوانی آتی ہے
لیکن وہ بڑھاپا اکثر جھکنے کے باوجود
گرنے والی کو جھک کر نہیں اٹھا سکتا۔

(ایک بوڑھے کی داستان، جو شادی کے لیے جوان۔ لیکن چوڑی والی ہاتھ کو تھامنے کا حوصلہ نہ تھا۔)

شباب کہن

یہ کہنا غلط ہے کہ جوانی لوٹ کر نہیں آتی۔ نہیں جی، آتی ہے اور بڑے دھوم دھڑکے سے آتی ہے۔ ارمان صاحب کی مثال سامنے تھی۔ انہوں نے پچاس برس کی عمر میں ایسا رنگ روپ نکالا تھا کہ اپنے پرائے سب ہی انہیں دیکھ کر حیرانی سے پوچھتے تھے۔

"کیا کوے کا گوشت کھا لیا ہے؟ بالوں سے بھی سفیدی نہیں جھلکتی ہے۔ کیا آپ خضاب لگاتے ہیں؟"

ارمان صاحب نے خضاب کو کبھی ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ یہ خدا کی دین ہوتی ہے اور اس معبود کے دینے کا انداز بھی نرالا ہوتا ہے۔ جوانی بھی چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔

پہلے ارمان صاحب دھان پان سے تھے۔ ایسے نحیف و نزار کہ چلتے وقت ہوا پیچھے سے دھکے دیتی تھی اور آگے سے وہ واکنگ اسٹک کی پتوار سنبھالتے تھے۔ اپنی داڑھی کی طرح ہوا کی زد سے ادھر سے ادھر ہوتے رہتے تھے۔ محلے کی عورتیں احتراماً انہیں بڑے میاں کہہ کر مخاطب کرتی تھیں، اور وہ برا نہیں مانتے تھے کیونکہ بڑھاپے میں محترم شخصیتوں کو ایسے ہی مخاطب کیا جاتا ہے۔

ان دنوں تقدیر بڑی بے رحم تھی۔ تین وقت کی روٹیاں بڑی مشکلوں سے دیتی تھی۔ جس کاروبار میں ہاتھ لگاتے تھے، نقصان اٹھاتے تھے۔ انہوں نے دس برس تک ملازمت

کی۔ ملازمت چھوڑ کر پانچ برس تک انشورنس ایجنٹ بنے رہے۔ جب بچے جوان ہونے لگے اور ان کی شادی بیاہ کی فکر لاحق ہوئی تو فٹ پاتھ پر دکان لگانے لگے۔ تقریباً بیس برس بعد عقل آئی کہ وہ ایمانداری سے روکھی سوکھی کھا کر گزارہ تو کرسکتے ہیں لیکن اس دنیا کے میلے سے ایک داماد نہیں خرید سکتے اور گھر میں ایک بہو نہیں لاسکتے۔

وہ پانچ وقت کے نمازی تھے۔ بے ایمانی کا خیال آتے ہی خدا سے ڈرتے تھے۔ صدر کے فٹ پاتھ پر دکان لگا کر انہوں نے دیکھا کہ آس پاس کے دکانداروں کے پاس قیمتی گھڑیاں ہوتی ہیں' وہ لوگ عمدہ لباس پہنتے ہیں' ان کے اپنے ذاتی مکانات ہوتے ہیں اور وہ اپنے بچوں کی شادیاں بڑی دھوم دھام سے کرتے ہیں۔

پہلے تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ فٹ پاتھ کی معمولی دکان سے اتنی دولت کیسے حاصل ہو جاتی ہے؟ پھر رفتہ رفتہ ارمان صاحب کے پاس بھی فلائنگ بروکر یعنی چلتے پھرتے دلال آنے لگے۔ وہ اسمگل کی ہوئی گھڑیاں' ریڈیو' کیسٹ ریکارڈر' کپڑوں کے تھان اور نقلی زیورات لاتے تھے اور انہیں معقول کمیشن پر فروخت کرنے کے لیے فٹ پاتھ پر چھوڑ جایا کرتے تھے۔

ارمان صاحب نے پہلے کبھی غیر قانونی کام نہیں کیا تھا لیکن جہاں آمدنی کی بات آتی ہے وہاں گھر کی ناقص العقل عورتیں عقل سکھاتی ہیں کیونکہ محدود آمدنی میں وہ گھر کے اخراجات پورے نہیں کرسکتیں۔ لامحدود آمدنی کے سپنے دیکھتی رہتی ہیں لہٰذا ان کی عذرا بیگم نے سمجھایا۔ "ہم بوڑھے ہو چلے ہیں حلال کی روزی کھاتے کھاتے اس دنیا سے گزر جائیں گے مگر ہمارے بچوں کا کیا بنے گا۔ بہو لانے کی حسرت ہی رہ جائے گی۔ بڑی لڑکی شادی کے لیے تیار بیٹھی ہے۔ دوسری بھی دو چار سال میں جوان ہو جائے گی۔ بڑا لڑکا چار سو روپے ماہوار کماتا ہے۔ ہمارے بعد وہ مکان کا کرایہ بھی ادا نہیں کرسکے گا۔ بچے دربدر ہو جائیں گے۔"

عذرا بیگم نے آنے والے دنوں کی ایسی خوفناک تصویر کھینچی کہ وہ اسمگلنگ کا مال بیچنے پر مجبور ہوگئے۔ پہلے ہی دن کی آمدنی سے اندازہ ہوا کہ وہ اب تک جھک مار رہے تھے۔ کاروبار تو انہوں نے اب سیکھا ہے۔ کسی دن دو سو روپے کی بچت ہونے لگی اور کسی دن دو ہزار روپے بھی ملنے لگے۔ ان کی تو آنکھیں کھل گئیں' دماغ روشن ہوگیا۔ اس

روشنی میں صرف اتنا سا نقصان ہوا کہ ایمان تھوڑا سا ڈھیلا پڑ گیا۔

ہماری دنیا میں ایسے لوگ زیادہ ہیں جو مفاد کے لئے ایمان کا نقصان برداشت کر لیتے ہیں۔ ارمان صاحب کی بیگم اپنی بیٹیوں اور آنے والی بہو کے لیے زیورات بنوانے لگیں۔ چھ ماہ بعد انہوں نے نیو کراچی میں زمین خرید لی۔ اگلے چھ ماہ بعد مکان کی تعمیر شروع ہوگئی۔ کاروبار کے چمکنے کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ ارمان صاحب کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ وہ عبادت گزار تھے۔ ان کے ہاتھ کی انگلیوں کے درمیان تسبیح کے دانے پھسلتے رہتے تھے۔ لہٰذا پولیس والوں کو کبھی شبہ نہ ہوا کہ وہ اسمگلنگ کا مال فروخت کرتے ہیں۔

بڑی بڑی بیگمات دکان پر آکر مول بھاؤ کرنا نہیں چاہتیں۔ جتنے دام بتائے جاتے ہیں' وہ ادا کر کے چلی جاتی ہیں۔ ان بیگمات نے جب فرشتہ صورت ارمان صاحب کو دیکھا تو ان کی دکان کے پاس اپنی کاریں پارک کرنے لگیں۔ ارمان صاحب نے کاروبار کا سلیقہ سیکھ لیا تھا۔ وہ خود ہی نوٹ بک لے کر ان کی کاروں کے پاس چلے جاتے پھر رازدارانہ انداز میں کہتے۔ "بیگم صاحبہ! آج کل پولیس کے چھاپے پڑ رہے ہیں۔ تمام مال ہم نے گودام میں بند کر دیا ہے۔ آپ اپنا پتہ نوٹ کرا دیں' میں آپ کا سامان کوٹھی پر پہنچا دوں گا۔"

اس طرح انہیں ضرورت مند بیگمات کے پتے حاصل ہونے لگے۔ انہوں نے ایک اسکوٹر خرید لیا اور اس کے ذریعے مال کوٹھیوں پر پہنچانے لگے۔ کوٹھیوں کی سجاوٹ اور وہاں کے مکینوں کا پہناوا دیکھ کر انہیں احساس ہوا کہ وہ رہن سہن کے معاملے میں ان سے سو سال پیچھے ہیں۔ ایک بیگم صاحبہ جانے کیسے ان پر مہربان ہوگئی تھیں۔ ہمیشہ اپنے پاس بٹھا کر مسکرا کر باتیں کرتیں اور مال پسند کرتی تھیں۔

پہلے تو ارمان صاحب کو یقین نہیں آیا کہ اتنی اونچی سوسائٹی کی بیگم ان کے آگے گھاس ڈال سکتی ہے۔ انہوں نے گھر پہنچ کر آئینہ دیکھا۔ تب انکشاف ہوا کہ وہ بہت بدل گئے ہیں۔ اب پہلے جیسے دبلے پتلے سے مولوی نہیں رہے۔ جسم پر گوشت آگیا ہے اور چربی کا اضافہ ہو رہا ہے۔ چہرے پر رونق آگئی ہے۔ اگر وہ کسی اچھے ٹیلر ماسٹر سے کپڑے سلوا کر پہننا شروع کر دیں تو بیگم صاحبہ جیسے لوگوں کی صف میں آجائیں گے۔

وہ اپنی صحت اور جسمانی انقلاب کو پہلے بھی سمجھ سکتے تھے کیونکہ روز ہی آئینہ دیکھتے

تھے لیکن حقیقت کو دیکھنا اور بات ہے اور اس کا گیان حاصل کرنا دوسری بات ہے۔ یہ تب ہوتا ہے جب کوئی حسین عورت اپنی نظروں کی بھیک دیتی ہے تو مرد اس کی نظروں کے آئینے میں خود کو دیکھتا ہے۔

اس روز وہ قد آدم آئینے میں خود کو دیکھ رہے تھے۔ ایسے ہی وقت ان کی بیگم پیچھے سے آگئیں۔ عذرا بیگم کے سر کے بال کہیں کہیں سے سفید ہو چلے تھے۔ ان کے چہرے سے بڑھاپا صاف جھلکتا تھا جب کہ ارمان صاحب کے چہرے پر تازگی اور سرخی تھی' اس عمر میں بھی بال سیاہ تھے۔ ایک ہی آئینے میں خود کو اور بیگم کو دیکھ کر یوں لگا جیسے وہ خود پچیس برس کے ہیں اور بیگم پچاس برس کی ہو گئی ہیں۔

عذرا بیگم نے قریب آکر کہا۔ "توبہ ہے' گھنٹے بھر سے یہاں کھڑے ہیں۔ کیا یہ آئینہ دیکھنے کی عمر ہے؟"

انہوں نے بے دھڑک ایک سوال داغ دیا۔ "کیا میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔"

مرد اپنی عمر کی انتہا کو پہنچ کر اگر یہ سوال کرے تو بوڑھی بیوی کے کانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ عذرا بیگم گھبرا کر ان کا منہ تکنے لگیں۔ وہ تو اچھے خاصے جوان نظر آرہے تھے۔ انہیں کسی پہلو سے بوڑھا نہیں کہا جا سکتا تھا۔ پھر بھی وہ بولیں۔ "بچے جوان ہو جائیں تو ماں باپ بوڑھے بزرگ کہلاتے ہیں۔"

"بڑھاپا اور چیز ہے۔ بزرگی اور بات ہے۔ میں اپنے بچوں کے لیے بزرگ ہوں لیکن بوڑھا تو نہیں ہوں۔"

وہ پھر چند لمحوں کے لیے لاجواب ہو گئیں پھر بولیں۔ "جوان بچوں کے ہوتے ہوئے اپنی جوانی کی باتیں زیب نہیں دیتیں"۔

یہ کہہ کر وہ چلی گئیں۔ آئینہ ایک بوڑھی پرچھائیں سے خالی ہو گیا۔ ارمان صاحب نے اطمینان کی سانس لے کر اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا۔ "اپنے آپ کو تھوڑا سا بدلنا ہوگا۔ اگر داڑھی ذرا سی چھوٹی ہو جائے تو کیا حرج ہے؟"

ایسا سوچتے وقت ان کے اندر چھپے ہوئے ایمان نے ان کو ملامت کی۔ لوگ ایک وقت میں مذہبی جوش و جذبے کے تحت داڑھی رکھ لیتے ہیں۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ اپنی مردانہ وجاہت اور جوانی کی نمائش کے لیے داڑھی کو بوجھ سمجھنے لگتے ہیں۔ ارمان

صاحب نے اپنے آپ کو بہت سمجھایا۔ "میں داڑھی کو بوجھ نہیں سمجھ رہا ہوں۔ سر کے بالوں کو جس طرح تراشا جاتا ہے بس اسی طرح داڑھی کو تھوڑا سا تراش لیا جائے گا۔ چہرے کی ہر چیز کو سنوار کر رکھنا چاہیے۔"

انسان اپنے طریقوں پر چلنے کے لیے ادھر ادھر سے دلائل ڈھونڈ لاتا ہے۔ ایک ہفتے بعد ہی ان کا حلیہ بدل گیا۔ عذرا بیگم نے پوچھا۔ "یہ آپ نے داڑھی مختصر کیوں کر دی؟"

"بھئی اسکوٹر چلاتے وقت ادھر ادھر لہراتی ہے' کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ کیا داڑھی کو مختصر کرنا کوئی جرم ہے؟"

واقعی کوئی جرم نہیں ہے۔ اس لیے بیگم نے پوچھا۔ "آپ پہلے کبھی پتلون نہیں پہنتے تھے اب یہ تبدیلی کیسی؟"

"مجھے بڑی بڑی کوٹھیوں میں جانا پڑتا ہے۔ وہاں پاجامہ پہن کر جانا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ جیسا دیس ہوتا ہے ویسا بھیس بدلنا پڑتا ہے۔"

جوانی کی زبان پر ہر بوڑھے سوال کا جواب حاضر رہتا ہے۔ وہ اپنے طور پر معقول جواب دے کر چلے گئے لیکن عذرا بیگم کا دل ڈوب رہا تھا۔ وہ جانماز بچھا کر بیٹھ گئیں۔ دعا مانگتے وقت ان کی آنکھوں سے بے اختیار ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ رونے کی بات ہی تھی۔ اللہ میاں کا انصاف سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ انہیں بڑھاپے کی خندق میں ڈال کر شوہر کو جوانی کی پرواز کیوں دے دی تھی؟ قدرت کے تماشے سمجھ میں نہیں آتے۔

ارمان صاحب اسکوٹر کے آگے پیچھے مال لاد کر کوٹھی میں پہنچے تو ان پر مہربان ہونے والی بیگم نے پہلی بار ان کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "آج تو آپ بڑے ہی اسمارٹ نظر آرہے ہیں۔"

وہ خوش ہو گئے۔ بیگم کے ہاتھوں میں ان کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ وہ بیگم بھی ان کی عذرا بیگم کی ہم عمر تھیں۔ مگر کوٹھیوں کے حسن میں مکھن کی آمیزش اور بے فکری کی چکنائی ہوتی ہے اس لیے ارمان صاحب کے ہاتھ پھسلنے کے خوشگوار خوف سے کانپ رہے تھے۔

انہوں نے فارن کپڑوں کے تھان اور کاسمیٹکس کے سامان کھول دیے۔ مختلف خوشبوؤں کی خوب صورت شیشیاں سامنے رکھ دیں۔ بیگم ارمان صاحب کی تعریفیں کر رہی تھیں اور اپنی پسند کی چیزیں الگ رکھتی جا رہی تھیں۔ اس روز تین ہزار روپے کا بل

بناجسے بیگم نے ہمیشہ کی طرح ادھار کے کھاتے میں لکھوا دیا۔

ارمان صاحب کو توقع تھی کہ آج بیگم صاحبہ نے محبت سے ہاتھ تھاما ہے تو اسی محبت سے پچھلا تمام بل بھی ادا کردیں گی لیکن توقع پوری نہ ہوئی۔ بیگم نے ان کے کاروبار کو کاروبار عشق میں بدل دیا۔ اس نے کہا۔ "میں دو دن سے آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہوگیا ہے۔ آپ نہیں آتے ہیں تو یہ کوٹھی کاٹنے کو دوڑتی ہے۔"

ارمان صاحب نہال ہوگئے۔ انہوں نے پوچھا۔ "کیا آپ یہاں تنہا رہتی ہیں؟"

"ہاں میرے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔ ایک بیٹا ہے جو لندن میں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ یہاں اپنا کوئی نہیں ہے۔ جب سے آپ آنے لگے ہیں' مجھے احساس ہونے لگا ہے کہ میں اب تنہا نہیں رہ سکتی۔"

ارمان صاحب کے کانوں میں شہنائیاں گونجنے لگیں۔ اب تک انہوں نے دوسری شادی کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا۔ اب بیگم کی دکھ بھری تنہائی نے سمجھایا کہ وہ دو بیویوں کے اکلوتے ہیرو بن سکتے ہیں۔ انہوں نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔ "میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

پھر انہیں خیال آیا کہ خدمت والی بات تو دکاندار کرتے ہیں۔ انہیں بیگم کی تنہائی کے سلسلے میں کوئی رومانی فقرہ کہنا چاہیے۔ لیکن انہوں نے پہلے کبھی رومانس کیا تھا نہ رومانی ناول پڑھے تھے اور نہ ہی عشقیہ فلمیں دیکھی تھیں اس لیے کوشش کے باوجود کوئی پیار بھرا جملہ ان کی زبان سے ادا نہ ہو سکا۔

بیگم نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "خدمت کے لیے تو ملازم موجود ہیں۔ اب میں آپ سے کیا کہوں؟ آپ بڑے بھولے ہیں۔"

ارمان صاحب نے بڑی ہمت کر کے بیگم کا ہاتھ تھام لیا۔ بیگم آرام سے بیٹھی رہیں البتہ وہ کانپنے لگے۔ آواز حلق میں پھنسنے لگی۔ "میں آپ...... آپ..... آپ سے شادی کروں گا۔"

بیگم نے نظریں ملاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا شادی کرنے سے میری تنہائی کا احساس ختم ہو جائے گا۔"

"ہاں میں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہوں گا۔"

"ہمیشہ ساتھ رہنے سے بے زاری بڑھ جاتی ہے۔ میاں بیوی جلد ایک دوسرے سے اکتا جاتے ہیں۔ پھر شادی کرنے سے میرا بیٹا ناراض ہو جائے گا۔"

ارمان صاحب کو خیال آیا کہ ان کے بچے بھی اس شادی سے ناراض ہو جائیں گے۔ انہوں نے تائید کی۔ "ہاں بچے تو ناراض ہو جائیں گے لیکن میں بھی آپ کی طرح ایک ساتھی کی کمی محسوس کر رہا ہوں۔"

"تو بس ہم ساتھی بن کر رہیں گے۔ ایک دوسرے کا انتظار کریں گے۔ ملتے رہیں گے اور بچھڑتے رہیں گے۔ اس طرح محبت ہمیشہ قائم رہتی ہے۔"

ارمان صاحب نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "ہم صرف ملتے بچھڑتے رہیں گے۔ یعنی کہ...... میرا مطلب ہے کہ اور کچھ...... کک کچھ نہیں ہوگا؟"

بیگم شرمانے لگیں۔ ارمان صاحب نے ذرا قریب ہو کر شانہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ کچھ نہ بولیں شرماتی رہیں۔ ارمان صاحب نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا۔ "آ...... آپ نامحرم ہیں۔ شادی کے بغیر یہ سب گناہ ہوگا۔"

بیگم نے اپنی ہنسی کو دباتے ہوئے پوچھا۔ "کیا آپ مولوی ہیں؟"

"ہر مسلمان کو اس حد تک مولوی ہونا چاہیے۔ اگرچہ شادی کرنے کی میرے بیوی بچے بھی مخالفت کریں گے لیکن میں آپ کے اتنے قریب آکر شادی کیے بغیر نہیں رہ سکتا کیونکہ میں گناہ سے ڈرتا ہوں۔"

"تو آپ پھر میرے پاس کیا کر رہے ہیں۔"

وہ گڑبڑا گئے۔ زندگی میں پہلی بار کسی نامحرم نے قریب آنے کی اجازت دی تھی۔ جذبے بول رہے تھے کہ محرم سے زیادہ نامحرم میں کشش ہوتی ہے۔ وہ بیگم کو ناراض نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے کہا۔ "میں تو دین ایمان کی باتیں سمجھا رہا ہوں۔ ہمیں اللہ سے ڈرنا چاہیے۔"

"ہاں تو ڈریے نا۔"

بیگم کی یہ بات ایک چیلنج تھی کہ اے لوگو! اگر خدا سے ڈرتے ہو تو عورت کے قریب آکر پیچھے ہٹنے کی مثالیں پیش کرو۔ لیکن ایسے وقت بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ عین نگاہوں کے قریب بیگم کا چہرہ تھا۔ صاف و شفاف جلد چمک رہی تھی۔ پھر شرمیلی ادائیں

تھیں۔ ارمان صاحب کو اپنا سمجھ کر دل پیش کر دینے کے خطرناک ارادے بھی تھے۔ ایسے میں آدمی تو رہتا ہے عقل نہیں رہتی۔

ارمان صاحب کی زبان لڑکھڑائی۔ "میرا خیال ہے ہاتھ پکڑنے اور قریب آنے یعنی کہ صرف قریب آنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔"

بیگم خاموش رہیں۔ وہ بولے۔ "یہ...... اسے ہی تو محبت کہتے ہیں۔ ہپ...... پاک محبت......"

وہ ایک دم سے پاک محبت کے لیے قریب ہوگئے۔ بیگم نے پوچھا۔ "کیا آپ جانتے ہیں کہ دولہا اپنی دلہن کو ہاتھ لگانے یا چہرہ دیکھنے سے پہلے اسے انگوٹھی کیوں پہناتا ہے؟"

"ہاں۔ یہ ایک رسم ہے۔"

"صرف رسم نہ کہیں۔ یہ رسم محبت ہوتی ہے۔ اس وقت دولہا کی جیب میں سب سے قیمتی چیز انگوٹھی ہوتی ہے۔ وہ اسے پہنا کر یہ سمجھاتا ہے کہ آج سے میرا سب کچھ تمہارا ہے۔ ہمارے درمیان صرف محبت ہوگی۔ سودے بازی کبھی نہ ہوگی۔"

ارمان صاحب نے بیگم کے دوسرے شانے پر بھی ہاتھ رکھ دیا۔ "ٹھیک ہے میرا سب کچھ آپ کا ہے۔ اب کبھی سودے بازی نہ ہوگی۔"

بیگم فوراً ہی منہ پھیر کر بولیں۔ "نہیں، نہیں میں جب تک آپ کا تمام بل ادا نہیں کروں گی اس وقت تک سودے بازی تو قائم رہے گی نا؟"

"کیسا بل؟ کہاں کا بل؟ پچھلا حساب بیباق سمجھو۔"

"کیسے سمجھوں؟ کھاتے میں حساب موجود ہے۔ آپ جھوٹ موٹ محبت جتا رہے ہیں۔"

ارمان صاحب نے سچی محبت ثابت کرنے کے لیے فوراً ہی نوٹ بک نکالی۔ بیگم چھ ماہ کے عرصے میں اٹھارہ ہزار کا مال ادھار لے چکی تھیں۔ نوٹ بک کے ایک صفحے پر سارا حساب لکھا ہوا تھا۔ انہوں نے وہ صفحہ پھاڑ کر اس کے پرزے پرزے کر دیے۔

بیگم "ہائے ارمان" کہہ کر پرزے پرزے ہونے کے لیے ان کے پاس پہنچ گئیں۔ ارمان صاحب قدرے بوکھلا سے گئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسے وقت بیگم کو کس طرح خوش آمدید کہنا چاہیے کیونکہ ان کا دماغ نیکی اور بدی کی حدیں قائم کرنے میں الجھ

گیا تھا۔

کبھی کبھی وقت ایسے گزرتا ہے کہ پتہ ہی نہیں چلتا۔ ارمان صاحب کے دماغ پر دھند سی چھاگئی تھی۔ جب وہ کوٹھی سے باہر آئے تو ان کے قدم شرابیوں کی طرح لڑکھڑا رہے تھے۔ دروازے پر کھڑی بیگم کی آواز کانوں میں رس گھو رہی تھی۔ "کل اسی وقت میں آپ کا انتظار کروں گی اور لنچ بھی آپ کے ساتھ ہوگا۔"

وہ اسکوٹر اسٹارٹ کرتے ہوئے اور ہاں ہاں کے انداز میں سرہلاتے ہوئے کوٹھی کے احاطے سے باہر آگئے۔ ان کے اندر جیسے آگ سی لگی ہوئی تھی۔ جوانی کے نشے میں اسکوٹر قابو سے باہر ہو رہا تھا۔ وہ ایک کولڈ ڈرنک کی دکان کے سامنے اسکوٹر روک کر ٹھنڈا مشروب پینے بیٹھ گئے۔ ٹریفک کی بھیڑ بھاڑ میں اسکوٹر چلانے کے لیے اپنے ہوش و حواس کو درست رکھنا ضروری تھا ورنہ حادثے کا شکار ہو جاتے۔

وہ بیٹھے بیٹھے ٹھنڈی دو بوتلیں پی گئے۔ اندر کی حرارت کچھ کم ہوئی تو آئس کریم بھی منگوا کر اپنے دل و دماغ کو ٹھنڈک پہنچائی۔ اس کے بعد انہیں یہ سوچ کر خوشی ہوئی کہ وہ گناہ سے بال بال بچ گئے تھے۔ خدا کا خوف غالب آگیا تھا۔

ارمان صاحب بلاشبہ ایسے لوگوں میں سے تھے جو ہر حال میں خدا سے ڈرتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے یہ بھی لازمی ہے کہ آدمی گناہ کے ماحول سے دور رہے ورنہ اس ماحول کے زیر اثر رفتہ رفتہ خوف خدا بھی جاتا رہتا ہے۔ ارمان صاحب کے لیے یہ آزمائش کی گھڑی تھی کہ وہ کوٹھی کے ماحول سے کترا کر رہ سکتے ہیں یا نہیں۔

رات کو وہ گھر واپس آئے۔ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ دل یہی چاہ رہا تھا کہ تنہائی میں آرام سے لیٹ کر بیگم کو یاد کرتے رہیں لیکن گھر میں ان کی منکوحہ عذرا بیگم تھیں جو ستائیس برس سے ان کی تنہائی کی رفیقہ تھیں اور اب بہت پرانی، کباڑ خانے کی چیز لگتی تھیں۔ ارمان صاحب نے ان سے کترا کر برآمدے میں چارپائی ڈال لی اور وہیں بستر لگا کر لیٹ گئے۔

وہ رات خوابوں اور خیالوں کی دنیا بسانے والی رات تھی۔ وہ کروٹ پر کروٹ بدلتے رہے اور خیالوں ہی خیالوں میں کوٹھی والی بیگم سے شادی کر کے اپنے ارمان پورے کرتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صبح تک بیگم صاحبہ اور زیادہ حواس پر چھا گئیں۔ صبح

اذان کے وقت انہیں ہوش آیا کہ وہ اب تک جوانی کے طلسم میں گم رہے تھے۔

انہوں نے فوراً ہی اٹھ کر غسل کیا' اور نماز ادا کی۔ دعا مانگتے وقت وہ دل ہی دل میں گڑگڑانے لگے۔

"میرے معبود! میں کیا کروں؟ بیگم کی طرف جاؤں گا تو گناہ اپنی طرف کھینچے گا۔ نہیں جاؤں گا تو اندر ہی اندر تڑپتا رہوں گا۔ بیگم میری جوانی کا ایسا لقمہ ہے جسے نہ نگل سکتا ہوں نہ اگل سکتا ہوں۔ میں کیا کروں؟ خدایا! تو ہی میری مشکل آسان کر سکتا ہے۔"

صبح ناشتے سے فارغ ہونے تک ان کا یہی ارادہ تھا کہ بیگم سے ملنے نہ جائیں۔ حتی الامکان کترانے کی کوشش کریں گے۔ اس ارادے کے باوجود انہوں نے ٹیلر ماسٹر سے سلوایا ہوا نیا سوٹ زیب تن کیا۔ پہلے وہ عطر لگایا کرتے تھے اب یو ڈی کلون کی انگریزی خوشبو لگائی۔ اگر وہ حسب معمول عام حالت میں دکانداری کے لیے گھر سے روانہ ہوتے تو یقیناً دکان تک پہنچ جاتے لیکن وہ خود نہ سمجھ سکے کہ نئے سوٹ میں بسی ہوئی خوشبو انہیں کس طرح سحر زدہ کرتی ہوئی بیگم کی کوٹھی تک لے گئی۔

اسکوٹر کی آواز سنتے ہی بیگم دروازے پر آگئیں۔ اور مسکرا کر بولیں۔ "مائی گڈنس اسکوٹر کی آواز ایسی لگتی ہے جیسے پٹاخے چھوٹ رہے ہوں۔"

ارمان صاحب کو کمتری کا احساس ہوا۔ انہوں نے فوراً برتری جتائی۔ "ہاں میں اسے پھینکنے والا ہوں۔ نئی کار خریدوں گا۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آئے۔ ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اگر پاس میں صوفہ نہ ہوتا تو فرش پر گر پڑتے بیگم ان کے ساتھ ہی صوفے پر گرتے ہوئے ہنس کر بولیں۔ "آپ اپنا بوجھ نہیں سنبھال سکتے تو میرا بوجھ کیسے سنبھالیں گے؟"

"آں...... یہ...... یہ بات نہیں ہے۔ میں دراصل صاف صاف بات کرنے آیا ہوں۔ ہم کو یعنی ہم دونوں کو پہلے شادی کر لینا چاہیے۔"

"کریں گے۔ جلدی کیا ہے۔"

"جلدی ہے۔ میں کل رات بھر نہ سو سکا۔"

وہ شرماتے ہوئے بولیں۔ "میں بھی نہ سو سکی۔ مگر میں کیا کروں۔ اتنی جلدی شادی نہیں کر سکتی۔ میں کل سے بہت پریشان ہوں۔"

"کیسی پریشانی؟"

"میرے بیٹے نے لندن سے تیس ہزار روپے کی فرمائش کی ہے۔ اگر میں نے یہ رقم فوراً ارسال نہ کی تو اس کی پریشانیاں بڑھ جائیں گی۔ اس لیے میں پریشان ہوں۔"

ارمان صاحب نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی کوئی پریشانی کی بات ہے۔ آپ فوراً یہ رقم بھیج دیں۔ دو چار ہزار کی کمی ہوگی تو میں پوری کر دوں گا۔"

"میرے پاس کمی نہیں ہے۔ دراصل میں بینک سے فکس ڈپازٹ کی رقم نکال نہیں سکتی۔ میری کار پچاس ہزار میں فروخت ہو سکتی ہے لیکن وہ کار میں آپ کو اپنی نشانی کے طور پر دینا چاہتی ہوں' فروخت نہیں کروں گی۔"

"اتنی بڑی کار آپ مجھے دیں گی!"

"وہ آپ سے بڑی نہیں ہے۔ آپ اسکوٹر چلاتے ہیں تو مجھے غریب غریب سے لگتے ہیں۔"

"لیکن...... میں...... تو نئی کار خریدوں گا"

وہ ذرا ناراضگی سے بولیں۔ "اوہ میں سمجھی! میری کار پرانی ہے۔ کبھی میں بھی پرانی ہو جاؤں گی۔"

وہ جلدی سے اپنی روٹھی ہوئی محبوبہ کا ہاتھ تھام کر بولے۔ "یہ...... یہ بات نہیں ہے۔ خدا کی قسم آپ میرے لیے کبھی پرانی نہیں ہو سکتیں۔ میں تو چاہتا تھا کہ آپ وہ کار فروخت کر کے اپنے بیٹے کا مطالبہ پورا کر دیں۔ بہرحال جب وہ تحفہ میرے لیے مخصوص ہو چکا ہے تو پھر میں آپ کے لیے تیس ہزار کا بندوبست کر دوں گا۔"

"نہیں' آپ میرے لیے پریشان نہ ہوں۔ آپ تو یہی سمجھتے ہیں کہ شادی کے بغیر میں آپ کی نہیں ہوں۔ آپ یہ دکھاوے کی محبت رہنے دیں۔"

ارمان صاحب روٹھنے کی اس ادا پر ہزار جان سے قربان ہو گئے۔ "میں شادی کے بغیر بھی آپ کا ہوں اور شادی کے بعد بھی آپ ہی کا رہوں گا لیکن بہتر یہی ہے کہ شادی ہو جائے۔"

"آپ تو جانتے ہیں کہ تعلیم یافتہ گھرانوں میں ایک بیوہ عورت کو اپنے جوان بیٹے سے شادی کی اجازت لینی پڑتی ہے۔"

ہاں اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یوں بھی ہمیں اس طرح شادی نہیں کرنا ہے کہ
بچوں سے یہ بات چھپائی جائے۔ میں کل تک تیس ہزار کا انتظام کرلوں گا۔"
بیگم پھر ایک بار گلے کا ہار بن گئیں۔ ارمان صاحب کو تنہائی میں یہی ادائیں یاد آکر
تڑپاتی رہتی تھیں۔ دماغ یہ سمجھاتا تھا کہ ایک حسینہ دل و جان سے ان پر فدا ہو چکی ہے
اگر وہ اس کی تنہائی دور نہیں کریں گے تو وہ بے چاری مرجائے گی۔
جب وہ رخصت ہونے کے لیے کوٹھی سے باہر آئے تو بیگم نے انہیں کار کی چا
دیتے ہوئے کہا۔ "میں چاہتی ہوں کہ آپ میری کار میں بیٹھ کر جائیں۔"
"ابھی تو میں اسکوٹر لے جارہا ہوں۔ کل رقم لے کر آؤں گا تو کار لے جاؤں گا۔"
"آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے میری کار خرید رہے ہوں۔ دیکھئے میں صاف کے
دیتی ہوں کہ نہ میں کار فروخت کررہی ہوں اور نہ آپ تیس ہزار مجھے قرض دے رہے
ہیں۔ میری چیز آپ کی ہے اور آپ کا سب کچھ میرا ہے۔ ٹھیک ہے نا؟"
"بالکل ٹھیک۔" وہ اسکوٹر پر بیٹھ کر روانہ ہوگئے۔ اب وہ سوچ رہے تھے کہ تیس
ہزار کا انتظام کیسے کیا جائے؟ بینک میں پچیس ہزار تھے۔ یہ رقم اپنے نئے مکان کے رنگ
و روغن اور اندرونی سجاوٹ کے لیے تھی۔ دکان کا مال خریدنے کے لیے علیحدہ چالیس
ہزار تھے۔ وہ کاروبار کی یہ رقم بیگم پر خرچ نہیں کرسکتے تھے۔ ہاں عذرا بیگم کے نئے مکا
والی رقم اپنی نئی ہونے والی بیگم کو دے سکتے تھے۔
انہوں نے اسکوٹر کو ایک دکان پر فروخت کرنے کے لیے چھوڑا اور گھر پہنچ کر اعلا
کردیا کہ وہ دوسری شادی کرنے والے ہیں۔ یہ سنتے ہی پرانے رشتوں میں ہلچل سی
گئی۔ عذرا بیگم نے رو رو کر گڑگڑا کر اپنی ستائیس سالہ رفاقت اور خدمات کا واسطہ دیا
لیکن وہ یہی کہتے رہے کہ دوسری شادی ان کی اٹل ضرورت ہے اور وہ کوئی ناجائز قد
نہیں اٹھا رہے ہیں۔
ان کے جوان بچوں نے اپنی ماں کی طرف سے احتجاج کیا۔ ناراضگی بھی ظاہر کی
ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ دوسری شادی کا انہیں حق حاصل تھا۔ لہٰذا وہ اپنا حق حاصل کر
کے لیے دوسرے دن تیس ہزار روپے لے کر کوٹھی پر پہنچ گئے۔ بیگم خوشی سے پھولے
سما رہی تھیں۔ کہنے لگیں۔ "آپ جیسا زبان کا دھنی کبھی نہیں دیکھا۔ آپ جو کہتے ہیں

لھاتے ہیں۔ ہائے میں کتنی خوش نصیب ہوں کہ آپ میرے سرتاج بننے والے ہیں۔"
ارمان صاحب نے پہلی بار بیگم کو تم کہہ کر مخاطب کیا۔ "اب تم فوراً ہی اپنے بیٹے کو
خط لکھو کہ تم نے مجھ سے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"
"میں ابھی لکھوں گی لیکن ایک بات اور ہے میں اپنے بیٹے کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ
تیس ہزار کی رقم معمولی نہیں ہوتی۔ وہ سوچ سمجھ کر احتیاط سے خرچ کرے اگر اسے میں
یہ لکھ دوں کہ آپ نے سوتیلے باپ کی حیثیت سے یہ رقم دی ہے تو وہ اور سرچڑھ جائے
گا۔ آئندہ بھی بڑی رقموں کا مطالبہ کرے گا۔ اگر میں یہ لکھوں کہ بیٹے کی ضد پوری
کرنے کے لیے مجھے اپنی کار فروخت کرنا پڑی ہے تو وہ نادم ہوگا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"
"تم بڑی دانش مندی سے سوچتی ہو۔ واقعی بچوں کو اپنی پریشانیوں کا احساس دلانا
چاہیے تاکہ وہ فضول خرچی سے باز رہیں۔"
"تو پھر آپ ایک پکے کاغذ پر لکھ دیں کہ آپ نے تیس ہزار روپے میں میری کار
خرید لی ہے۔ میں یہ کاغذ اپنے بیٹے کو بھیج دوں گی۔"
وہ ذرا ہچکچانے لگے کیونکہ انہوں نے تیس ہزار محبت میں دیے تھے اور کار محبت
میں حاصل کی تھی۔ بیگم نے پوچھا۔ "آپ کیوں ہچکچا رہے ہیں؟ ہمارے درمیان کوئی
سودے بازی نہیں ہورہی ہے۔ یہ تو صرف اپنے بیٹے کو......"
"ہاں ہاں میں سمجھ گیا۔ ٹھیک ہے۔ میں لکھ دیتا ہوں۔"
بیگم انہیں بیڈ روم میں لے آئیں۔ وہ اتنا خوب صورت بیڈ روم تھا کہ وہ خوابوں
میں کھوگئے اور چشم تصور میں انہیں بیگم اپنے قریب ہوتی ہوئی نظر آئیں۔ ویسے بھی
ق میں دماغ سوجاتا ہے۔ انہوں نے سپنے کی حالت میں وہاں بیٹھ کر خریداری کا کاغذ لکھ
یا۔ بیگم نے فوم کے آرام دہ بستر پر لیٹ کر اس پکے کاغذ کو پڑھا۔ پھر اسے تہہ کرکے تکیے
نیچے رکھ دیا۔ اس کے بعد مسکراتے ہوئے ایک بھرپور انگڑائی لی۔
انگڑائی اسے کہتے ہیں جو بدن کے پیچ کردیتی ہے۔
وہ تھرا گئے۔ ایک دم سے ان کے اندر تڑپ پیدا ہوئی
لیکن جذبوں کی آندھی میں بھی وہ چیخ مار کر "جل تو جلال تو" کہتے ہوئے خواب گاہ
کی رنگینیوں سے باہر آگئے۔

ان کی چیخ سن کر ملازم دوڑتا ہوا آیا۔ "صاحب! کیا بات ہے؟"

وہ ہانپتے ہوئے صوفے پر بیٹھ کر بولے۔ "گلاس میں برف ڈال کر پانی لاؤ۔"

"صاحب! فریج کا پانی ٹھنڈا ہے۔ برف کی ضرورت نہیں ہوگی۔"

"ہوگا...... فریج سے پانی بھی لاؤ اور برف بھی۔"

ملازم دوڑتا ہوا گیا۔ اور دوڑتا ہوا آیا۔

اور ان کے سامنے ٹھنڈے پانی کی بوتل' ایک گلاس اور برف کی ٹرے رکھ دی۔ ارمان صاحب نے اسے واپس جانے کا حکم دیا۔ پھر اس کے جاتے ہی انہوں نے برف کی ٹرے الٹ کر اپنے سر پر رکھی اور ٹھنڈے پانی کی بوتل اٹھا کر اپنے سینے پر رکھتے ہوئے زور زور سے سانس لینے لگے۔

تھوڑی دیر بعد بیگم خواب گاہ سے باہر آئیں اور ناگواری سے بولیں۔ "آپ نے میری انسلٹ کی ہے۔ کیا میں ایسی گئی گزری ہوں کہ آپ بھاگ کر چلے آئے۔"

"نہیں' یہ بات نہیں ہے۔ دراصل میں تمہیں......"

وہ ڈانٹ کر بولیں۔ "خبردار! مجھے تم سے مخاطب نہ کرنا۔ ہمارے درمیان نہ بے تکلفی ہوئی ہے اور نہ کبھی ہوگی۔"

"آپ ناراض ہوگئیں۔"

"آپ جیسے مولوی کے ساتھ کوئی عورت خوش نہیں رہ سکتی۔"

"خدارا! ایسا نہ کہیں۔ میں آپ کو شریک حیات بنانے کے بعد یعنی کہ محرم راز بنانے کے بعد ہی' ہی ہی ہی......"

وہ شرما کر ہنسنے لگے۔ بیگم نے دروازے کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "گیٹ آوٹ۔"

وہ بوکھلا کر کھڑے ہوگئے۔ "کک...... کیا مطلب؟ آ...... آپ میری انسلٹ کر رہی ہیں۔"

وہ تیزی سے چلتے ہوئے کوٹھی کے باہر آئیں۔ ارمان صاحب بھی پیچھے دوڑتے ہوئے آئے' بیگم نے ان کے ہاتھ میں کار کی چابی دیتے ہوئے کہا۔ "سودے کے مطابق گیراج سے کار نکال کر یہاں سے دفع ہوجاؤ۔"

"میں نے سودا نہیں کیا ہے۔ میں نے تو محبت سے......"

"بڑے میاں! ہوش میں رہو۔ ایک شریف بیوہ عورت سے عشق کرتے شرم نہیں آتی؟"

بڑے میاں کا خطاب سن کر ان کا سر چکرا گیا۔ اس وقت وہ آئینہ نہیں دیکھ سکتے تھے کہ بدستور جوان ہیں یا نہیں؟ پرانے محلے کی تمام عورتیں' ماضی کے تمام لوگ ان کے کانوں کے پاس چیخ رہے تھے۔ "بڑے میاں۔ بڑے میاں۔ بڑے میاں......"

بیگم نے ان کے اندرونی کرب سے بے نیاز ہو کر ملازموں کو آوازیں دیتے ہوئے کہا۔ "کچے کاغذ کے مطابق رقم میری اور کار تمہاری ہے۔ جاؤ اور اپنی حیثیت کے مطابق کسی نچلے کلاس کی عورت سے عشق کرو۔"

بیگم کا رویہ انہیں برف سے زیادہ ٹھنڈا کر چکا تھا۔ وہ چپ چاپ گیراج میں آئے اور کار میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کرنے لگے۔ کار اسٹارٹ ہوتی تھی پھر انجن ان کی طرح ٹھنڈا پڑ جاتا تھا۔ بیگم کے ملازم کار کو دھکے دے کر کوٹھی کے احاطے سے باہر لائے تو وہ چل پڑی۔

ارمان صاحب اگر کار خریدنے سے انکار کرنا چاہتے تو شاید لڑائی جھگڑے کے بعد انہیں اپنے تیس ہزار روپے واپس مل جاتے لیکن وہ بیگم کی مکاری اور ان کے بڑے پن سے مرعوب تھے۔ وہ دوسروں کے سامنے اگر بے حیائی سے کہہ دیتیں کہ ارمان صاحب نے ان کے بدن کو ہاتھ لگایا ہے تو وہ شرم سے مرجاتے۔ اگر نہ مرتے تو اقرار کرنا پڑتا کہ انہوں نے بیگم کو حاصل کرنے کے لیے تیس ہزار دیے تھے اور اٹھارہ ہزار کا قرض معاف کیا تھا۔ جب کہ بیگم ان سے نفرت کر رہی تھیں' شادی زبردستی نہیں ہوتی۔ ارمان صاحب نے جو بازی ہاری' وہ ان کی اپنی حماقت تھی۔

اس رات انہوں نے برآمدے میں بستر نہیں لگایا۔ اپنی عذرا بیگم کے پاس لیٹے رہے۔ عذرا بیگم ان کا سر سہلاتی رہیں اور پریشانی کی وجہ پوچھتی رہیں۔ وہ شرمندگی سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ اپنی وفادار بیوی کے لیے سوکن لاتے لاتے اڑتالیس ہزار روپے کی چوٹ کھا چکے ہیں۔

ویسے پیسہ تو اب ان کے ہاتھ کا میل ہو گیا تھا۔ انہیں رقم ڈوب جانے کی اتنی پروا نہیں تھی جتنی کہ بیگم کی نفرت سے اپنی ذلت کا احساس ہو رہا تھا۔ اس عورت نے انہیں

بڑے میاں کہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر تلملا رہے تھے اور یہ ثابت کرنے کے منصوبے بنا
رہے تھے کہ وہ بڑے میاں نہیں ہیں۔ مشکل یہ تھی کہ وہ شادی سے انکار کر چکی تھیں۔

دوسرے دن پتہ چلا کہ کار ہمیشہ دھکے سے اسٹارٹ ہوتی ہے۔ تیسرے دن وہ اس
کار کو مرمت کے لیے گیراج لے گئے۔ گیراج کے مالک نے کار کو دیکھتے ہی پوچھا۔ "کیا یہ
یہ کار آپ نے دلشاد بیگم سے خریدی ہے؟"

"ہاں بھائی ذرا دیکھو کہ اس میں کیا خرابی ہے؟"

"اجی صاحب! اسے تو میں بارہا دیکھ چکا ہوں۔ یہ اوپر سے خوب صورت ہے۔ اندر
سے ایک دم بوڑھی ہے۔ بیگم صاحبہ بیس ہزار میں دینے کے لیے تیار تھیں۔ لیکن میں
اسے دس ہزار میں بھی لینے کو تیار نہ تھا۔ کہاں پھنس گئے آپ؟"

"اب تو پھنس گیا ہوں۔ آپ اسے دیکھ کر بتائیں کہ اس کی مرمت کے اخراجات
کیا ہوں گے؟"

دو گھنٹے بعد مستری نے سات ہزار کا خرچ بتایا۔ ارمان صاحب کو پسینہ آگیا۔ ان کے
دل سے پہلی بار بیگم کے لیے گالیاں نکلیں۔ ایک کار نے سمجھا دیا تھا کہ اوپر سے جوان
نظر آنے والوں کو اپنے اندر کے بڑھاپے کا علم ہونا چاہیے۔ انہوں نے غصے سے کہا۔
"میں ایسی گاڑی پر لعنت بھیجتا ہوں۔ یہ جس قیمت پر بھی جائے' آپ اسے فروخت
کردیں۔"

وہ اپنا نام اور پتہ لکھوا کر ہارے ہوئے جواری کی طرح دکان پر واپس آگئے۔ اب
انہوں نے عہد کر لیا تھا کہ صرف کاروبار میں دھیان لگائیں گے۔ وہ شام تک دکان پر
بہت مصروف رہے لیکن رات بڑی ظالم ہوتی ہے۔ اندھیرے اور تنہائی میں انسان کو
ورغلاتی ہے اور انگڑائی کے پیچ بتاتی رہتی ہے۔

ان کی راتیں بڑے ہی کرب کے عالم میں گزرنے لگیں۔ دن کو کاروبار میں دل
لگانے کی کوشش کرتے تھے مگر دل کہیں اور لگتا تھا۔ ذہن کہیں اور پرواز کرتا تھا۔ انہوں
نے بڑے صبر و تحمل سے جوانی کے باغیانہ جذبوں کو کچلتے کچلتے چھ ماہ گزار دیے' بیگم کو
بالکل ہی دماغ سے نکال کر پھینک دیا لیکن رفتہ رفتہ پتہ چلا کہ ان کی عادتیں کچھ بگڑتی
جارہی تھیں۔ وہ آس پاس سے گزرنے والی جوان عورتوں کو بے اختیار دیکھنے لگتے تھے۔

پھر خیال آتا کہ یہ گناہ ہے تو وہ نظریں جھکا لیتے۔ پھر دل کہتا کہ صرف دیکھ لینے میں کوئی
حرج نہیں ہے تو وہ محض دیکھ لینے کے لیے دیکھ لیتے تھے۔

اکثر یہی ہوتا ہے کہ پہلے نظریں بھٹکتی ہیں' پھر دل ڈولتا ہے۔۔ پھر دماغ پکتا ہے۔ آخر
کار آدمی خطاؤں کا پتلا بننے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ ارمان صاحب نے اچھی طرح سمجھ
لیا کہ وہ دوسری شادی کیے بغیر نہیں رہ سکیں گے اور اب کی بار وہ عشق نہیں کریں گے'
شریفانہ دستور کے مطابق کسی شریف گھرانے میں شادی کا پیغام بھیجیں گے۔

وہ دوستوں سے رائے مشورہ طلب کرنے لگے۔ اگر کھانا نہ ہو اور صرف مرغن
کھانوں کا ذکر ہوتا رہے تو قدرے جی بہلتا رہتا ہے۔ امید بندھی رہتی تھی کہ کہیں نہ
کہیں رشتہ طے ہو جائے گا۔ اسی امید میں مزید تین ماہ گزر گئے۔ ایک صاحب کھری باتیں
کیا کرتے تھے۔ انہوں نے صاف کہہ دیا۔ "ارمان صاحب! میں دو جگہ رشتے کی بات کر
چکا ہوں۔ وہ پوچھتے ہیں۔ لڑکا کیسا ہے؟ اب بتائیں۔ آپ لڑکے تو ہیں نہیں۔ ایسے وقت
مجھے بڑی شرمندگی ہوتی ہے۔"

ارمان صاحب نے کہا۔ "میں لڑکا نہیں ہوں مگر بوڑھا بھی نہیں ہوں۔ آپ ان
سے کہہ دیجئے' عمر ذرا زیادہ ہے اور زیادہ عمر والے خوشگوار ازدواجی زندگی گزارتے ہیں۔
نئے شریک حیات بناتے ہیں' اسے ہمیشہ خوش رکھتے ہیں۔"

اس وقت انہیں یہ یاد نہیں آیا کہ وہ عذرا بیگم کے ساتھ خوشگوار ازدواجی زندگی
نہیں گزار رہے ہیں۔ اپنی ایک ہی بیگم کو خوش رکھنے میں ناکام رہے ہیں۔ انسان ایک
نئے حسن کی آرزو میں پچھلے تمام حسن اور وفاؤں کو فراموش کر دیتا ہے یا جان بوجھ کر چشم
پوشی کرتا ہے۔

کچھ عرصے بعد ارمان صاحب نے دوستوں سے مایوس ہو کر اپنے طور پر کوشش کی۔
ایک شادی دفتر میں پہنچ گئے اور اپنا مدعا بیان کیا۔ پہلے زمانے میں لڑکے لڑکی کا رشتہ طے
کرنے والے کو نائی کہا جاتا تھا۔ آج کے ماڈرن زمانہ میں شادی دفتر کے کارکنوں کو پتہ
نہیں کیا کہا جاتا ہے۔ بہرحال وہاں کے ایک کارکن نے بتایا کہ جناب ایک بیوہ شادی کی
خواہش مند ہے۔"

بیوہ کا ذکر سن کر ارمان صاحب کا زخم تازہ ہوگیا۔ کوٹھی کی بیگم نگاہوں کے سامنے

آ گئیں۔ انہوں نے پوچھا۔ "عمر کیا ہے؟"

"تیس برس' یعنی کہ ابھی جوان۔ ہے۔ دو بچے بھی ہیں۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولے۔ "بچوں والی نہیں چاہیے۔"

"اچھا تو ایک اور بیوہ ہے۔ اس کی عمر......"

انہوں نے بات کاٹ کر پوچھا۔ "کیا آپ کے ہاں صرف بیوہ عورتوں کے رشتے ہیں۔"

"نہیں' دراصل ہم چاہتے ہیں کہ پہلے بیوہ عورتوں کو آپ جیسے شریفوں کے ہاں پناہ مل جائے ویسے بھی آپ کی عمر کے مطابق....."

انہوں نے پھر بات کاٹ کر پوچھا۔ "کیا میں بوڑھا ہوں؟"

"نہیں' یہ بات نہیں ہے۔ ٹھیک ہے اگر آپ کنواری لڑکی کا رشتہ چاہتے ہیں تو میں ابھی معلوم کرتا ہوں۔"

اس نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کی عمر کیا ہے؟"

ارمان صاحب ہچکچائے۔ فوراً ہی فیصلہ کیا کہ صحیح عمر بتائیں گے تو دال نہیں گلے گی۔ ایک کم سن بیوی حاصل کرنے کے لیے ذرا سا جھوٹ بول دیا جائے تو کام بن جائے گا۔ اس کے بعد آئندہ جھوٹ بولنے سے توبہ کر لیں گے۔

وہ اٹک اٹک کر بولے۔ "میری عمر...... میری عمر یہی کوئی تیس بتیس برس ہے۔"

ان کی عمر پر تبصرہ نہ ہو سکا کیونکہ فون پر غالباً دوسری طرف سے آواز آنے لگی۔ جواباً کہا گیا۔ "جناب! میں شادی دفتر سے مرزا بول رہا ہوں۔ ایک صاحب شادی کے خواہش مند ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں ابھی انہیں لے کر آپ کے ہاں آجاؤں۔"

مرزا صاحب تھوڑی دیر خاموش رہ کر دوسری طرف کی باتیں سننے لگے۔ ارمان صاحب اپنی کرسی پر بے چینی سے پہلو بدل رہے تھے۔ پھر مرزا صاحب نے کہا۔ "جناب! بالکل لڑکے تو گویا نہیں ہیں۔ عمر کچھ زیادہ ہے' مگر دولت مند ہیں نہایت شریف انسان ہیں۔"

مختصر سا جواب موصول ہوا۔ مرزا صاحب نے ریسیور رکھ کر کہا۔ "چلیے......"

ارمان صاحب اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ انہیں یوں لگا جیسے رشتہ منظور ہو چکا ہے۔ دل بے اختیار دھڑک دھڑک کر کہہ رہا تھا کہ اڑتے ہوئے سسرال پہنچ جائیں مگر ان دنوں ان کے پاس کار نہیں تھی۔ بیگم کا دھکے لگانے والا تحفہ وہ فروخت کر چکے تھے' اسکوٹر پہلے ہی بک چکا تھا۔ کافی دیر کے بعد ایک ٹیکسی ملی۔ اسے میٹر سے پانچ روپے زیادہ دے کر وہ مرزا صاحب کے ساتھ ہونے والی سسرال پہنچ گئے۔

وہ تین کمروں کا ایک مکان تھا۔ انہیں چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ مکان یونہی سا تھا مگر وہاں کے مکیں خوش پوش نظر آئے۔ شاید اس لیے کہ لڑکا آنے والا تھا۔ ایک بزرگ ارمان صاحب کو دیکھ کر قدرے مایوس ہوئے مگر اخلاقاً مسکرا کر ایسے سوالات کرنے لگے جیسے انٹرویو لے رہے ہوں

ارمان صاحب کی حالت عجیب سی تھی وہ ایسے گھبرائے ہوئے تھے جیسے پہلی بار بر دکھوے کے لیے آئے ہوں۔ جب انٹرویو ختم ہو گیا تو بزرگ نے فرمایا۔ "اب ہم اپنے متعلق بتا دیں کہ ہماری آمدنی معمولی ہے۔۔ اس لیے صاحب زادی کے ساتھ جہیز نہیں دے سکیں گے۔"

کوئی بات نہیں' میں جہیز کو لعنت سمجھتا ہوں۔"

"ہماری صاحب زادی کی عمر اکیس برس ہے۔ پردے کے سخت خلاف ہے۔ کیا آپ اسے برقع پہنائیں گے؟"

وہ تذبذب میں پڑ گئے کیونکہ وہ بے پردگی پسند نہیں کرتے تھے اور ہونے والی دلہن' اس کے باپ کو ناراض بھی نہ کر سکتے تھے اس لیے کہنا پڑا۔ "جی نہیں' برقع کوئی ضروری نہیں ہے۔ یہ تو پرانی باتیں ہیں۔ بس آنکھ کا پردہ ہونا چاہیے۔"

بزرگ نے فرمایا۔ "ہماری پہلی شرط یہ ہے کہ آپ نکاح سے پہلے اپنا مکان ہماری صاحب زادی کے نام لکھ دیں۔"

"آپ ایسی شرط پیش نہ کریں۔ آپ کی صاحب زادی تو میری آدھی دولت اور جائداد کی مالکہ ہوں گی۔"

"نہیں صاحب! صاف گوئی معاف کریں۔ آپ کے جوان بچے آپ کے بعد میری صاحب زادی کے لیے مصیبت بن جائیں گے۔"

اتنے میں ایک جوان لڑکی ٹرے میں شربت کے گلاس لے کر آئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے سلام کیا پھر ایک ایک گلاس پیش کرنے کے بعد صوفے پر بیٹھ گئی۔ بزرگ نے تعارف کرایا۔ "یہی میری صاحب زادی ہیں۔ ہم پردے کے قائل نہیں ہیں۔"

وہ شرما نہیں رہی تھی۔ لیکن ارمان صاحب شرما شرما کر دیکھ رہے تھے۔ لڑکی ان کی توقع کے مطابق حسین اور جوان تھی۔ خرابی صرف یہ تھی کہ اس کے سر پر آنچل نہیں تھا۔ ماڈرن زمانے کی لڑکی دلہن بننے سے پہلے بے باکی سے سامنے آگئی تھی۔

بزرگ نے فرمایا۔ "ہاں تو میں شرائط بیان کر رہا تھا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ آپ دو ہزار روپے ماہانہ اخراجات کے لیے دیں گے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ آپ ہماری صاحب زادی کو سہیلیوں سے ملنے، فلمیں دیکھنے سے اور دیگر تفریحات سے منع نہیں کریں گے۔ آپ ابھی ہاں یا ناں میں جواب دیں۔ کل تحریری معاہدہ' ہو جائے گا۔"

ارمان صاحب ایک حسین لڑکی کے سامنے "ناں" نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے لڑکی کی جانب دیکھا تو اس نے شرما کر گردن جھکا لی۔ یہ ادا انہیں بہت پسند آئی۔ اس عمر میں ایسی کم سن ادائیں نصیب والوں کو ہی ملتی ہیں۔ انہوں نے کہا۔ "آپ مجھے ذرا سوچنے کا موقع دیں۔ میں کل حاضر ہو کر اپنا فیصلہ سنا دوں گا۔"

لڑکی والے راضی ہوگئے۔ واپسی میں مرزا صاحب نے سمجھایا۔ "جناب! آپ جوان بچوں والے ہیں۔ لڑکی والے اپنی لڑکی کے مستقبل کی ضمانت حاصل کرنے کے لیے اسی طرح شرائط پیش کریں گے۔"

ارمان صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ سوچتے رہے۔ گھر آکر بھی سوچ میں ڈوبے رہے۔ اگر وہ لڑکی سامنے نہ آتی تو شاید وہ اتنا نہ سوچتے لیکن وہ تو دل و دماغ پر چھا گئی تھی۔ ان کے اندر سے آواز آئی تھی کہ اس عمر میں ایسی کم عمر دلہن اور کہیں نہیں ملے گی۔ شرائط مان لی جائیں۔

عذرا بیگم نے عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد کہا۔ "خدا جانے دوسری شادی کے خبط میں کیوں مبتلا ہوگئے ہیں۔ آج آپ نے نماز بھی نہیں پڑھی۔"

وہ اٹھ کر وضو کرنے لگے۔ عذرا بیگم نے کہا۔ "میں تو ہر نماز کے بعد یہی دعا مانگتی

ہوں کہ کوئی آپ کو اپنی بیٹی یا بہن کا رشتہ نہ دے۔ اپنی بیٹی جوان ہوگئی ہے اور آپ چھوکریاں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ توبہ۔ توبہ......."

"بکواس مت کرو۔" انہوں نے ڈانٹ کر کہا اور نماز کے لیے کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے نماز کی نیت کرنے کے بعد اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ لیے۔ بے شک اللہ سب سے بڑا ہے لیکن شیطان انسانی جذبوں کو اس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے کہ عبادت میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ ارمان صاحب طوطے کی طرح آیتیں پڑھ رہے تھے لیکن ان کی سوچ اس دوشیزہ کی طرف پرواز کر رہی تھی، جس کے سر سے آنچل ڈھلکا ہوا تھا اور وہ اک ادائے ناز سے مسکراتے ہوئے شربت کا گلاس پیش کر رہی تھی۔

وہ شربت سے زیادہ میٹھی لگ رہی تھی۔ لیکن مکان کے کاغذات عذرا بیگم کے پاس تھے۔ اگر ان سے مانگے جاتے تو گھر میں ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ وہ نئی آنے والی کو اپنی بیوی کے تمام حقوق دے سکتے تھے لیکن ان کی جائداد چھین کر اس سوکن کو نہیں دے سکتے تھے۔ اور نیا مکان بنوانے کے لیے رقم بھی نہیں تھی۔

یہ سب سوچتے سوچتے نماز ہوگئی۔ اکثر لوگ ایسی ہی نیت باندھ کر اپنی محبوباؤں کے حضور پہنچ جاتے ہیں۔ دوسرے دن انہوں نے مرزا صاحب سے کہا۔ "لڑکی والوں کی شرائط بڑی سخت ہیں۔ میں ماہانہ ہزار روپے دے سکتا ہوں مگر فی الحال اس کے لیے نیا مکان نہیں بنوا سکتا اور نہ ہی پہلی بیوی کا حق چھین کر اسے دے سکتا ہوں۔"

مرزا صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔ "جناب! دوسری شادی کا مطلب ہی پہلی بیوی کے حقوق چھیننا ہیں پھر لڑکی والے یہ نہیں سوچتے کہ کیا چھین رہے ہیں۔ وہ تو صرف اپنی لڑکی کے بہتر سے بہتر مستقبل کے لیے سوچتے اور شرائط لگاتے ہیں۔"

"پھر میری مشکل کیسے آسان ہوگی؟"

"ہاں صاحب آپ کی عمر میں جوانی آئے تو بڑی مشکلات ہو جاتی ہیں۔ آپ اخبار کے اشتہار کے اخراجات برداشت کریں تو شاید آپ کی مشکل آسان ہو جائے۔"

ارمان صاحب کو تو وہ شربت والی دوشیزہ اچھی لگ رہی تھی مگر مجبوراً اشتہار شائع کرانے کے لیے راضی ہوگئے۔ اس طرح ہو سکتا تھا کہ شربت والی سے بہتر مٹھاس مل جاتی۔

ایک ہفتے بعد اشتہار شائع ہوا۔ اشتہار کچھ یوں تھا۔ "پینتیس برس کے ایک خوبرو جوان کو ایک دوشیزہ کا رشتہ درکار ہے۔ رشتے کا طالب صوم وصلوٰۃ کا پابند ہے۔ ماہانہ آمدنی دو ہزار روپے ہے۔ صوم وصلوٰۃ کی پابند مشرقی دوشیزہ کو ترجیح دی جائے گی۔"

ایسی دوشیزہ کو ترجیح دینے کی بات اس لیے کہی گئی کہ نماز روزے کی پابند رہنے والیاں فضول خرچ نہیں ہوتیں۔ فلمیں نہیں دیکھتیں۔ میک اپ نہیں کرتیں۔ اور ان کے والدین بڑی بڑی شرائط پیش نہیں کرتے۔

وہ اشتہار ہفتے میں دوبار شائع ہوا لیکن دو ماہ گزرنے کے بعد صرف ایک رشتہ آیا۔ لڑکی والوں کے ہاں جاکر پتہ چلا کہ لڑکی خالص مشرقی اور عبادت گزار ہے مگر کالی ہے۔ کچھ یونہی سا ناک نقشہ ہے اور اکثر بیمار رہتی ہے۔

بڑی عجیب بات ہے کہ اس ملک میں نماز روزے کی پابند لڑکیاں نہیں ہیں۔ اگر ہوتیں تو اشتہار کے جواب میں رشتے ضرور آتے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کالی پیلی لڑکیاں دلہن بننے کے لیے عبادت کرتی اور دعائیں مانگتی ہوں۔ حسین لڑکیاں تو دعاؤں اور اشتہاروں کے بغیر ہی ایک گھر کی جنت کے لیے آدم زاد کو پیچھے لگا لیتی ہیں۔

مرزا صاحب نے مشورہ دیا۔ "جناب! آپ اشتہار کا مضمون بدل دیں۔ آج کل کی لڑکیاں آزاد خیال ہیں۔ فلمیں تو ضرور دیکھتی ہیں۔ انہیں نماز روزے کی فرصت نہیں ملتی۔ آپ اتنی کڑی شرط نہ لگائیں۔"

وہ مرزا صاحب کے مشورے پر دو دنوں تک غور کرتے رہے۔ چونکہ دوسری بیوی کی شدید ضرورت تھی اور یہ بات سمجھ میں آگئی تھی کہ آج کل کی لڑکیاں ان کے مزاج کے مطابق ڈھلنا پسند نہیں کریں گی' خود انہیں کسی ماڈرن لڑکی کے مزاج کے مطابق ڈھلنا ہوگا۔ اس لیے انہوں نے دوسرا اشتہار دیا۔

"ایک دولت مند جوان کے لیے ایک خوب صورت تعلیم یافتہ دوشیزہ کا رشتہ درکار ہے۔ رشتے کا طالب آزاد خیال ہے۔ پوسٹ بکس نمبر فلاں کے ذریعے رابطہ قائم کریں۔"

یہ اشتہار شائع ہوا تو بے شمار خطوط آنے لگے۔ ارمان صاحب بہت زیادہ مصروف ہوگئے۔ کبھی اس پتہ پر کبھی اس پتہ پر رشتہ کی بات کرنے کے لیے جاتے تھے لیکن ان کی

عمر کے پیش نظر ایسی شرائط پیش کی جاتی تھیں جنہیں وہ قبول نہیں کر سکتے تھے۔ بے چارے نے دوسری شادی کے لیے اتنی دوڑ لگائی تھی کہ اب تھک رہے تھے۔ یہ سوچ کر بے حد صدمہ ہوتا تھا کہ دوبارہ ملنے والی جوانی رائگاں جا رہی ہے۔

ان کے ہم عمر لوگوں میں سے ایک نے کہا۔ "ارمان! جب تم ہماری طرح سوکھے درخت نظر آتے تھے اور چھڑی کا سہارا لے کر چلتے تھے۔ اس وقت ہمارے درمیان بڑی دوستی تھی۔ ہمارے ساتھ گھنٹوں بیٹھ کر دین اسلام کی باتیں کیا کرتے تھے۔ اب اللہ تعالیٰ نے اچھی صحت دی ہے تو ہم بوڑھوں سے کترا کر جوانوں سے دوستی کر رہے ہو۔ جوان چھوکریاں تلاش کر رہے ہو۔ لاحول ولا قوۃ"

ارمان صاحب نے کہا۔ "جب تم سب جوان تھے۔ اس وقت جوانی بہت بڑی نعمت تھی۔ انسان کی عادت ہے کہ بوڑھا اور کمزور ہونے کے بعد جھنجلا کر جوانوں پر لاحول پڑھتا ہے۔ تم سب بھول گئے کہ جوانی کی آندھی زور دکھاتی ہے تو جوان مرد کس طرح بہکنے لگتے ہیں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں دوسری شادی نہ کروں گناہ کی دلدل کی طرف دھنسنے کے لیے چلا جاؤں۔"

ایک بوڑھے نے کہا۔ "نفس پر قابو پاؤ۔"

"یہ نصیحت بڑھاپے میں پر اثر اور جوانی میں بے اثر ہوتی ہے اور چونکہ بے اثر ہوتی ہے اس لیے چار شادیاں تک کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ وہ بھی محض اس لیے کہ ہم گناہ سے باز رہ سکیں۔"

وہ اپنے بوڑھے دوستوں سے بحث کرنے میں مصروف تھے۔ اتنے میں مرزا صاحب پہنچ گئے۔ انہوں نے ارمان صاحب کو ایک طرف بلا کر کہا۔ "ایک بڑے گھرانے کی لڑکی کا رشتہ ہے۔ وہ لوگ آپ سے کوئی مطالبہ نہیں کریں گے اور اپنی لڑکی کے نام مکان وغیرہ لکھوانے کی شرط بھی پیش نہیں کریں گے۔ آپ فوراً اس پتے پر پہنچ کر ان سے ملاقات کریں۔"

مرزا صاحب نے ایک کارڈ ان کے حوالے کردیا۔ وہ اسی وقت اپنے بوڑھے دوستوں کو خدا حافظ کہہ کر وہاں سے روانہ ہوگئے۔ کارڈ کے مطابق وہ جس کوٹھی میں پہنچے اس کی ظاہری حالت بتا رہی تھی کہ وہاں کے مکیں بہت دولت مند اور ماڈرن قسم کے

لوگ ہیں۔ کوٹھی کے اندر پہنچ کر اس بات کی تصدیق ہو گئی۔ وہاں سب انگریزی بول رہے تھے اور ارمان صاحب کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے کوئی عجیب چیز دیکھ رہے ہوں۔

ایک جوان لڑکی پتلون اور شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ وہی ان کی ہونے والی دلہن تھی۔ ارمان صاحب پریشان ہو گئے۔ اگر چہ وہ دوشیزہ بے حد حسین اور اسمارٹ تھی۔ تاہم اس سے شادی کرنا ہاتھی پالنے کے مترادف تھا۔ بعد میں وہ بہت مہنگی پڑتی۔ اس کے ڈیڈی نے فرمایا۔ "آپ کی عمر زیادہ ہے مگر کوئی بات نہیں۔ ہم صرف ایسے شخص کو پسند کرتے ہیں جو اپنی پسند کو زبردستی اپنی بیوی کی پسند نہ بناتا ہو۔ مثلاً یہ کہ اگر آپ نمازی ہیں تو بے شک نمازی رہیں مگر ہماری بے بی کو جبراً نمازی بنانے کی کوشش نہ کریں۔ اسی طرح وہ آپ کو مجبور نہیں کرے گی کہ اس کے ساتھ کلبوں میں جا کر ڈانس کریں۔ ٹھیک ہے؟"

لڑکی نے ارمان صاحب کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے اپنے باپ سے کہا۔ "ڈیڈی! یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ میں ان سے خود معاملات طے کروں گی۔ یو پلیز گو اینڈ مائنڈ یور بزنس......"

اس کا باپ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ "ہاں تو ابھی آپ نے اپنا نام ارمان بتایا تھا۔ اچھا نام ہے میرا نام روبی ہے۔ میں کیسی لگتی ہوں۔"

"آپ بہت اچھی ہیں۔ آپ کو تو اونچی سوسائٹی کے اچھے اچھے نوجوان مل جائیں گے۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "وہ تو ملتے ہی ہیں۔ میرے بہت سے بوائے فرینڈز ہیں۔ مگر اس پاکستانی سوسائٹی میں ایک شوہر ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ورنہ میں کبھی شادی کا تصور نہیں کرتی۔"

ارمان صاحب نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ "معاف کیجیے گا۔ میں آپ کو شریک حیات نہیں بنا سکتا۔"

"تو میں کب چاہتی ہوں کہ آپ شوہر بنیں۔ وہ تو صرف دنیا والوں کو دکھانے کے لیے ہم ایک نکاح نامہ تیار کر لیں گے۔ پھر جیسے میرے دوست ہیں۔ ویسے ہی آپ دوست بن کر رہیں گے؟؟"

"مگر کیوں؟ آپ ایسا کیوں کرنا چاہتی ہیں۔ یہ تو گناہ ہے۔"

"آپ کس زمانے کی باتیں کر رہے ہیں۔ مولانا؟ تہذیب یافتہ ممالک میں جا کر دیکھیں۔ عورت اب کسی ایک کی جاگیر بن کر ایک ہی گھر کے مقبرے میں ساری زندگی نہیں گزارتی ہے۔ جوانی ایک بہتی ہوئی ندی ہے اسے ہر پیاسے کے پاس سے گزرنا چاہیے۔"

ارمان صاحب فوراً ہی پلٹے اور تیزی سے بھاگتے ہوئے کوٹھی کے باہر آ گئے۔ انہیں اپنے پیچھے روبی کی آواز سنائی دی۔ "نان سینس۔ پتہ نہیں یہاں کے لوگ نکاح کے بہانے عورت کو خرید لینا کیوں چاہتے ہیں۔ ایڈیٹ......"

ارمان صاحب کا دل ٹوٹ گیا۔ امیدوں نے دم توڑ دیا کہ ان کے نصیب میں دوسری بیوی نہیں ہے۔ لوگ تو چٹ منگنی پٹ بیاہ کر لیتے ہیں۔ ساٹھ برس کے بوڑھے بھی ذرا سی کوشش کے بعد جوان لڑکیوں سے شادی کر لیتے ہیں لیکن وہ کیسے کامیاب ہو جاتے ہیں؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی

بات یہی سمجھ میں آئی کہ شادی کے بوڑھے خواہش مند' لڑکی والوں سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں اور جائز و ناجائز شرائط تسلیم کر لیتے ہیں۔ دوسروں کو اندرونی حالات کا علم نہیں ہوتا کہ یہ بوڑھے کس طرح جوان چھوکری کے لالچ میں اپنی پہلی بیوی بچوں کے حقوق اور اپنی دولت و جائداد سب کچھ گنوا بیٹھتے ہیں یا پھر کسی غریب لڑکی کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر اسے سستے داموں خرید لیتے ہیں۔

یہ ارمان صاحب کی بد قسمتی تھی کہ کوئی غریب لڑکی بھی نہ ملی۔ اور ملی بھی تو پسند نہیں آئی۔ وہ گھر پہنچ کر پیچ و تاب کھانے لگے۔ اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ دلشاد بیگم جیسی عورت اور روبی جیسی ماڈرن لڑکی کی طرح فراڈ نہیں کر سکتے تھے۔ ہوس کے تقاضے پورے کرنے کے لیے گناہ نہیں کر سکتے تھے۔ شرافت سے مطالبہ کرتے تو لڑکیوں والے شرائط پیش کرتے تھے۔ ان کی بوڑھی جوانی کا اونٹ کسی کروٹ نہیں بیٹھ رہا تھا۔

رات کے نو بجے وہ نماز سے فارغ ہوئے تو دروازے پر دستک سنائی دی۔ وہ جا نماز سے اٹھ کر بیٹھک میں آئے۔ ان کا بڑا بیٹا کامران ایک برقع پوش خاتون کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا "ابا جان! یہ لڑکی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔"

"آؤ بیٹھو۔" ارمان صاحب نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے بیٹھتے ہوئے اپنا نقاب الٹ دیا۔ وہ سانولی سلونی سی اچھے ناک نقشے والی لڑکی تھی۔ اس کے چہرے سے غربت اور آنکھوں سے ذہانت عیاں تھی۔ وہ آہستگی سے بولی۔

"مجھے مرزا صاحب نے آپ کا پتہ بتایا ہے۔"

"اوہ اچھا۔" ارمان صاحب کے ارمان مچل گئے۔ انہوں نے بیٹے سے کہا۔ "کامران! جاؤ اپنا کام کرو۔"

کامران انہیں ناگواری سے دیکھتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ مگر باہر دروازے کی آڑ میں چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت اس کی والدہ عذرا بیگم بھی وہاں آکر کھڑی ہو گئیں۔ انہیں اس لڑکی سے نفرت محسوس ہو رہی تھی جو اس گھر کی دوسری مالکہ بننے آئی تھی۔ وہ ارمان صاحب سے نفرت نہیں کر سکتی تھیں۔ کیونکہ وہ شوہر تھے' باپ تھے اور ان کے ان داتا تھے۔

ارمان صاحب نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے پوچھا۔ "تمہارا نام؟"

وہ مترنم آواز میں بولی۔ "کنیز"

"تمہارے بزرگوں کو مجھ سے ملنا چاہیے تھا۔"

"میرا کوئی نہیں ہے۔ مرزا صاحب نے بتایا ہے کہ آپ دین دار اور خدا ترس انسان ہیں۔ مجھ جیسی مجبور اور بے سہارا لڑکی کو پناہ دے سکتے ہیں۔"

ایک طویل مدت کے بعد ایسی لڑکی ملی تھی جو مجبور اور بے سہارا تھی اور کسی طرح کا مطالبہ نہیں کر سکتی تھی۔ صرف کھانے اور کپڑے پر منکوحہ بن سکتی تھی۔ انہوں نے پوچھا۔

"کیا تمہارے والدین فوت ہو چکے ہیں؟"

"جی نہیں وہ حیات ہیں۔ اب سے پانچ برس پہلے جب میں تیرہ برس کی تھی تو میرے ابو نے میری امی کو طلاق دے کر دوسری شادی کرلی۔ میں اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی۔ اپنی امی کے ساتھ اورنگی کے علاقے میں رہنے لگی۔ وہاں ہمیں فاقوں اور دکھ بیماریوں نے گھیر لیا۔ امی نے ایک کوٹھی میں ملازمت کرلی۔ وہ صبح جاتی تھیں اور شام کو واپس آتی تھیں۔ دو برس تک ہم نے بڑی تنگی ترشی سے گزارا کیا۔ میں پندرہ برس کی ہوئی تو امی کو میری فکر لاحق ہو گئی کیونکہ میں اپنی عمر سے زیادہ جوان نظر آتی تھی اور وہ

مجھے صبح سے شام تک تنہا جھگی میں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھیں۔ لہٰذا میرے رشتے کے لیے بھاگ دوڑ میں مصروف ہو گئیں۔

اتنا کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئی پھر کہنے لگی۔ "دو ماہ تک میرے لیے لڑکا تلاش کرنے کی غرض سے وہ کوٹھی سے کبھی کبھی غیر حاضر ہو جاتی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوٹھی والوں نے انہیں ملازمت سے جواب دے دیا۔ ملازمت کے جاتے ہی پریشانیاں اور بڑھ گئیں۔ ہم کئی کئی وقت کے فاقے کرنے لگے۔ مجھ سے امی کی پریشانیاں دیکھی نہیں جاتی تھیں۔ جی چاہتا تھا کہ مرجاؤں تاکہ امی کا بوجھ ہلکا ہو تو وہ آسانی سے تنہا زندہ رہ سکیں۔

آخر مسائل بڑھتے گئے تو امی نے ایک بوڑھے سے شادی کرلی۔ میرا سوتیلا باپ ایک مل میں سپروائزر ہے۔ اچھا کماتا ہے۔ ہم اچھا کھانے اور پہننے لگے۔ امی کے دکھ دور ہو گئے۔ وہ خوش رہنے لگیں۔ انہوں نے اپنے شوہر سے کہا کہ میری شادی کے لیے وہ بھی ملازمت کریں گی۔ زیادہ رقم ہوگی تو لڑکا آسانی سے مل جائے گا۔

میرا سوتیلا باپ جس مل میں کام کرتا تھا۔ وہاں عورتیں پیکنگ کا کام کرتی تھیں۔ اس لیے میری ماں کو آسانی سے ملازمت مل گئی۔ میرے باپ نے ایسی شفٹ ڈیوٹی مقرر کی تھی کہ امی کام پر جاتیں تو وہ گھر پر رہتا اور وہ کام پر جاتا تو امی گھر پر رہتی تھیں تاکہ میں تنہا نہ رہوں"

ہم سب اپنے گھر میں رہ کر باہر کے چوروں سے ڈرتے ہیں۔ یہ شاید ہی کبھی سوچتے ہیں کہ چور اپنے گھر میں بھی ہوتے ہیں۔ ایک بار امی شام کی شفٹ میں کام کرنے گئیں تو میرے سوتیلے باپ نے تنہائی میں میرا ہاتھ پکڑ لیا اور میری تعریفیں کرنے لگا۔

میں نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔ "آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ میں رشتے میں آپ کی بیٹی ہوں۔"

"تم اپنی ماں کی بیٹی ہو۔ میرا تم سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ میں تمہیں دیکھ دیکھ کر ترستا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑنا چاہا۔ میں دور چلی گئی۔ "خبردار! مجھے ہاتھ نہ لگانا' نہیں تو امی سے کہہ دوں گی۔"

"تمہاری ماں میرا کیا بگاڑ لے گی۔ میں اسے طلاق دے دوں گا۔ اپنی مل سے نکلوا دوں گا پھر وہی محتاجی اور فاقے ہوں گے۔"

میں غربت اور فاقوں سے گزر کر آئی تھی ان دکھوں سے واقف تھی۔ میں نے پریشان ہو کر کہا۔ "میری امی یہاں بہت خوش ہیں۔ آپ انسان بن کر سوچیں کہ آپ کی حرکتوں سے انہیں کتنی تکلیف پہنچے گی۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر چارپائی پر بیٹھ گیا پھر سنجیدگی سے بولا۔ "میں انسان بن کر ہی سوچتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ یہ گناہ ہے مگر کیا کروں۔ تمہیں دیکھتا ہوں تو بہکنے لگتا ہوں۔ میں نے بارہا تمہیں چور نظروں سے دیکھا ہے۔ جب تم چلتی پھرتی ہو اور یہاں چارپائی پر سوتی ہو تو تمہارا جسم مجھے پاگل بنا دیتا ہے۔ میں نے بہت برداشت کیا مگر آج مجبور ہو گیا ہوں۔"

میں اعتراف کرتی ہوں کہ میرا سوتیلا باپ ایک شریف آدمی ہے۔ مگر یہ عورت ہے جس کا وجود تنہائی میں بہکاتا ہے۔ حضرت آدمؑ کی پچھلی تمام عبادات اور شرافت کو مٹی میں ملا کر جنت سے نکال دیتا ہے۔ میں اپنی امی کے گھر کی جنت میں آگ نہیں لگا سکتی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ "آپ کے اندر انسانیت اور شرافت موجود ہے۔ میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ ابھی آپ یہاں سے چلے جائیں اور اپنی قوت ارادی سے نفس پر قابو پانے کی کوشش کریں۔ میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔"

وہ بے چارہ مایوسی سے سر جھکا کر چلا گیا مگر شیطان کبھی نہیں جاتا۔ میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ وہ مجھے اٹھتے بیٹھتے اور سوتے جاگتے دیکھتا رہے گا اور بہکتا رہے گا۔ اس طرح کسی دن میری امی کی ازدواجی زندگی تباہ ہو جائے گی۔

میری امی کا ہنستا بولتا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگا۔ انہوں نے میری خاطر ناقابل برداشت مصائب کا سامنا کیا تھا۔ زندگی کی کڑی دھوپ میں چلتے چلتے اور جلتے جلتے انہیں ایک شوہر کا سایہ ملا تھا۔ میں اپنی جان سے پیاری امی کی آنکھوں کو دوبارہ روتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس لیے چپ چاپ ان کی زندگی سے نکل جانے کا فیصلہ کرتی رہی۔

وہ رات کے ایک بجے ڈیوٹی سے واپس آئیں میں نے ظاہر نہ ہونے دیا کہ میرے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ میں نے سالن گرم کر کے انہیں کھانے کے لیے دیا۔ جب وہ

کھانے کے بعد سو گئیں تو میں صبح تک جاگتی رہی۔ صبح میرا سوتیلا باپ ڈیوٹی پر چلا گیا۔ امی تھکی ہاری سوتی رہیں۔ میں نے ایک چھوٹا سا رقعہ لکھا۔

"میری اچھی امی! میں نے اپنا جیون ساتھی ڈھونڈ لیا ہے اور اس کے ساتھ جا رہی ہوں۔ میرے فیصلے سے یقیناً آپ کو دکھ پہنچے گا لیکن میں نہیں چاہتی کہ میری شادی کے لیے آپ لوگ دن رات محنت کریں۔ شادی کے بعد میں ضرور آؤں گی۔ آپ مجھے تلاش نہ کریں۔ فقط آپ کی نافرمان بیٹی کنیز......"

میں نے وہ رقعہ امی کے سرہانے رکھا۔ پھر چادر لپیٹ کر اپنے ابا جان کے گھر کورنگی چلی گئی۔ ابا جان ڈیوٹی پر گئے ہوئے تھے۔ میری سوتیلی ماں نے پہلی نظر میں مجھے نہیں پہچانا پھر حیرانی سے بولی۔ "ارے کنیز! یہ تو ہے......دو برس میں ایسی جوان ہو گئی ہے کہ پہچانی نہیں جاتی۔"

"میں تجھے کہیں نہ جانے دوں گی۔ تو میری بیٹی ہے۔...... اب یہیں رہے گی......!"

"مگر امی مجھے یہاں ڈھونڈنے آئیں گی!"

"آنے دے، میں تجھے چھپا دوں گی۔ کہہ دوں گی کہ تو یہاں نہیں آئی۔"

میری سوتیلی ماں نے جو کہا، وہی کیا۔ میری امی مجھے ڈھونڈنے کے لیے آئیں تو مجھے باتھ روم میں چھپا دیا۔ میرا دل دکھ رہا تھا کہ وہ میرے لیے پریشان ہو رہی ہیں اور میں انہیں دھوکا دے رہی ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ اگر میں اسی طرح ان کی ہنستی کھیلتی ازدواجی زندگی کو سلامت رکھ سکتی ہوں تو مجھے اس دھوکے بازی پر قائم رہنا چاہیے۔

امی آنسو پونچھتی ہوئی واپس چلی گئیں۔ شام کو ابا جان نے مجھے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔ دوسرے دن میری سوتیلی ماں کا بھائی حشمت آیا۔ مجھے اس کے حلیے سے پتہ چل گیا کہ وہ بدمعاش ہے۔ وہ بار بار مونچھوں پر تاؤ دے کر مجھے دیکھتا اور مسکراتا تھا۔ جب اس نے مجھ سے بے تکلفی سے باتیں کرنے کی کوشش کی تو میں کترانے لگی۔ میری سوتیلی ماں نے کہا۔ "ارے شرماتی کیوں ہے، میرا بھائی لاکھوں میں ایک ہے۔ سارا محلہ اس سے ڈرتا ہے!"

مجھے بھی اس سے ڈر لگ رہا تھا۔ میں وہاں سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ پھر یہ روز کا معمول ہوگیا۔ وہ آتا تھا اور مجھے للچائی نظروں سے دیکھتا تھا۔ میں اس سے کترا کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی تھی۔ ایک شام میں سخت بخار میں مبتلا ہوگئی۔ میری سوتیلی ماں نے دو گولیاں کھانے کے لیے دیں۔ میں انہیں کھا کر بستر پر لیٹ گئی اور فوراً ہی گہری نیند سو گئی۔

آنکھ اس وقت کھلی جب مجھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے نیند سے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ حشمت میرے بستر کے قریب تھا...... میں نے چیخ کر ابا جان کو پکارا۔ اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے اپنے طور پر جدوجہد کی لیکن کچھ بخار نے بے بس کر دیا تھا' کچھ نیند کی گولیوں کا خمار تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے؟ اور یہ کیسی قیامت ٹوٹ پڑی ہے؟

جب قیامت گزر گئی تو ایک دم سناٹا چھا گیا وہ جا چکا تھا اور میں تنہا پڑی رو رہی تھی۔ میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ امی کی خوشی کے لیے گھر چھوڑوں گی تو ابا جان کے گھر میں یہ کبھی نہ مٹنے والا داغ لگ جائے گا۔

میں غصے میں بھری ابا جان کے کمرے میں گئی' وہ موجود نہیں تھے۔ یہ سب میری سوتیلی ماں کی سازش تھی۔ وہ ابا جان کو نائٹ شو میں لے گئی تھیں اور اپنے بھائی کے لیے راستہ صاف کر دیا تھا۔ میرے دماغ نے مجھے سمجھایا کہ جو کچھ ہو چکا ہے' اس کا حال ابا جان کو معلوم ہوگا تو وہ شرم سے مر جائیں گے۔ نہ مریں تب بھی میں ان سے آنکھ نہ ملا سکوں گی۔

مجھے خود اپنی شرم رکھنی پڑی۔ میں نے ابا جان سے کچھ نہیں کہا لیکن جب وہ دوسرے دن ڈیوٹی پر چلے گئے تو میں نے سوتیلی ماں سے جھگڑا کیا۔ وہ بولی۔ "جو کچھ ہوا اس پر پردہ ہی پڑا رہنے دو۔ تم نے اچھا کیا کہ اپنے باپ سے کچھ نہ کہا۔ اگر تیرا باپ غیرت کے جوش میں حشمت کا گریبان پکڑ لیتا تو' تو نہیں جانتی ہے کہ میرا بھائی اب تک دو قتل کر چکا ہے۔"

یہ سن کر میں گھبرا گئی۔ اپنے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا۔ میں ابا جان کے سامنے زبان کھول کر انہیں قتل ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس روز شام کو پھر حشمت آیا۔ میں

نے اسے دیکھتے ہی اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ دروازے کے پیچھے سے میں اپنی سوتیلی ماں کی آواز سن رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "حشمت! وہ تم سے ڈر گئی ہے۔ ابھی تم جاؤ۔ میں اسے سمجھا بجھا کر راضی کر لوں گی۔"

وہ چلا گیا۔ میں نے یہ دستور بنا لیا کہ ابا جان گھر میں رہتے تو میں کمرے سے نکلتی ورنہ دروازہ بند کر کے بیٹھ جاتی۔ دو دن بعد اطلاع ملی کہ حشمت ڈکیتی کے جرم میں جیل چلا گیا ہے۔ میں نے اطمینان کی سانس لی مگر یہ اطمینان بھی چند روزہ ثابت ہوا۔ اچانک ہی انکشاف ہوا کہ میرے پیر بھاری ہو گئے ہیں' مجھے متلی ہوئی اور ابکائی آئی تو میری ماں مجھے دیکھ دیکھ کر مسکراتی اور پوچھتی۔ "بول کس دن اور کس وقت یہ خوش خبری تیرے باپ کو سناؤں؟"

میں کبھی غصہ دکھاتی' کبھی رونے لگتی۔ اس نے کہا۔ "حشمت جیل چلا گیا تو کیا ہوا؟ جلد ہی چھوٹ کر آجائے گا۔ اگر تو اب بھی ہاں کہہ دے تو جیل میں بھی نکاح پڑھایا جا سکتا ہے۔"

"میں تمہارے بھائی پر تھوکتی ہوں۔ میں مر جاؤں گی پر اس سے شادی نہیں کروں گی۔"

"تو پھر مر جا۔ یہ لمبی لمبی سانسیں کیوں لے رہی ہے۔ اچھی طرح سن لے' اگر آج شام تک راضی نہ ہوئی تو میں آج رات تیرے باپ سے تیرا سارا کچا چٹھا بیان کر دوں گی۔ میرا بھائی تو جیل میں ہے اس پر الزام نہیں آسکتا۔"

میں اس کی باتیں سن کر دیر تک روتی رہی۔ زندگی نے اتنی سی عمر میں یہ سکھا دیا تھا کہ رونے سے مسائل حل نہیں ہوتے مگر میں اتنی ذہین بھی نہیں ہوں کہ اپنے باپ کی عزت بحال رکھنے کی کوئی تدبیر سوچ لیتی۔ میرے دماغ میں یہ بات آ رہی تھی کہ مجھے مر جانا چاہیے' ورنہ ابا جان کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔

صبح سے میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ دوپہر کو بھی سوتیلی ماں نے کھانے کے لیے نہیں پوچھا۔ شام کو میں نے محلے کے ایک چھوٹے سے بچے کو آٹھ آنے دے کر پکوڑے منگوائے۔ وہ بچہ اخبار کے ٹکڑے میں پکوڑے لے کر آیا تو میری نظر ایک اشتہار پر پڑی۔ اس اشتہار کو دیکھ کر مرزا صاحب یاد آگئے۔ اب سے ایک برس پہلے میری امی

رشتے کے لیے مجھے ان کے پاس لے گئی تھیں۔ انہوں نے محبت اور ہمدردی سے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ "میں اپنی بیٹی کے لیے کوئی اچھا سا رشتہ تلاش کروں گا۔ اگر کبھی کوئی پریشانی ہو تو میرے پاس چلی آنا........!"

میں اسی وقت چادر لپیٹ کر گھر سے نکل گئی۔ ان کے ہاں پہنچی اور انہیں اپنی دکھ بھری داستان سنائی۔ صرف یہ نہ بتا سکی کہ میں ماں بننے والی ہوں۔ انہوں نے مجھے آپ کا پتہ بتایا اور یقین دلایا کہ آپ مجھے اپنے ہاں ضرور پناہ دیں گے۔ مرزا صاحب میرے ساتھ آجاتے مگر ان کا بچہ سخت بیمار ہے۔ اس لیے میں اکیلی آئی ہوں۔ راستے میں سوچتی رہی تھی کہ ماں بننے والی بات چھپاؤں گی لیکن میں جھوٹ نہیں بول سکی' زبان سے سچ نکل ہی جاتا ہے۔"

کنیز اپنی داستان سنا کر خاموش ہوگئی اور فیصلہ سننے کے لیے ارمان صاحب کا منہ تکنے لگی۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھے خاموشی سے پہلو بدل رہے تھے۔ کنیز اچھی تھی' بچی تھی اور مصیبت زدہ بھی تھی۔ اسے سہارا دے کر وہ نیکی کما سکتے تھے۔ انہوں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں دارالامان میں جانا چاہیے تھا۔ وہاں تمہاری جیسی بے سہارا لڑکیوں کو پناہ مل جاتی ہے۔"

وہ چند لمحوں تک خاموش رہی پھر سر جھکا کر بولی۔ "وہاں پناہ مل جائے گی۔ مگر میرے بچے کو ایک باپ کا نام نہیں ملے گا۔"

"وہ تو کبھی نہیں ملے گا۔ شاید حشمت جیسا بدمعاش بھی باپ کہلانا پسند نہ کرے۔"

"میں اپنے بچے کے ساتھ اس بدمعاش کا نام خود پسند نہیں کروں گی۔ آپ ایک شریف انسان ہیں' آپ مجھے اور بچے کو بدنامی سے بچا سکتے ہیں۔"

"لاحول ولا قوۃ...... گناہ کوئی کرے اور نام میرا ہو۔ میں کوئی پاگل تو نہیں۔"

"میں گناہ گار نہیں ہوں' مجھے مجبور کیا گیا تھا۔ کسی کی مجبوری کو سمجھنا اور کسی کے عیبوں پر پردہ ڈالنا بڑی نیکی ہے۔"

"بے شک بڑی نیکی ہے۔ لیکن یہ سوچ کر ہی کراہیت سی محسوس ہوتی تھی کہ جسے وہ اپنی منکوحہ بنائیں گے۔ وہ کسی دوسرے کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ انہوں نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے میں یہ نیکی نہیں کر سکوں گا۔"

وہ تھکے ہوئے انداز میں اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ آپ سے مایوس ہونے کے بعد اب میرے لیے خودکشی کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔ آپ جیسے شریف لوگ بڑے بڑے دعوے تو کرتے ہیں مگر مجھ جیسی لڑکی کو عزت سے زندگی گزارنے کا موقع نہیں دیتے۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دروازے تک گئی۔ پھر وہاں سے پلٹ کر دیکھا کہ شاید ارمان صاحب پگھل جائیں اور اسے اپنی عزت بنانے کے لیے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیں۔ مگر وہ منہ پھیر کر بیٹھے رہے' وہ باہر چلی گئی۔

منہ پھیر کر نیکی کا رخ بھی پھیر دیا جاتا ہے انہوں نے خود کو تسلی دی کہ یہ نیکی نہیں' برائی ہوگی کیونکہ حاملہ عورت سے نکاح جائز نہیں ہوتا۔ اس کا بچہ حرامی ہی کہلائے گا۔ ایسے بچے کا باپ بننا کہاں کی دانش مندی ہے؟

وہ بیٹھک سے اٹھ کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اپنے کمرے میں آئے۔ انہیں یوں لگ رہا تھا۔ جیسے رشتہ تلاش کرتے کرتے ایک بار پھر بوڑھے ہو چلے ہوں اور اب ان سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ انہوں نے کمرے میں پہنچ کر عذرا کو آواز دی۔ ان کی بیٹی نے بتایا کہ امی بھائی جان کے ساتھ کہیں گئی ہیں۔ تھوڑی دیر میں آجائیں گی۔

عذرا بیگم پہلی بار ان سے اجازت حاصل کیے بغیر کہیں گئی تھیں۔ انہیں بے حد غصہ آیا۔ بچے تو پہلے ہی نافرمانی کا مظاہرہ کرتے چلے آرہے تھے' اب بیگم نے بھی نافرمانی شروع کر دی تھی۔ وہ تھوڑی دیر کا کہہ گئی تھیں مگر رات کے ایک بجے واپس آئیں۔ انہوں نے گرج کر پوچھا۔ "کہاں گئی تھیں؟"

وہ برقع اتارتے ہوئے بولیں۔ "شازیہ اور کامران کی شادی کی تاریخ مقرر کرنے گئی تھی۔ آپ اپنی شادی کے جنون میں یہ بھول بیٹھے ہیں کہ شازیہ پچیس برس کی ہوگئی ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ داماد آنے سے پہلے اپنی شادی کرلیں۔ ورنہ بیٹی کی شادی اگر پہلے ہوگئی تو اس کے سسرال والے آپ کی شادی پر مذاق اڑائیں گے۔"

بیگم درست کہہ رہی تھیں۔ ارمان صاحب پہلے اپنی شادی کرنے کے لیے بیٹی اور بیٹے کی شادیوں کی تاریخیں ٹالتے جا رہے تھے۔ بیگم نے کہا۔ "میں آپ کی خاطر خود کو تباہ کر سکتی ہوں لیکن بچوں کی خوشیاں نہیں چھین سکتی۔ کل شام کو کامران کا نکاح پڑھایا

جائے گا اور پرسوں شازیہ دلہن بنے گی!"

"بکواس مت کرو۔" وہ اتنی زور سے چیخے کہ کھانسی آنے لگی۔

بیگم نے کہا۔ "اب تک میری ہر جائز بات بکواس ہی سمجھی جاتی رہی لیکن اب میں اپنی ہونے والی بہو اور ہونے والے داماد کے ہاں تاریخ مقرر کر آئی ہوں۔ اگر آپ شادی میں شریک نہیں ہوں گے، تو بعد میں بیٹی کے سسرال والوں کے سامنے خود ہی جواب دہ ہوں گے۔"

"میں شریک نہیں ہوں گا۔ دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔ میں نافرمان بیوی اور نافرمان اولاد سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا......"

عذرا بیگم کمرے سے چلی گئیں۔ ارمان صاحب نے سمجھا تھا کہ شاید ان کا غصہ دیکھ کر بیوی اور بچے معافی مانگیں گے اور شادی کی تاریخ بدل دیں گے لیکن اب حالات بدل گئے تھے۔ رعایا کی طرح رہنے والے گھر کے تمام افراد باغی ہو گئے تھے۔ ارمان صاحب غصے میں چیختے اور بڑبڑاتے رہے۔ گھر چھوڑ کر جانے کی دھمکی دیتے رہے لیکن کوئی ان کے سامنے جھکنے نہیں آیا۔

دوسری صبح وہ مرزا صاحب کے پاس جا کر بولے۔ "آپ نے ایسی لڑکی کو میرے ہاں کیوں بھیجا تھا جو ایک ناجائز بچے کی ماں بننے والی تھی؟"

مرزا صاحب نے حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے معذرت چاہی کہ وہ حقیقت سے واقف نہیں تھے۔ پھر انہوں نے کہا۔ "ایک دوشیزہ کا رشتہ ہے جو بغیر کسی شرط کے شادی کے لیے تیار ہے۔"

"میں دوڑتے دوڑتے تھک گیا ہوں۔ غضب خدا کا یہ تیسرا سال ہے اور آج تک مجھے کہیں سے رشتہ نہیں ملا۔ دوسروں کو دیکھتے کہ آئے دن کسی نہ کسی کی شادی ہوتی ہی رہتی ہے۔"

"یہ تو نصیب کی بات ہے۔ ارمان صاحب! ہو سکتا ہے کہ یہی دوشیزہ آپ کے نصیب میں ہو۔ آپ چاہیں تو میں فون پر ملاقات کا وقت مقرر کر لوں۔"

"ٹھیک ہے، اب میں آخری بار رشتے کے لیے جاؤں گا اگر ناکامی ہوئی تو...... تو......!"

تو وہ کیا کریں گے، خود ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ جوانی کے عذاب سے کیسے پیچھا چھڑائیں گے؟! اپنی خواہشات کو کہاں لے جا کر دفن کریں گے؟ جوانی تو جلانے کے لیے آتی ہے۔ ہاں...... ٹھیک ہے...... اس کے بعد وہ خدا سے گڑگڑا کر دعا مانگیں گے کہ "بار جوانی عذاب ہے یا رب! چھین لے مجھ سے خواہشیں میری۔"

شام کے سات بجے ملاقات کا وقت مقرر ہوا۔ اگرچہ وہ وقت بیٹے کے نکاح کے لیے مقرر ہو چکا تھا لیکن وہ بھی پرانے رشتوں سے بغاوت پر آمادہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے گھر کا رخ نہیں کیا اور دکان پر بھی نہیں گئے۔ مبادا کوئی بلانے آجائے۔ کسی طرح وقت گزار کر وہ اس دوشیزہ کی رہائش گاہ پر پہنچے۔ وہاں یہ دیکھ کر ہی ارمان صاحب کا ماتھا ٹھنکا کہ وہ اپنے مکان میں اکیلی تھی۔ انہوں نے پوچھا۔ "کیا آپ کے بزرگ نہیں ہیں؟"

"نہیں!" اس نے مختصر سا جواب دیا۔ وہ حسین اور پرکشش تھی اس لیے ارمان صاحب بیٹھ گئے۔ انہوں نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔ "آپ کا کوئی تو ہو گا؟"

"میں اپنے متعلق سب کچھ بتا دوں گی لیکن میری ایک شرط ہے کہ میں شادی کے بعد بھی اسی گھر میں رہوں گی۔ یہ آپ کا بھی گھر ہو گا۔ آپ جب چاہیں آ جا سکتے ہیں۔ مرزا صاحب نے بتایا ہے کہ آپ کے بیوی بچے ہیں۔ اس طرح آپ دوسری بیوی کی رہائش کے مسئلے سے نجات پائیں گے۔"

"مجھے منظور ہے۔ میں خدا کو حاضر ناظر جان کر قسم کھاتا ہوں کہ آپ کا راز میرے سینے میں دفن رہے گا۔"

وہ اپنے سر پر آنچل رکھ کر بولی۔ "میں ایک بہت ہی اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہوں جس کے متعلق آپ کو شادی کے بعد معلوم ہو جائے گا۔ آصف میرے چچا زاد بھائی ہیں۔ ہم دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے آئے ہیں۔ ساتھ کھانا، ساتھ کھیلنا اور ساتھ پڑھنے جانا ہمارا معمول تھا۔ جب جوان ہوئے تو ہماری پسند محبت یا عشق میں بدل گئی۔ عشق بھی ایسا کہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کے بغیر چین اور سکون سے نہیں رہ سکتا۔ جب میرے ماموں نے ہماری شادی پر اعتراض کیا تو میں صدمے سے بیمار پڑ گئی اور آصف خودکشی کے لیے آمادہ ہو گئے۔ ماموں کو ہماری ضد کے آگے جھکنا پڑا اور ہماری شادی ہو گئی۔"

"وہ یہیں رہتے ہیں۔ فی الحال اپنے والدین سے ملنے گئے ہوئے ہیں۔"

"جی......" ارمان صاحب نے شدید حیرانی سے پوچھا۔ "یعنی کہ آپ دونوں یہاں ساتھ رہتے ہیں......یعنی یہ کہ علیحدگی نہیں ہوئی۔"

"میں نے کہا ناکہ ہم ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر زندہ نہیں رہ سکتے۔"

"مم...... مگر آپ تو شادی شدہ ہوئیں۔ مرزا صاحب فرما رہے تھے کہ دوشیزہ کا رشتہ ہے۔"

"انھوں نے درست کہا تھا۔ کیونکہ وہ میری شادی کے بارے میں نہیں جانتے' لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ میں شادی کے بعد بھی کنواری دوشیزہ ہوں۔"

"ایں؟" وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ دوشیزہ شرم کے مارے آنچل سے منہ چھپا رہی تھی۔ انھوں نے پوچھا۔ "میں کیسے یقین کروں کہ آپ شادی کے بعد بھی کنواری ہیں؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "میں سچ بول رہی ہوں۔ آپ کی مرضی ہے جھوٹ سمجھیں۔ آصف شوہر بننے کے قابل نہیں تھے۔ وہ خودکشی کرنا چاہتے تھے۔ میں ان کے قدموں سے لپٹ گئی۔ میں نے قسم کھائی کہ ان کی مردانگی کا بھرم رکھوں گی' اور میں اس قسم پر پانچ برس سے قائم ہوں۔"

"لیکن آج آپ نے میرے سامنے یہ قسم کیوں توڑ دی؟"

"مجبوری' ہے خود آصف نے بھی مجھے مجبور کیا ہے۔ میں ماں بننا چاہتی ہوں۔ پانچ سال سے لاولد ہونے کے باعث آصف شدید احساس کمتری میں مبتلا ہیں۔ ہر کوئی پوچھتا ہے کہ تم اب تک باپ کیوں نہیں بنے تو انھیں اپنا راز فاش ہوتا نظر آتا ہے۔ میں یہ کہہ کر سہارا دیتی ہوں کہ میں بانجھ ہوں۔ آصف کے والدین سچ مچ بانجھ سمجھ کر اپنے بیٹے کی دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح خود ان کے والدین کے انجانے پن سے راز کھلنے والا ہے۔ ہم نے اس مسئلے پر غور کیا۔ آخر آصف نے کہا کہ میں دوسری شادی کرلوں۔"

"یعنی تو آصف صاحب آپ کو طلاق دے دیں گے؟"

"جی ہاں...... مگر ہم ایک دوسرے سے جدا ہو کر نہیں رہ سکتے۔ آپ چاہیں تو ہماری مشکل آسان ہو سکتی ہے۔"

"کیسے؟"

"آصف مجھے چپ چاپ طلاق دیں گے۔ ہمارے خاندان والوں کے علم میں یہ بات نہیں آئے گی۔ دنیا والوں کی نظروں میں ہم میاں بیوی رہیں گے۔ اگر آپ چاہیں تو طلاق کے بعد مجھ سے نکاح پڑھوالیں۔ یہ نکاح راز میں رہے گا۔ ہم جائز میاں بیوی ہوں گے لیکن دنیا والوں کو یہ باور کرائیں گے کہ آپ آصف کے دوست ہیں اور صبح و شام ان سے ملنے آیا کرتے ہیں۔"

"لل...... لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ میری شریک حیات بننے کے بعد بھی آصف صاحب کی شریک حیات کہلائیں گی۔ پھر میرا نام کہاں جائے گا۔"

"دیکھئے آپ کی شریک حیات موجود ہیں۔ ماشاء اللہ بچے بھی ہیں۔ آپ کو شوہر اور باپ کی حیثیت حاصل ہے۔ کیا آپ ذرا سا سمجھوتہ کر کے میرے آصف کو میرے شوہر اور میرے بچوں کے باپ کی حیثیت نہیں دے سکیں گے؟"

"یعنی......یعنی کہ جو بچے پیدا ہوں گے' وہ بھی میرے نہیں کہلائیں گے؟"

"اللہ کے فضل سے آپ کے پہلے ہی بچے ہیں۔"

وہ اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ "آخر اس ڈرامے بازی کی کیا ضرورت ہے؟ جو شخص شوہر نہیں بن سکتا' آپ اس کے لیے اتنی پریشانیاں کیوں مول لے رہی ہیں۔"

"میں آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ ہم دونوں بچپن سے ایک دوسرے کے ساتھ ایسا دلی لگاؤ رکھتے ہیں کہ ایک دوسرے کو کسی قیمت پر چھوڑ کر الگ نہیں ہو سکتے۔ میں آصف کی عزت رکھنے کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دوں گی۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کی محبت' آپ کی عقیدت' آپ کا دلی لگاؤ تو صرف آصف کے لیے ہوگا۔ میری حیثیت کچھ نہ ہوگی۔ معاف کیجیے گا' شادی اس سے کی جاتی ہے' جو صرف شوہر سے محبت کرے اور شوہر کی نسل کو ہمارے نام سے دنیا والوں کے سامنے پیش کرے۔"

ارمان صاحب جانے لگے' وہ راستہ روک کر کھڑی ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "آپ کی بیوی ہے' بچے ہیں' آپ کا نام بہت ہو چکا ہے۔ میں آپ سے آصف کی عزت اور زندگی کی بھیک مانگ رہی ہوں۔ خدا کی قسم! آپ نے مایوس کیا تو ہم دونوں مر جائیں گے۔"

"میں گناہ گار نہیں بن سکتا۔ دنیا والوں کو دھوکہ دے کر بناسپتی شوہر نہیں بن سکتا۔ مجھے افسوس ہے......"

وہ کترا کر نکل گئے۔ تیزی سے چلتے ہوئے اس مکان سے باہر آ گئے۔ انسان کو صرف اپنا ہی دکھ بھاری لگتا ہے۔ اس بیاہتا دوشیزہ پر کیا گزری ہوگی...... ارمان صاحب کو اس کا احساس نہیں تھا۔ وہ اپنی ناکامی پر جھنجلا رہے تھے۔ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ایک مدت سے حرامی رشتوں کی دنیا میں سانس لیتے آ رہے ہوں۔ اور انہیں کبھی صاف ستھرا رشتہ نہیں ملے گا۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہر شخص اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھے تو خود اپنے کردار کی خامیاں گن سکتا ہے۔ مگر اپنے گریبان میں جھانکتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ ارمان صاحب خود کہاں صاف ستھرے تھے؟ بیوی کے حقوق چھین رہے تھے۔ بچوں کی جوانی سے زیادہ اپنی جوانی کا بخار اتارنے میں مصروف تھے۔ گناہ اور جھوٹ سے پرہیز کرتے تھے مگر دولت مند بننے کے لیے غیر قانونی کاروبار کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ اپنی دنیا' اپنے ماحول کو صاف ستھرا کیے بغیر انہیں کوئی صاف ستھری بیوی مل جائے گی"

تھک ہار کر وہ اپنے گھر لوٹ آئے۔ گھر کے دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ تب انہیں یاد آیا کہ عذرا بیگم اپنے بیٹے کامران کے لیے دلہن بیاہ کر لانے گئی ہیں۔ انہوں نے اپنی جیب سے چابی نکال کر تالا کھولا۔ پڑوس کے ایک بوڑھے نے اپنی کھڑکی میں سے جھانک کر پوچھا۔ "ارے ارمان صاحب! اتنی جلدی بہو لے کر آ گئے؟"

انہیں ندامت کا احساس ہوا۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ بیٹا سہرا باندھ کر کہاں گیا ہے۔ انہوں نے جلدی سے کہا۔ "جی نہیں بہو کی رخصتی کی رسمیں ابھی ہو رہی ہیں۔ میرے پیٹ میں سخت تکلیف ہو رہی تھی اس لیے میں پہلے چلا آیا۔"

بوڑھے پڑوسی نے کہا۔ "ہاں صاحب! بڑھاپے میں ایک نہ ایک بیماری رہتی ہی ہے۔"

انہوں نے جلدی سے اندر آ کر دروازہ بند کر لیا۔ جیسے پڑوسی نے بڑھاپے کا پتھر کھینچ کر مارا ہو۔ بعض اوقات کسی کی بات ذہن میں چپک کر رہ جاتی ہے۔ وہ آئینے کے سامنے آ کر اپنے چہرے کو ٹٹولنے لگے۔ اپنے آپ کو اوپر سے نیچے تک دیکھنے لگے۔ کہیں بڑھاپا چپکے چپکے واپس تو نہیں آ رہا ہے؟

واپس تو نہیں آ رہا تھا مگر آ جانا چاہیے تھا۔ ایسی جوانی کس کام کی جس پر زلفوں کی [illegible] نہ چھا جائے۔ کسی کی مدھ بھری آنکھوں کے پیمانے سے نشہ نہ چھلکے اور رات کانٹوں پر تڑپن جائے۔ اچانک ان کے جی میں آیا کہ رونا شروع کر دیں۔ وہ گھر کے رہے تھے نہ گھاٹ کے۔ اپنے جوان بیٹے کی شادی میں بھی شریک نہ ہو سکے تھے۔ اب خاندان کے لوگوں نے پوچھا تو وہ اپنی غیر حاضری کا کیا جواز پیش کریں گے؟ پتہ نہیں عذرا بیگم نے کیا بہانہ بنایا ہوگا۔ اتنا تو یقین تھا کہ وہ انہیں بدنام نہیں کریں گی۔

وہ ندامت سے بیٹھ گئے جیسے دھنس گئے ہوں۔ انہیں عذرا بیگم کی وفاداری اور خدمت گزاری کا ایک ایک لمحہ یاد آنے لگا۔ اپنی بیوی پھر اپنی ہی ہوتی ہے۔ وہ دلشاد بیگم کی طرح سودے بازی نہیں کرتی' روبی کی طرح کسی ایک شوہر کا لیبل حاصل کر کے بوائے فرینڈ نہیں بناتی' کسی جوان دوشیزہ کی طرح اپنے نام مکان اور جائداد نہیں لکھواتی اپنے گھر کی چار دیواری میں بیٹھ کر عذرا بیگم کی عینک لگا کر دیکھنے سے پتہ چلا کہ گھر سے باہر جوان عورتوں کی بہت بڑی منڈی ہے اور وہ منڈی کی عورت گھر میں نہ لا سکیں گے۔

سوچتے سوچتے کتنا وقت گزر گیا۔ پھر باہر گاڑیوں کا شور سنائی دیا۔ مرد عورتوں کے [illegible] رات کے سناٹے میں گونج رہے تھے۔ عذرا بیگم بھی ہنستی بولتی سنائی دے رہی تھیں۔ پھر گھر کا دروازہ کھلا' وہ سب اندر آ گئے۔ ان کے ہنسنے بولنے سے پتہ چل رہا تھا کہ ایک طویل انتظار کے بعد گھر میں بہو آ گئی ہے۔

ارمان صاحب اپنے کمرے میں انتظار کرتے رہے کہ اب بیوی بچے ان کے پاس آئیں گے اور اپنی خوشیوں میں شریک کریں گے مگر بیس منٹ تک کوئی ادھر نہ آیا۔ وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے پھر زیر لب بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑھے۔ "ٹھیک ہے' بیگم اور بچوں [illegible] رہا کہ میں ان کی خوشیوں میں شریک ہو سکتا ہوں کیونکہ میں اب تک ان کی [illegible] چھینتا رہا ہوں' مجھے ہی آگے بڑھنا ہوگا۔"

وہ اپنے بیٹے کامران کے کمرے کے سامنے پہنچے...... وہاں رشتے داروں کا ہجوم تھا انہیں دیکھ کر سب ایک طرف ہٹنے لگے۔ کمرے کے اندر دلہن سیج پر گھونگٹ نکالے بیٹھی تھی۔ آہ! تقدیر کا لکھا پورا ہوتا ہے۔ پہلے بیٹے کی دلہن آنا تھی سو آ گئی۔

عذرا بیگم کی درخواست پر تمام رشتے دار کمرے سے باہر چلے گئے۔ صرف کامران رہ گیا۔ عذرا بیگم نے دروازے کو بند کرتے ہوئے ارمان صاحب سے کہا۔ "میں نے سوچا

تھا کہ تمام رشتے داروں کے رخصت ہونے کے بعد آپ کو بہو دکھاؤں گی تاکہ آپ تنہائی میں غصہ دکھا سکیں۔"

انہوں نے کہا۔ "میں ناراض نہیں ہوں مگر شادی کی ایسی جلدی بھی کیا تھی؟ اچانک تم نے لڑکی دیکھ لی اور لڑکی والوں نے کچھ معلومات حاصل کیے بغیر اتنی جلدی نکاح بھی پڑھا دیا اور رخصتی بھی کر دی۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ میں ناراض نہیں ہوں مگر پوچھنے کا حق رکھتا ہوں۔"

عذرا بیگم نے ایک ہزار روپے ان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ "بہو کے سامنے بحث کرنا مناسب نہیں ہے۔ یہ باتیں بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔ آپ منہ دکھائی کی رسم ادا کریں۔"

ارمان صاحب پس و پیش میں آگے بڑھے۔ ایک ہزار روپے بہو کے سانولے سلونے ہاتھ پر رکھے۔ پھر انہوں نے آہستگی سے گھونگٹ اٹھایا تو ان کے ذہن کو زبردست جھٹکا لگا۔ گھونگٹ کے سائے میں کنیز آنکھیں بند کیے نظر آئی۔

انہوں نے بوکھلا کر کامران کو دیکھا' پھر غصے سے مٹھیاں بھینچ کر عذرا بیگم کی طرف پلٹ گئے۔ وہ بڑے ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولیں۔ "کلام پاک کی ایک آیت ہے کہ لوگو! قیامت کے دن تمہیں تمہاری ماؤں کے نام سے پکارا جائے گا۔ میرا ایمان ہے کہ میری بہو کا بچہ بھی میری بہو کے نام سے پکارا جائے گا۔ ہمارے گندے معاشرے کا کوئی شخص اسے بدنام نہیں کر سکے گا۔"

ارمان صاحب پلٹ کر جانے لگے۔ عذرا بیگم کی آواز آتی رہی۔ "آپ تین برس سے دلہن تلاش کر رہے ہیں۔ میرے بیٹے کی دلہن جیسی بچی ادھر کھڑی ہے' ویسی آپ کبھی نہ پا سکیں گے۔"

وہ ایسے نادم ہوئے کہ کہیں جا کر مرنا چاہتے تھے مگر عذرا بیگم پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ بڑبڑاتی ہوئی ان کے کمرے میں آئیں۔ کل رات جب کنیز آپ کے پاس آئی تو مجھے یوں لگا تھا جیسے وہ شازیہ ہے' میری بیٹی ہے۔ جو اس کے ساتھ ہوا وہ آپ جیسے باپ کی لاپروائیوں سے خدانخواستہ ہماری بیٹی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ پھر کامران نے بھی ضد کی کہ وہ کنیز کو سہارا دے گا۔ میں نے کہا تمہارے ابا مخالفت کریں گے۔ اس نے جواب دیا۔ "میں کنیز کو اپنا کر کہیں چلا جاؤں گا۔ ابا خود ہی اس گھر میں آگ لگانا

چاہتے ہیں تو ہم کیوں یہاں رہیں۔ میں ہر حال میں ایک مجبور اور بے گناہ لڑکی کو اپنی عزت بناؤں گا۔"

میں بیٹے کی ضد دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ آپ تو میرے ہاتھ سے نکل ہی رہے تھے' بیٹا بھی ساتھ چھوڑ دیتا تو میں ادھر کی رہتی' نہ ادھر کی۔ اب آپ بتائیں کہ میں کیا کرتی۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ کنیز مجھے بھی پسند ہے۔ میں نے اس کی عزت رکھ لی ہے' خدا ہماری بھی عزت رکھے گا۔"

ایسے وقت ہی خدا یاد آتا ہے۔ ارمان صاحب کو یاد آیا کہ انہوں نے عشاء کی نماز نہیں پڑھی ہے وہ باتھ روم میں وضو کرنے چلے گئے۔ عذرا کی بڑبڑاہٹ کمرے میں سنائی دے رہی تھی اور وہ اندر ہی اندر ٹوٹ رہے تھے۔

صرف تکمیل ہوس کی قوتوں کا نام جوانی ہے۔ ہر وقت مثبت فیصلہ کرنے والی ذہانت اور حوصلے کا نام جوانی ہے۔ کامران کے پاس جوانی کا حوصلہ تھا۔ اس نے پا لیا۔ ارمان صاحب کی بوڑھی جوانی میں سب کچھ تھا' مگر وہ حوصلے کی کمی سے ہار گئے۔

اچانک ان کی آنکھیں رونے لگیں۔ وضو کرتے وقت منہ دھو رہے تھے۔ اس لیے آنسو اور پانی گڈمڈ ہو گئے۔ جب وہ کمرے سے باہر آئے تو بیگم نے کہا۔ "تولیے سے منہ تو پونچھ لیں۔"

مگر وہ جانماز بچھا کر کھڑے ہو گئے۔ نماز شروع کر دی مگر یہ خیال حاوی تھا کہ بیگم سر بیدار ہیں اور انہیں آزادی سے رونے کا موقع نہیں مل رہا ہے۔ یہی تو ایک جگہ ہوتی ہے۔ وہی تو ایک معبود ہوتا ہے جس کے حضور دل کے آنسو دعا بن جاتے ہیں۔ وہ پہلی رکعت کے سجدے میں جاتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

آہ! بڑے بڑے انکشافات ہوتے ہیں۔ اسی لمحے انکشاف ہوا کہ سجدہ ایک ایسا مقام ہے جہاں ندامت کے آنسو دنیا والوں سے چھپائے جاتے ہیں۔

○☆○

لہو کے پھول

اردو زبان میں اسلوب، انداز اور اسٹائل کیسا ہوتا ہے؟
اردو الفاظ میں جذبے کتنی خوبصورتی سے بولتے ہیں؟
زبان ہمیں کسی ماحول کی سچی عکاسی کیسے سکھاتی ہے؟
قلم کا ہنر کیا ہو کہ کردار سچ مچ جاگنے لگیں؟
جو لوگ کہتے ہیں کہ اردو میں زبان کے اعتبار سے قابل ذکر کہانی نہیں لکھی گئی، وہ "لہو کے پھول" پڑھیں۔
محی الدین نواب نے اردو ریولنے، پڑھنے اور لکھنے کا حق ادا کر دیا ہے۔

(لہو کے پھول ـــ کارینل وولریچ کی کہانی دی مونٹ ایٹ ہونتان وماسے ماخوذ ہے)

لہو کے پھول

گدھا گاڑی بہت ہی پرانی اور بوڑھی تھی۔ اس میں بیٹھی ہوئی لڑکی نہایت ہی حسین اور جوان تھی۔ گاڑی کچے راستے کے نشیب و فراز میں ہچکولے کھاتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ گاڑی بان کے پیچھے بیٹھی ہوئی لڑکی ہر ہچکولے پر ڈگمگا رہی تھی اور چاروں طرف ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے پہلی بار اس علاقے سے گزر رہی ہو۔

دور دور تک سندھ کی بنجر زمینیں پھیلی ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں کھیت نظر آ رہے تھے اور جہاں کھیت نظر آتے تھے وہاں لڑکی کی آنکھوں میں پیار بھری خوشیوں کی چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ یوں لگتا تھا' وہ ان کھیتوں کی جوان فصلوں میں اپنے گبرو جوان کا چہرہ دیکھ رہی ہو۔

اس کی سیاہ غزالی آنکھیں' ریشم جیسے سنہری بال' اس کے چہرے کی دودھیا رنگت اور اس کا پہناوا دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ پنجاب کے کسی علاقے سے آئی ہے اور سندھ کی تپتی ہوئی دھوپ میں پسینہ پسینہ ہوتی جا رہی ہے۔ دھوپ کی تپش میں اس کا چہرہ انگارے کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ راستے کی اڑتی ہوئی گرد اس کے حسن کو دھندلانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ گاڑی جھٹکے کھاتی ہوئی' کبھی اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر

اچھلتی ہوئی دھمکیاں دے رہی تھی کہ اسے اٹھا کر راستے کے کنارے پھینک دے گی لیکن وہ بڑے ہی اعتماد سے ایسے بیٹھی ہوئی تھی جیسے ایک عورت اپنی آنکھوں میں انتظار سجا کر اور ایک ماں اپنی گود میں بچے کو سنبھال کر بیٹھتی ہے۔ اس کی گود میں ایک ننھا سا بچہ تھا۔

بچہ اس کے ہاتھوں کے پالنے میں تھا اور اس کے سینے سے لگا ہوا تھا۔ اس کے سر کے بال بھی سنہرے تھے۔ جسم کی رنگت سرخ و سفید تھی۔ اسے اس دنیا میں آئے ہوئے زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس دن ہوئے تھے۔ لڑکی اس انتظار میں تھی کہ بچہ گود میں آئے گا تو اس سفر کا آغاز کرے گی۔ اس کے گھر والوں نے اسے روکا تھا کہ ایسی حالت میں اسے گھر سے نکلنا نہیں چاہیے لیکن وہ سب کے روکنے ٹوکنے کے باوجود بچے کے باپ کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی تھی۔

نہ جانے وہ کون بد نصیب تھا جو ایسے بے پناہ حسن و شباب کو بھول کر کہیں بھٹک گیا تھا۔ وہ حسینہ ایسی تھی جسے کوئی بھی شخص اپنی نگاہوں کے فریم میں ہر وقت سجائے رکھتا۔ اس وقت وہ نارنجی رنگ کے سوٹ میں سرخ گلاب کی طرح کھلی ہوئی تھی۔ اس کے محبوب کو سرخ گلاب پسند تھے' وہ اکثر سوچتا تھا کہ جب اس کا ایک مکان ہوگا تو اس کے آنگن میں سرخ گلاب کے پودے لگائے گا لیکن جب وہ دلہن بن کر آئی تو اس نے گھونگھٹ اٹھا کر کہا۔

"شادو! اس سرخ جوڑے میں گلاب کی کلی نظر آتی ہو۔ کبھی کبھی یہ لباس پہن لیا کرنا' اب میں گلاب کے پودے نہیں لگاؤں گا........"

شادو سہاگ رات کے ان رنگین اور معطر لمحات کو یاد کر کے سندھ کی جلتی ہوئی دھوپ میں بھی مسکرانے لگی۔ عورت کہیں بھی ہو' اگر اس کی آنکھوں میں اپنے کبرو جوان کی تصویر ہو تو وہ انگاروں پر بھی چلتے ہوئے مسکراتی ہے۔

دور ایک بڑا سا مکان نظر آ رہا تھا۔ مٹی کی چھت اور مٹی کی دیواریں تھیں۔ ایک درخت کے سائے میں دو بھینسیں بیٹھی ہوئی جگالی کر رہی تھیں۔ شاید اس کی منزل آ گئی تھی۔ اس کا انتظار ختم ہو رہا تھا۔

گدھا گاڑی دروازے کے قریب آ کر رک گئی۔ گاڑی بان نے کھردرے لہجے میں

کہا۔ "یہ عثمان گوٹھ ہے۔ آگے دو فرلانگ پر ایک چھوٹی سی بستی ہے' اب بتاؤ اسی مکان میں جانا ہے یا آگے بستی میں؟"

"میرے خیال میں یہی مکان ہے۔" شادو نے کہا۔ "میں اسی مکان کے پتے پر خط لکھتی رہی ہوں۔ تم ذرا ٹھہرو' میں دروازے پر دستک دے کر پوچھتی ہوں۔"

گاڑی بان نے بے رخی سے کہا۔ "بی بی جی! میرا کرایہ دو۔ میں یہاں سے جاؤں گا۔ تم دس گھروں میں پوچھتی پھرو گی تو میں تمہارے پیچھے نہیں پھروں گا۔ وہ تو اسٹیشن ماسٹر کی زبردستی سے میں بیس میل دور آ گیا ہوں۔ اچھا ظلم ہے۔ بابو لوگ رعب جما کر ہمیں بھی گدھوں کی طرح ہانک دیتے ہیں۔ اونہہ! لاؤ میرا کرایہ۔ پورے چھ روپے لوں گا۔"

وہ چپ چاپ گاڑی سے اترنے لگی۔ گاڑی بان نے کپڑوں کی گٹھری اور پلاسٹک کا تھیلا اٹھا کر دروازے پر رکھ دیا' پھر اس سے چھ روپے وصول کر کے گاڑی کو موڑتا اور زیر لب بڑبڑاتا ہوا واپس جانے لگا۔

وہ انجانی جگہ پر تنہا رہ گئی۔ دروازے پر سامان رکھا تھا گود میں بچہ سو رہا تھا اور سر پر سورج چمک رہا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دینے لگی۔

دستک کے جواب میں تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر دروازہ ذرا سا کھلا۔ اتنا سا کہ اندر سے صرف ایک بڑھیا کا چہرہ جھانکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ بکھرے ہوئے بالوں کے درمیان سیاہی مائل جھریوں دار چہرہ' آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی' ناک طوطے کی طرح نوکیلی' سامنے کے دو دانت قدرے لانبے تھے اور نچلے ہونٹ پر دھنسے ہوئے لگتے تھے۔ وہ ایسا خبیث چہرہ تھا کہ شادو اسے دیکھتے ہی کسی انجانے خطرے کے احساس سے کانپ گئی۔ اس نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے پوچھا۔

"یہ...... فریدے کا مکان ہے؟"

"فریدے؟" بڑھیا نے اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ "تم کون ہو؟"

"میرا نام شاداں ہے۔ میں جڑاں والا سے آئی ہوں۔ فریدے یعنی کہ فرید میرا خاوند ہے۔"

بڑھیا کی نظریں اور زیادہ چبھنے لگیں۔ مکان کے اندر سے کسی عورت کی آواز سنائی دی۔ "ماں جی! کون ہے؟"

بڑھیا نے جواب دیا۔ "ایک جوان لڑکی ہے۔ گود میں بچہ ہے۔ کہتی ہے کہ فریدے اس کا خاوند ہے۔"

اس کی بات پوری ہوتے ہی ایک عورت وہاں پہنچ گئی اور دروازے کو پوری طرح کھول کر اسے دیکھنے لگی۔ آنے والی عورت شادو کی ہم عمر تھی۔ اس کی طرح جوان اور صحت مند تھی لیکن اس کے جیسا اجلا رنگ نہیں تھا۔ وہ گہرے سانولے رنگ کی دوشیزہ تھی۔ وہ شادو کو ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی مصیبت دروازے پر آگئی ہو۔ وہ روکھے پن سے بولی۔ "یہاں کوئی فرید احمد نہیں رہتا ہے آگے بستی میں جا کر پوچھو۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" شادو نے کہا "میں فرید احمد عثمان گوٹھ معرفت محکمہ زراعت سندھ کے پتے پر خط لکھتی رہی ہوں۔ سات ماہ پہلے فریدے نے میرے ایک خط کا جواب دیا تھا۔ بہن! تم ہی میری یہ الجھن دور کرو کہ یہاں سے کس فریدے نے مجھے خط لکھا تھا؟"

اس سانولی لڑکی نے کہا۔ "تم خود ہی ہمیں الجھا رہی ہو۔ ہم پہلی بار کسی فرید کا نام سن رہے ہیں۔ تم محکمے والوں کے پاس جا کر پوچھو تو تمہیں حقیقت معلوم ہو جائے گی۔"

"میں کہاں جاؤں؟ کس سے پوچھوں؟ اس علاقے میں پہلی بار آئی ہوں۔ سفر کی تھکن سے برا حال ہو رہا ہے۔ اب ایک قدم آگے بڑھنے کا بھی حوصلہ نہیں ہے۔ کیا تم مجھے تھوڑی دیر ستانے کی اجازت نہیں دو گی؟ تمہاری باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ تم بھی پنجاب کی رہنے والی ہو۔ میں بھی تمہاری علاقے کی ہوں۔ میری پریشانیوں کا خیال کرو۔"

سانولی لڑکی نے اپنی بوڑھی ماں کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ خبیث بڑھیا نے شادو سے کہا۔ "یہ میری بیٹی کندن بی بی ہے۔ صبح اس کا بچہ مر گیا ہے۔ گھر میں اس کی میت پڑی ہے۔ تمہاری گود کا بچہ کیا زندہ ہے۔ کیا اس بچے کو تم ہمارے گھر میں لے کر آؤ گی؟"

"ماں جی!" شادو نے کہا۔ "زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ میرے بچے کو کچھ نہیں ہو گا۔"

"ہی ہی ہی!" بڑھیا کے دو لانبے دانت کچھ اور نمایاں ہو گئے۔ وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "بے شک زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن موت انسان کے ہاتھ میں ہے۔ ایک انسان بڑی آسانی سے دوسرے انسان کو موت کی نیند سلا دیتا ہے۔"

شادو کو ایسا لگا جیسے وہ بڑھیا دھمکی دے رہی ہے۔ کوئی دوسرا وقت ہوتا تو شادو اس خبیث بڑھیا اور بد مزاج کندن بی بی کی صورت تک دیکھنا گوارا نہ کرتی مگر اس وقت آس پاس کوئی دوسرا مکان نہ تھا۔ قریبی بستی وہاں سے دو فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ گدھا گاڑی میں بیس میل کا سفر کرنے کے بعد بدن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ تھکن، شوہر کی گمشدگی، مایوسی اور تنہائی نے ایسا نڈھال کر دیا تھا کہ وہ وہاں بیٹھ کر تھکن اتارنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ کندن نے کہا۔

"یہ علاقہ بہت خطرناک ہے۔ چور بدمعاش تنہا عورت کو پا کر اس کی بے عزتی کرتے ہیں پھر اسے قتل کر دیتے ہیں۔ تعجب ہے تم یہاں تک تنہا کیسے آگئی ہو؟"

"محبت کھینچ لائی ہے۔" شادو نے مسکرا کر کہا۔ "جب تک فرید کا پیار زندہ ہے۔ مجھے کوئی قتل نہیں کر سکے گا۔ کیا میں اندر آجاؤں؟"

"آجاؤ۔" دونوں ماں بیٹی ایک طرف کو ہو گئیں۔

شادو ایک ہاتھ سے بچے کو سنبھال کر اور دوسرے ہاتھ سے سامان اٹھا کر ان کے سامنے سے گزری تو کندن مرجھا گئی۔ اس کا رنگ سانولا تھا لیکن شادو کے چکنے اور اجلے بدن کے مقابل وہ سیاہ پڑ گئی تھی اور بڑی حاسدانہ نظروں سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ بڑھیا نے کہا۔

"تم بہت دور سے آرہی ہو۔ میں تمہارے لیے نمکین لسی لے کر آتی ہوں۔"

"نہیں ماں جی! بچہ میرا دودھ پیتا ہے۔ میں لسی پیوں گی تو اسے زکام ہو جائے گا۔ آپ مجھے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پلا دیجیے۔"

بڑھیا کمرے سے باہر چلی گئی۔ شادو نے منجھی پر بیٹھ کر بچے پر سے چادر ہٹا دی اور اپنے دوپٹے کے آنچل سے اسے پنکھا جھلنے لگی۔ بچے نے آنکھیں کھول دیں تھیں۔ اس کی نیلی نیلی آنکھیں کندن کے دل میں چبھنے لگیں۔ وہ بڑے غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ماں چاند تھی، بیٹا چاند کا ٹکڑا تھا۔ شادو نے اسے چوم کر کہا۔

"بالکل اپنے باپ جیسا ہے۔ فرید کی آنکھیں بھی نیلی ہیں۔"

کندن نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ "کہاں ہے تمہارا فرید؟"

وہ طنز نہ کرتی، سادگی سے پوچھتی، تب بھی یہ دل دکھانے والی بات تھی کہ فرید اس

کی محبت کا مذاق اڑانے کے لیے اسے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ وہ اسے تلاش کرنے جڑانوالہ سے بس میں بیٹھ کر شورکوٹ آئی۔ وہاں سے ٹرین کے ذریعے شہداد پور اور وہاں سے گدھا گاڑی میں بیٹھ کر اس اجاڑ علاقے میں پہنچی جہاں دو بھینسوں اور دو عورتوں کے سوا کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔

وہ کندن کے سوال کا جواب دینے کے بجائے دوسری طرف منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔ دوسری طرف کے کھلے ہوئے دروازے سے گھر کا آنگن نظر آرہا تھا۔ آنگن کے وسط میں ایک کنواں تھا اور کنویں کے اس پار......

اس پار نظر پڑتے ہی شادو کا دل بے اختیار دھڑکنے لگا۔ اس کی آنکھیں ایک نئی امید سے روشن ہوگئیں۔ کنویں کے اس پار گلاب کے پودے نظر آرہے تھے۔

گلاب' جو فرید کو پسند تھے۔ اور وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ اس کا اپنا گھر ہوگا تو آنگن میں سرخ گلاب کے پودے لگائے گا۔ مگر وہاں جو گلاب کھلے ہوئے تھے' وہ سفید تھے اور عورتیں کہہ رہی تھیں کہ یہ فرید احمد کا مکان نہیں ہے پھر وہ کون شوقین ہے جو بنجر زمین پر گلاب کے پھول کھلا رہا ہے؟

اب شادو کو یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ کسی دوسرے کا مکان ہے۔ دل کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے فرید کے مکان میں بیٹھی ہے اور اس کے آنگن میں گلاب کھل رہے ہیں۔ بلا سے وہ سرخ نہ ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ وہاں کی مٹی میں سرخ گلاب نہ کھلتے ہوں۔ فرید نے سفید پر ہی اکتفا کی ہو۔ بہرحال دل میں امید کی ایک کرن پھوٹ رہی تھی۔

اس نے کندن سے پوچھا۔ "تمہیں گلاب کے پھول پسند ہیں؟"

"میرے آدمی کو پسند ہیں۔ وہ سرخ......" وہ کہتے کہتے ٹھٹک گئی اور ہونٹوں کو سختی سے بھینچ کر شادو کے نارنجی رنگ کے لباس کو گھورنے لگی۔ وہ لباس کی پنکھڑیوں میں لپٹی ہوئی سرخ گلاب کی ایک کلی نظر آرہی تھی۔ اس لیے کندن یہ نہ کہہ سکی کہ اس کے مرد کو کس رنگ کا گلاب پسند ہے۔

شادو اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ کہتے کہتے کیوں رک گئی ہے لیکن اسی وقت بڑھیا ایک گلاس میں پانی لے کر آگئی۔ اس نے گلاس ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا۔
"تمہارے خاوند کا کیا نام ہے؟"

اس نے پانی پیتے ہوئے گلاس کے افق سے دیکھا' دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"اس کا نام کرم دین ہے۔" کندن نے مختصر سا جواب دیا اور جلدی سے اپنی ماں کا بازو پکڑ کر اسے کھینچتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئی۔ آنگن میں پہنچ کر اس نے کن انکھیوں سے شادو کی جانب دیکھا۔ پھر وہاں سے بھی ماں کو کھینچتے ہوئے دوسری طرف چلی گئی اور شادو کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

شادو اس طرح منجھی پر بیٹھی ہوئی تھی کہ دونوں ماں بیٹی اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی تھیں لیکن ان کا سایہ آنگن کے کچے فرش پر نظر آرہا تھا۔ دو سائے آپس میں سر جوڑ کر کچھ کہہ رہے تھے' کچھ سن رہے تھے۔ کبھی ان کے سر اثبات میں اور کبھی نفی میں ہلتے تھے۔ وہ دونوں ہاتھ نچا کر باتیں کرنے کی عادی تھیں اس لیے ان سایوں کے ہاتھ بار بار ناچ رہے تھے۔ بس یوں لگ رہا تھا جیسے ڈھلتی ہوئی دوپہر میں دو چڑیلیں آنگن کے کچے فرش پر تھرک رہی ہیں۔

ان کی حرکتوں سے شادو کو یقین ہو رہا تھا کہ وہ ماں بیٹی اس سے کچھ چھپا رہی ہیں۔ جو کہنا چاہیے وہ نہیں کہہ رہی ہیں شادو بڑی حد تک کچھ کچھ سمجھ رہی تھی اور جیسے جیسے وہ سمجھ رہی تھی' اس کا دل رو رہا تھا۔ رونے کی بات ہی تھی۔ سرخ گلاب فرید کو پسند تھے اور کندن کے خاوند کی پسند بھی وہی تھی۔ کندن نے جس انداز میں سوچ کر اپنے خاوند کا نام بتایا تھا اس سے ظاہر ہوگیا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اس کا نام کرم دین نہیں ہے' اس کے خاوند کا نام......

"نہیں۔ نہیں۔" وہ اپنے دل کو سمجھانے لگی۔ "کندن کے خاوند کا نام فرید احمد نہیں ہوسکتا۔ فرید میرا ہے۔ مجھے دل وجان سے چاہنے والا کندن کا خاوند نہیں بن سکتا......"

وہ سوچ میں گم تھی کہ بچے کے رونے سے چونک گئی۔ اتنے میں دونوں ماں بیٹی بھی کمرے میں واپس آگئیں۔ کندن نے کہا۔

"میں ماں جی کو سمجھا رہی تھی کہ تم بہت دور سے آئی ہو۔ اس علاقے میں تنہا اپنے خاوند کو تلاش نہیں کرسکوگی۔ میرا آدمی تمہارے فرید کو آسانی سے ڈھونڈ نکالے گا۔"

"تمہارا آدمی کہاں ہے؟" شادو نے پوچھا۔

"وہ محکمہ زراعت کے ایک افسر سے ملنے سکھر بیراج گیا ہے' رات کو کسی وقت لوٹے گا یا صبح تک ضرور آجائے گا۔ اس کے آنے تک تم یہاں رک جاؤ۔ اس کے انتظار میں 'میں نے اپنے بچے کو اب تک دفن نہیں کیا ہے۔

شادو نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بھول گئی تھی کہ اس گھر میں ایک بچے کی میت رکھی ہوئی ہے۔ اچانک شادو کے سوچنے کا انداز بدل گیا۔ اس کے سامنے ایک ماں اپنے بچے سے محروم ہوگئی تھی۔ ایسی حالت میں کندن بیزاری سے اور اکھڑے ہوئے لہجے میں باتیں کررہی تھی اور شادو اسے بدمزاج سمجھ رہی تھی۔

اگر وہ بدمزاج ہوتی تو اسے اپنے گھر میں رہنے کے لیے نہ کہتی اور اس کے فرید کو تلاش کرنے کے لیے اپنے خاوند کی خدمات پیش نہ کرتی۔ اس نے ہمدردی سے کہا۔

مجھے تمہارے بچے کی موت کا سخت افسوس ہے۔ کیا وہ بیمار تھا؟"

"نہیں بیمار نہیں تھا۔ بس سات دنوں کی زندگی لے کر آیا تھا۔ اسے دیکھو گی؟"

"ہاں دیکھوں گی۔ یہ رو رہا ہے' پہلے اسے دودھ پلا کر سلادوں' پھر دیکھتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ بچے کو دودھ پلانے کے لیے قمیض کا دامن اٹھانے لگی۔

ایک ماں اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ لہٰذا وہاں خیالات کی پاکیزگی ہونی چاہیے تھی اور ایسے وقت جب کہ اس کو دیکھنے والی عورتیں ہی تھیں۔ کسی عیاش مرد کی نگاہیں نہیں تھیں لیکن بعض اوقات ایک حاسد عورت دوسری عورت سے اپنا موازنہ کرنے کے لیے بہت دور تک دیکھتی ہے اور بہت دور تک سوچتی بھی ہے۔ کندن بھی اس وقت بہت گہرائی میں سوچ رہی تھی۔ اپنے بارے میں' شادو کے بارے میں اور فرید کے بارے میں کہ وہ دونوں ایک ہی درخت کی دو شاخیں تھیں۔

کندن دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچتے ہوئے گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ عورت کبھی برداشت نہیں کرتی کہ اس کا آدمی کسی دوسری دنیا...... میں بھٹک جائے۔

وہ زیادہ دیر تک اس حسین نظارے کو برداشت نہ کرسکی۔ اور منہ پھیر کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ بڑھیا پہلے ہی گلاس لے کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی تھی۔ جب بچہ سوگیا تو شادو نے اسے منجھی پر ڈال دیا۔ پھر اس کے نصف جسم کو چادر سے ڈھانپ کر

اسے ممتا بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ اسی دوران اسے مردہ بچے کا خیال آیا تو پھر کندن کے لیے اس کا دل ہمدردی سے بھر گیا۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر آگئی۔

آنگن میں پہنچ کر اس نے گلاب کے پھولوں کو دیکھا تو پھر فرید کا چہرہ مسکرانے لگا۔ اس کی سوچ رہ رہ کر بدل رہی تھی۔ کبھی وہ یہ سوچتی کہ وہ فرید کے لگائے ہوئے پودے ہیں اور کبھی کندن کی اجڑی ہوئی ممتا متاثر کرتی کہ ایک غمزدہ عورت جھوٹ نہیں بول سکتی۔ یہ کسی کرم دین کا مکان ہے۔

اس نے بیچ آنگن میں کنویں کے پاس کھڑے ہوکر دیکھا۔ دونوں ماں بیٹی نظر نہیں آرہی تھیں۔ شاید بڑھیا باورچی خانے میں تھی اور کندن اس سامنے والے کمرے میں۔ اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ شادو آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دروازے پر آگئی۔ کمرے کے اندر وہ نہیں تھی۔ اس کا مردہ بچہ ایک چٹائی پر پڑا ہوا تھا۔

اس نے جھجکتے ہوئے کمرے میں قدم رکھا۔ دو چار قدم آگے بڑھی پھر بچے کا چہرہ واضح طور پر نظر آیا تو وہ ٹھٹک گئی۔ وہ مرچکا تھا مگر اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

اور اس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ جیسے فرید کی آنکھیں نیلی تھیں!!

وہ مرجھا گئی اور اس کا دل لرزنے لگا کندن کی کوکھ سے جنم لینے والے بچے نے فرید کی آنکھیں کیسے چرالیں؟

کیا کرم دین کی آنکھیں نیلی ہیں؟

یہ کیسے ممکن ہے کہ فرید اور کرم دین کی پسند بھی ایک...... سرخ گلاب۔

دونوں کی آنکھیں بھی ایک جیسی...... نیلی!

وہ بچے کو یک ٹک دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ آج کی رات وہ ضرور اس گھر میں گزارے گی اور اس کرم دین کو دیکھے گی جو رات کے وقت یا صبح تک یہاں پہنچنے والا ہے۔

دروازے پر آہٹ سنائی دی تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہاں کندن کھڑی اپنے مردہ بچے کو حسرت سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے آہستگی سے کہا۔

"یہ میرا بچہ ہے۔ آج سے چھ دن پہلے جب یہ پیدا ہوا تھا تو قریب کی بستی سے ہماری جان پہچان کی کتنی ہی عورتیں آئی تھیں۔ سب یہی کہتی تھیں کہ بچہ باپ پر گیا ہے اور یہ

پچ ہے۔ بچہ اپنے باپ کی طرح خوب صورت ہے۔ یہ میری طرح نہیں ہے۔ پھر بھی میں فخر کرتی ہوں کہ اتنے خوب صورت بچے کو میں نے جنم دیا ہے۔ جب اس کا باپ اسے دیکھے گا تو مجھ سے زیادہ محبت کرے گا کیونکہ اسے گلاب کا حسن پسند ہے اور میں نے اس کے لیے ایک گلاب کی تخلیق کی ہے۔ مگر افسوس! یہ باپ کی گود میں جانے سے پہلے ہی اس دنیا سے چلا گیا......"

"کیا اس کے باپ نے اسے نہیں دیکھا ہے؟" شادو نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں نے کہا نا! کہ وہ محکمہ زراعت کے کسی افسر سے ملنے گیا ہے۔ مجھ سے کہہ گیا تھا کہ ایک ہفتے کے بعد آئے گا۔ اس کے جانے کے بعد یہ پیدا ہوا اور آج اس کا باپ اسے ایک نظر دیکھ لے اور یقین کرلے کہ میں خوب صورت نہ ہونے کے باوجود اس کے لیے خوب صورت بچے پیدا کر سکتی ہوں۔"

"کون کہتا ہے کہ تم خوب صورت نہیں ہو؟ کیا تمہارا خاوند کہتا ہے؟"

"وہ زبان سے نہیں کہتا مگر میں سمجھتی ہوں، حسین گلابوں کو پسند کرنے والا مجھے اوپری دل سے برداشت کرتا ہے۔ میں سوچتی ہوں اگر دوسرا بچہ باپ کی طرح نہ ہوا، میری طرح ناقابل برداشت ہوا تو کیا ہوگا؟ عورت کی ساری عمر سوچتے گزر جاتی ہے کہ وہ مرد کو کس طرح اپنا دیوانہ بنا سکتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہ بچہ زندہ ہو جاتا۔"

"تمہیں خدا کی مرضی کے خلاف نہیں سوچنا چاہیے۔ مرنے والے دوبارہ زندہ نہیں ہوتے تم ایسی بات نہ سوچو جو ناممکن ہو۔"

"بعض عورتیں ناممکن کو ممکن بنا دیتی ہیں۔" کندن نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "ابھی میں نے کسی کو اطلاع نہیں دی ہے کہ بچہ مرگیا ہے اگر یہاں آس پاس کسی کا مکان ہوتا تو لوگوں کو خود بخود اطلاع پہنچ جاتی۔ میرے آدمی کے کھیتوں میں کام کرنے والے چار مزدور ہیں وہ بھی آج نہیں آئے۔ کسی سے کہتے ہوئے دل دکھے گا کہ اتنی حسین تخلیق ضائع ہو چکی ہے۔ آہ! چھ گھنٹے سے یہ خاموش ہے۔ کچھ بولتا نہیں ہے۔ پلکیں بھی نہیں جھپکتا ہے۔ میں بار بار یہاں آتی ہوں اور اسے دیکھتی ہوں کہ شاید یہ روئے گا اور میری ضرورت محسوس کرے گا۔ تم کیسے کہتی ہو کہ مرنے والے دوبارہ زندہ نہیں ہوتے؟ اس عورت کی آنکھوں میں بیٹھ کر دیکھو جس کا بچہ مرچکا ہے۔ تمہیں وہ مردہ

نظر نہیں آئے گا۔ میں...... میں اس کے باپ کی گود میں اس کا جیتا جاگتا بچہ رکھوں گی۔ اگر میں نے ایسا نہ کیا تو ہمیشہ کے لیے اپنے خاوند کو ہار جاؤں گی۔"

شادو سمجھ گئی کہ بچے کی موت سے اس کے دماغ پر برا اثر پڑا ہے۔ اس لیے وہ بے تکی باتیں کر رہی ہے۔ وہ تھوڑی دیر تک اسے ہمدردی سے دیکھتی رہی پھر سر جھکا کر اپنے بچے کی طرف جانے لگی۔ اپنا بچہ جو زندہ تھا...... بچہ زندہ ہو۔ خوب صورت ہو۔ گلاب کی طرح مسکراتا ہو تو خاوند پہلے سے زیادہ بیوی کی قدر کرنے لگتا ہے۔ کندن ٹھیک ہی کہتی تھی۔

رات اندھیری نہیں تھی جب آسمان کے مشرقی کنارے سے چاند طلوع ہوا تو ایک دم سرخ تھا۔ جیسے کسی کے لہو میں ڈوب کر ابھرا ہو پھر رفتہ رفتہ اس کی رنگت بدلنے لگی جیسے عورت اپنا مزاج بدلنے لگتی ہے۔ جیسے خون آشام فطرت کو چھپا کر اجلی چاندنی کی طرح مسکراتی ہے، اسی طرح چاند اپنی اجلی چاندنی سے مسکراتا ہوا روشن ہوگیا۔

تینوں عورتیں باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے درمیان گندم کی روٹی، اصلی گھی سے بگھاری ہوئی مونگ کی دال اور لہسن مرچ کی چٹنی رکھی ہوئی تھی۔ کندن اور اس کی ماں برابر لقمے چبائے جارہی تھیں۔ شادو کے کھانے کی رفتار سست تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ دو چار لقمے زہر مار کر کے سونے چلی جائے گی۔ اس کا تھکن سے برا حال تھا۔ بھوک سے زیادہ نیند ستا رہی تھی۔

وہ پانی پینے کی بعد اٹھ گئی اور اس کمرے کی طرف جانے لگی جہاں اس کا بچہ سو رہا تھا اور جہاں اسے بھی رات گزارنی تھی۔ دونوں عورتوں نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ اس کی اس پلیٹ کو دیکھ رہی تھیں جو شادو کے سامنے رکھی ہوئی تھی۔ اور اب تقریباً آدھی خالی ہو چکی تھی۔ وہ باورچی خانے سے باہر آئی تو اس کا سر گھومنے لگا شاید تھکن اور نیند کا نشہ غالب آرہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ چاندنی دھوپ کی طرح آنکھوں میں چبھ رہی تھی اور آنگن میں کھلے ہوئے سفید گلاب کے پھول کوڑھ کے داغوں کی طرح لگ رہے تھے۔

وہ چلنے لگی تو پاؤں من من بھر کے ہوگئے۔ وہ لڑکھڑاتی اور سنبھلتی ہوئی دروازے کے نزدیک پہنچی اور نڈھال سی ہو کر دہلیز پر بیٹھ گئی۔ اس میں آگے بڑھنے کی سکت نہیں

رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ وہیں دہلیز پر سو جائے۔ کمرے میں لالٹین کی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس روشنی میں اس کے جگر کا ٹکڑا سو رہا تھا۔ عورت تھک گئی تھی مگر ممتا تازہ دم ہو گئی۔ وہ چوکھٹ کا سہارا لے کر اٹھی اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے بچے کی طرف بڑھنے لگی۔

"کیا ہو گیا ہے مجھے......؟" وہ ڈوبتے ہوئے ذہن سے سوچنے لگی مگر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اچانک ایسی تھکن' یا نیند' یا کمزوری اس پر کیسے غالب آ گئی ہے؟ وہ چارپائی پر گر پڑی۔ ہوش کی دنیا سے جاتے جاتے اس نے کروٹ بدلی اور اپنے ایک بازو کے سائے میں بچے کو چھپا لیا۔

پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ چہرہ ہر قسم کے جذبے سے عاری ہو گیا اور اس کے رس بھرے ہونٹ ذرا کھل گئے جیسے "ربا" کہتے کہتے کھلے رہ گئے ہوں۔

"ربا! میں بہت دور سے آئی ہوں اور اپنے فرید کے لیے بہت دور تک جاؤں گی۔ اگر تیرے خزانے میں میری زندگی کی سانسیں ختم ہو گئیں ہیں تو ہونے دے مجھے ایسی زندگی دے جو سانسوں کی محتاج نہیں ہوتی۔ جیسے سرخ گلاب جو سانسیں نہیں لیتا مگر ہنستا' کھلتا' مسکراتا اور مہکتا رہتا ہے۔

میں اتنی دور اپنے لیے نہیں آئی' فرید کے لیے آئی ہوں۔ اسے سرخ گلاب پسند ہیں۔ تو مجھ سے عورت کی زندگی چھین رہا ہے تو چھین لے مگر ایک گلاب کی زندگی دے دے۔ میں اپنے فرید کو مایوس نہیں کرنا چاہتی۔ میں ہمیشہ اس کی نظروں کے سامنے رہنا چاہتی ہوں۔ تو بہت بڑا ہے اور میری دعا بہت چھوٹی ہے۔ قبول کر لے۔"

جیسے پھول کھلتے ہیں۔ ویسے رس بھرے ہونٹوں کی پنکھڑیاں کھل گئی تھیں۔

آسمان پر چاند چمک رہا تھا مگر ایسا لگ رہا تھا جیسے طلسمی رات کی ہتھیلی پر مردہ کھوپڑی مسکرا رہی ہو۔ اس کی روشنی آنگن میں پھیل رہی تھی۔ اور آنگن کے کچے فرش پر دو چڑیلوں کے سائے تھرکتے ہوئے نظر آ رہے تھے

وہ آپس میں سر جوڑے سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ منہ سے سانسوں کے بھبکے چھوٹ رہے تھے۔ ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے رات کراہ رہی ہو۔ چڑیلیں کالا منتر پڑھ رہی ہوں۔ پھر وہ دونوں دبے پاؤں چلتی ہوئی دروازے پر آئیں اور چوکھٹ کے دونوں

طرف کھڑی ہو کر کمرے میں جھانکنے لگیں۔ کمرے میں لالٹین کی زرد روشنی اونگھ رہی تھی اور گلاب کی کلی اپنی خوشبو کو اپنے بازو میں چھپائے سو رہی تھی۔ وہ دونوں دہلیز پر بیٹھ گئیں۔ ایک بوڑھا جھریوں دار چہرہ تھا جس کے دونوں طرف سفید بال بکھرے ہوئے تھے۔ مردہ کھوپڑی کی طرح اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ اور سامنے کے دو دانت نچلے ہونٹوں میں پیوست ہو گئے تھے۔ وہ دانت کچھ اس طرح نمایاں تھے جیسے خبیث بڑھیا ہنس رہی ہو۔

"ہی ہی ہی۔ بے شک! زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن موت انسان کے ہاتھ میں ہے۔ ایک انسان بڑی آسانی سے دوسرے انسان کو موت کی نیند سلا دیتا ہے۔"

بڑھیا نے دونوں ہتھیلیاں اور گھٹنے زمین پر ٹیک دیے اور چارپائی کی اس سمت رینگنے لگی جدھر بچہ سو رہا تھا۔

دوسری جوان عورت کے بال سیاہ تھے اور چہرے کے اطراف پھیلے ہوئے تھے۔ بال کالے تھے' چہرہ کالا' آنکھیں کالی اور ارادے کالے تھے۔ صرف دانت اجلے تھے اور ان دانتوں کے درمیان ایک خنجر چمک رہا تھا۔ اس نے بھی دونوں ہتھیلیاں اور گھٹنے زمین پر ٹیک دیے تھے اور چارپائی کی اس سمت رینگ رہی تھی جدھر شادو سو رہی تھی۔

ابھی ان کے درمیان دس فٹ کا فاصلہ تھا۔ یہ فاصلہ فوراً ہی طے نہیں ہو سکتا تھا۔ بڑی احتیاط اور ہوشیاری کی ضرورت تھی۔ لالٹین کی روشنی سے چھپ کر اور دھیمی سانسوں کا گلا گھونٹ کر بہت آہستہ آہستہ چارپائی تک پہنچنا تھا۔ موت کا یہی دستور ہے۔ وہ ہمیشہ آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی زندگی تک پہنچتی ہے۔

ابھی ذرا دیر تھی۔ اتنی دیر میں دانتوں کے درمیان چمکتے ہوئے خنجر کی تیز دھار نے

[illegible]

"میری خوب صورت سوتن! میرے خاوند کا نام کرم دین نہیں فرید احمد ہے۔ وہی فرید احمد' جس کی آنکھیں نیلی ہیں...... اور جسے سرخ گلاب پسند ہیں۔ اور تو اپنے لباس کی پنکھڑیوں میں سمٹی ہوئی گلاب کی کلی بن کر یہاں آئی ہے۔ کہاں سے یہ حسن چرا کر لائی ہے؟ جب تو بچے کو دودھ پلا رہی تھی تو میں نے تیرے چاندی جیسے بدن کی چکناہٹ دیکھی اور اسے دیکھ کر سمجھ گئی تھی کہ فرید ہر چار پانچ ماہ کے

بعد جڑا نوالہ کیوں جاتا ہے۔ وہ تیرے پاس جاتا ہے۔ حرام زادی! میں تیرے مکھن جیسے جسم کی بوٹی بوٹی کاٹ کر پھینک دوں گی۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری......"

کمرے کے کچے فرش پر اس کا سایہ گھٹنوں کے بل رینگتا ہوا چارپائی کے قریب پہنچ رہا تھا۔ بوڑھی عورت بھی گھٹنوں کے بل بچے کے قریب پہنچ رہی تھی۔ اس کے لانبے نوکیلے دانت ہونٹوں سے باہر نکل کر کہہ رہے تھے۔

"ڈائن اپنے داماد اور اس کے بچے کو کبھی نہیں کھاتی۔ وہ بچہ جو سو رہا ہے' وہ میری بیٹی کی سوت کا ہے مگر میری بیٹی کے خاوند کا بھی ہے۔ سوت مرجائے گی تو بچہ میری بیٹی سے منسوب ہو جائے گا کیونکہ میرے داماد کا بچہ کسی کی بھی کوکھ سے جنم لیتا' وہ ایسا ہی خوب صورت ہوتا۔" اور اس کی آنکھیں نیلی ہوتیں۔ عورت اپنے مرد کو صرف زلف کی زنجیر سے ہی نہیں' اولاد کی محبت سے بھی باندھ کر رکھتی ہے اور اس کی نظروں میں اپنی اہمیت بڑھاتی ہے اور اسے یقین دلاتی ہے کہ وہ آیندہ بھی ایسے شاہکار پیدا کرتی رہے گی۔

میری بیٹی نے جو بچہ جنا تھا' وہ صبح مرگیا۔ یہ درست ہے کہ مرنے والے دوبارہ زندہ نہیں ہوتے مگر وہ بچہ اب زندہ ہو جائے گا۔ سوت کی گود سے نکل کر میری بیٹی کی گود میں آجائے گا۔ بعض عورتیں ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہیں......"

چار ہتھیلیاں فرش پر سرکتی ہوئی' چار گھٹنے اپاہجوں کی طرح گھسٹتے ہوئے۔ کبڑی چڑیلیں جھکی ہوئی اور بے رحم موت دانت کچکچاتی ہوئی معصوم زندگیوں کے قریب پہنچ گئیں۔

بڑھیا نے بچے کو اٹھایا۔ ممتا کے سائے سے محروم کیا تو وہ اچانک رونے لگا۔

پھر چارپائی پر ہلچل سے مچ گئی۔

"چوں چراں...... چوں چراں......" چارپائی چیخ رہی تھی' احتجاج کر رہی تھی۔ بچہ رو رہا تھا' ممتا کی حرارت کے لیے مچل رہا تھا۔ بڑھیا اسے بازوؤں میں سمیٹے دیوار سے جا لگی تھی اور دیدے پھاڑے وحشت زدہ نظروں سے صید و صیاد کا جنگی تماشا دیکھ رہی تھی۔ تماشہ سامنے بھی تھا اور اس کے پیچھے دیوار پر بھی تھا۔ سینما کے اسکرین کی طرح' دیوار کی اسکرین پر دو سائے گتھم گتھا نظر آرہے تھے۔ خنجر کا سایہ بلند ہو رہا تھا اور نیچے دبے ہوئے سائے میں ڈوب رہا تھا۔ آہیں' کراہیں بچے کی چیخیں۔ رات کا سناٹا لرز رہا

تھا۔ چارپائی تھرا رہی تھی۔ زندگی پھڑپھڑا رہی تھی۔ پھر ایک آواز ایک آخری چیخ۔

"ربا۔ آ۔ آ۔ آ۔ آ......"

اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔ بڑھیا ننھی سی جان کو لے کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

صبح کاذب کی دھندلی روشنی آنگن میں اتر رہی تھی۔ ڈربے کے اوپر مرغ بانگ دے رہا تھا۔ آنگن پر سایہ کرنے والے درخت پر پرندے شور مچا رہے تھے اور اپنے گھونسلوں سے جھانک کر دونوں ماں بیٹی کو دیکھ رہے تھے؟ وہ دونوں کنویں کے اس پار اکڑوں بیٹھی ہوئی زمین ہموار کر رہی تھیں اور گلاب کے اکھڑے ہوئے ہوئے پودوں کو از سر نو ان کی جگہ ایستادہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

جب تمام پودے اپنی اپنی جگہ استحکام سے کھڑے ہو گئے تو بڑھیا ان کی جڑوں میں پانی ڈالنے لگی۔ کندن نے منہ ہاتھ دھو کر بچے کو گود میں لے لیا اور کنویں کے چبوترے پر اطمینان سے بیٹھ کر گلاب کے پھولوں کو دیکھنے لگی۔ بڑھیا نے اپنی بیٹی کی جانب دیکھا پھر ایک پودے کے پاس زمین پر پاؤں مار کر بولی۔

"جس کا بچہ زندہ تھا' وہ مردہ بچے کے ساتھ یہاں سو رہی ہے۔"

کندن نے اپنی گود کے بچے کو چوم کر کہا۔ "گلاب گونگے ہوتے ہیں وہ کسی کو کچھ نہیں بتا سکیں گے کہ کس کی چھاتی پر کھل رہے ہیں۔ مگر ماں جی! یہ تمام پودے جڑ سے اکھاڑ دیے گئے تھے۔ اب انہیں دوبارہ لگانے کے بعد کیا ان میں پھول کھلیں گے؟"

"پتہ نہیں۔ میں نے باغبانی کبھی نہیں کی۔ میں پھولوں اور پودوں کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔ میں روزانہ ان کو پانی دوں گی۔ کچھ روز بعد ہی پتہ چلے گا کہ پھول کھلیں گے یا پودے مرجائیں گے۔"

"پودوں کو زندہ رکھنا چاہیے ماں جی! فرید گلابوں کا شوقین ہے اگر یہ مرجھا گئے تو وہ ناراض ہوگا کہ میں نے اچھی طرح ان کی نگہداشت نہیں کی تھی۔"

"ہی ہی ہی۔ تو پگلی ہے۔ اری۔ تیری گود میں ایسا گلاب کھل رہا ہے جسے دیکھ کر فرید دوسرے تمام گلابوں کو بھول جائے گا۔ جا اب آرام سے جا کے سو جا۔ میں بھی ذرا اپنی کمر سیدھی کروں گی۔"

کندن بچے کو لے کر اپنے کمرے میں آگئی' اس کمرے میں جہاں پچھلی رات بچہ اپنی

ماں کے ساتھ سویا تھا۔ اب وہ چارپائی اور بستر دھل گئے تھے اور باہر آنگن میں ڈال دیے گئے تھے تاکہ دھوپ نکلنے پر سوکھ جائیں۔ کمرے میں دوسری منجھی اور بستر آگیا تھا۔ فرش کو مٹی سے لیپ کر تمام سرخ دھبے مٹا دیے گئے تھے۔ اب وہاں کسی اجنبی عورت کی آمدورفت کا کوئی نشان باقی نہ تھا۔ نشانی کے طور پر ایک بچہ تھا جو بول نہیں سکتا تھا۔

بچہ پھر بھی بچہ ہوتا ہے۔ اسے دوسری چھاتیوں سے دودھ مل رہا تھا۔ بڑے بڑوں کو اصلی دودھ نہیں ملتا اس لیے وہ بے چارہ بھی نقلی دودھ سے بہل رہا تھا۔

صبح فصل کی کٹائی کرنے والے مزدور آئے۔ گھر سے درانتیاں لے جاتے وقت انہوں نے بچے کو دیکھا' مسکرائے اور خاموشی سے چلے گئے۔ بھینسوں کا دودھ دوہنے والا بھی آیا۔ وہ باہر دروازے سے ہی برتن مانگتا تھا اور دوہنے کے بعد بھرے ہوئے برتن دروازے پر رکھ کر چلا جاتا تھا۔ اس روز کندن نے دانستہ اسے گھر میں بلایا کہ وہ اندر آکر برتن رکھ جائے۔ گوالے نے پیدائش کے روز اس کے بچے کو ایک بار دیکھا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ آج اس دوسرے بچے کو دیکھ کر وہ اپنی کوئی رائے پیش کرے لیکن اس نے بھی کچھ نہیں کہا' اپنے مالک کے بچے کو دیکھ کر محبت سے مسکرایا اور چلا گیا۔

شام کو قریبی بستی سے دو عورتیں ملنے آئیں۔ یہ وہی عورتیں تھیں جو کندن کی زچگی کے وقت آئی تھیں۔ ایک عورت نے اسے بڑے پیار سے چوم کر کہا۔

"آہا۔ کتنا پیارا بچہ ہے۔ جب پیدا ہوا تھا تو ایسا نہیں تھا۔ کچھ دبلا سا تھا۔ ماشاء اللہ سات دنوں میں کیسے ہاتھ پاؤں نکالے ہیں۔"

دوسری عورت نے کہا۔ "ماں کا دودھ اچھا ہو اور پوری طرح بچے کی نگہداشت ہوتی رہے تو بچہ کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ دیکھو نا' بدن میں ذرا گوشت بھرا ہے۔ گال پھولے ہیں تو ناک پکوڑا ہو گئی ہے۔"

پکوڑا کہنے پر عورتیں ہنسنے لگیں۔ ایک نے کہا۔

"ہاں موٹاپے کی وجہ سے بڑا فرق ہو گیا ہے۔ یعنی پہلے سے زیادہ خوب صورت ہو گیا ہے۔ کندن! اسے اور زیادہ خوب صورت نہ بنانا۔ ایسا نہ ہو کہ آئندہ ہم یہاں آئیں تو پہچان ہی نہ سکیں۔"

کندن ہنستے ہوئے بولی۔ خوب سے خوب بنانا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ یہ تو

قدرت کے کھیل ہیں اور جہاں تک پہچاننے کا تعلق ہے' میں تو یہ کہوں گی کہ انسان بوڑھا ہو یا بچہ' وہ اپنی آنکھوں سے پہچانا جاتا ہے۔ جب یہ پیدا ہوا تھا تو تم نے کہا تھا کہ اس کی آنکھیں نیلی ہیں دیکھو آج بھی وہی آنکھیں ہیں۔"

"سچ کہتی ہو۔ کبھی موٹاپے یا بیماری سے انسان میں بڑی تبدیلیاں آجاتی ہیں لیکن آنکھوں کی رنگت کبھی نہیں بدلتی۔ خدا اسے نظر بد سے بچائے رکھے۔ یہ بالکل اپنے باپ پر گیا ہے۔"

کندن دل ہی دل میں بہت خوش ہو رہی تھی کہ بچہ اسی سے منسوب ہو رہا ہے۔ بڑھیا بھی خوش ہو کر ان عورتوں کی تواضع کے لیے دودھ لانے باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ ایک عورت نے کہا۔

"ہاں۔ اس کے باپ کے ذکر پر یاد آیا۔ اب اس کی سزا کتنی رہ گئی ہے؟"

"تین ماہ کی قید کی سزا سنائی گئی تھی' ایک مہینہ گزر گیا ہے' دو ماہ کے بعد وہ شیر کی طرح دھاڑتا ہوا آجائے گا۔ میرے مرد کے نام سے آس پاس کے تمام زمیندار تھراتے ہیں۔"

"یہ تو سچ ہے مگر اب اسے سمجھاؤ کہ اور خون خرابہ نہ کرے۔ اب وہ صاحب اولاد ہو گیا ہے۔ بیوی بچے چھوڑ کر جیل میں زندگی گزارنا اچھی بات نہیں ہے۔

کندن نے کہا۔ "میں کیا سمجھاؤں بہن! وہ بڑا ضدی ہے۔ کسی بات پر اڑ جائے تو پھر کوئی اسے سمجھا نہیں سکتا اور سچ پوچھو تو غلطی اس کی نہیں تھی۔ رحیم کوٹ کا زمیندار ہمارا پانی کاٹ کر اپنے کھیتوں میں لگا رہا تھا۔ بس اسی پر فرید کو طیش آگیا۔ اس نے زمیندار کے آدمی کو مار مار کر اسپتال پہنچا دیا اور خود تین ماہ کے لیے جیل چلا گیا۔"

اتنے میں بڑھیا گلاسوں میں دودھ لے آئی۔ عورتوں کے ہاتھوں میں دودھ کا گلاس آیا تو پھر دودھ پر ہی باتیں شروع ہو گئیں۔ عورتوں کے پاس باتیں کرنے کے لیے موضوعات کی کمی نہیں ہوتی۔ پیٹ بھر کر باتیں کرنے کے بعد وہ اندھیرا ہونے سے پہلے ہی بستی کی طرف واپس چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد بڑھیا نے اطمینان کی سانس لے کر کہا۔

"اب کسی بات کا اندیشہ نہیں ہے۔ جن عورتوں نے پہلے دن بچے کو گود میں لیا تھا وہ

آج اسے دیکھ کر پہچان نہ سکیں۔ بچے کا رنگ وہی ہے' آنکھیں وہی ہیں۔ صرف چہرہ ذرا سا مختلف ہے لیکن ایسا بھی فرق نہیں کہ عورتیں اسے فرید کی اولاد تسلیم کرنے سے انکار کر دیتیں۔ یہ فرید کا ہے۔ فرید کا ہی سمجھا جائے گا۔ گوالے اور کھیت مزدوروں نے ہمارے بچے کو گود میں لے کر قریب سے نہیں دیکھا تھا اس لیے ان کے فرشتوں کو بھی شبہ نہیں ہوگا۔"

کندن نے خوش ہو کر بچے کو سینے سے لگا لیا۔ وہ سوتن کا بیٹا تھا مگر خاوند کو اپنے آنچل سے باندھ کر رکھنے کے لیے وہ سگے بیٹے کا کردار بننے والا تھا۔ اس لیے وہ سگوں سے زیادہ سگا اور عزیز تھا۔

دوسرے دن ماں بیٹی نے آنگن میں آکر دیکھا۔ پچھلے دنوں جو پھول کھلے تھے۔ وہ اب مرجھا رہے تھے۔ کسی بھی پودے میں ایک بھی نئی کلی نظر نہیں آرہی تھی۔ کندن نے پریشان ہو کر کہا۔

"ماں جی! یہاں گلاب کھلنے چاہئیں ورنہ فرید بگڑ جائے گا کہ میں نے اس کے لگائے ہوئے پودوں کی حفاظت نہیں کی۔ اگر ایک آدھ پودا مرجھاتا تو کوئی بات نہ تھی مگر یہ تو سب کے سب مرجھا رہے ہیں۔"

بڑھیا نے تشویش سے کہا۔ "پتہ نہیں کیا بات ہے انسان کی کھاد ملنے سے یہ مرجھا گئے ہیں۔ ویسے بھی میں نے کبھی نہیں سنا کہ پودے کسی انسانی لہو سے سینچے گئے ہوں۔"

"سننے کی کیا بات ہے؟" کندن نے کہا۔ "ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ قبروں کے سرہانے خوب پھول کھلتے ہیں' وہاں بھی انسان کے گوشت اور لہو کی کھاد ہوتی ہے؟"

بڑھیا نے قائل ہو کر سر ہلایا۔ "ہاں..... وہ جانتے ہوں گے کہ پودے مرجھا جائیں تو کیا کرنا چاہیے۔"

اگلے روز کندن اور بڑھیا کے کہنے پر ایک مزدور کنویں کے اس پار گیا۔ گلاب بالکل مرجھا گئے تھے۔ پتیاں بھی کہیں کہیں سے سوکھتی جارہی تھیں۔ وہ پودوں سے ہری شاخیں کاٹ کر نئے سرے سے گلاب کی قلمیں لگانے لگا۔

دو گھنٹے کی محنت کے بعد نئی قلمیں لگ گئیں اور پرانے پودے نکال کر پھینک دیے گئے۔ اب وہاں کی زمین ننگی ہو گئی تھی۔ صرف پتلی پتلی ہری شاخیں بھربھری مٹی میں

دھنسی ہوئی نظر آتی تھیں۔ کچھ دیر پہلے وہاں پر پودے تھے۔ وہ بے شک مرجھائے ہوئے تھے مگر ان کے جرم کو چھپانے کے لیے زمین کو اپنی شاخوں اور پتیوں سے ڈھانپے ہوئے تھے۔

مزدور اس زمین کو پانی سے سینچ کر چلا گیا۔ دونوں ماں بیٹی بہت دیر تک وہاں کھڑی رہیں اور متوحش نظروں سے یوں دیکھتی رہیں جیسے وہ زمین ابھی ایک تعویز کی طرح کھلے گی اور وہاں سے سرخ لباس کی پنکھڑیوں میں سمٹی ہوئی گلاب کی کلی ابھر کر ان کے سامنے آجائے گی اور دونوں ہاتھ پھیلا کر کہے گی۔

"لاؤ میرا بچہ واپس کردو۔ میں محبت کا وہ ننھا سا حسین تحفہ اپنے فرید کو پیش کروں گی۔"

کندن گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ بڑھیا بھی تصور میں وہی منظر دیکھ رہی تھی۔ اس نے بیٹی کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر لرزتی ہوئی آواز میں اسے تسلی دی۔

"بیٹی گھبراؤ نہیں کچھ دنوں کی بات ہے۔ پھر یہاں نئی کونپلیں پھوٹیں گی' شاخیں پھیلیں گی' پتیاں بکھریں گی اور یہ زمین چھپ جائے گی۔

بالکل چھپ جائے گی۔ اور پھول کھل جائیں تو ان کی رنگینیوں کی تہہ میں کسی کا لہو نظر نہیں آتا۔ گھبراؤ نہیں بیٹی! وہ اب تک کیڑوں کی خوراک بن چکی ہوگی....."

پھر دن گزرنے لگے۔ مزدور صبح و شام آکر گلاب کی پتلی پتلی شاخوں کو پانی دیتا تھا۔ پہلے پہلے کچھ پتہ نہ چلا' ماں بیٹی مایوس ہو رہی تھیں کہ وہ تراشیدہ شاخیں گل نہیں کھلائیں گی۔ پھر ایک صبح ان میں روئیدگی کے آثار نظر آئے۔ محنت رائگاں نہیں گئی۔ رفتہ رفتہ شاخوں سے شاخیں پھوٹنے لگیں۔ سبز ملائم پتیاں آنکھیں کھولنے لگیں۔ پودے اونچے ہونے لگے۔ کندن کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اس نے فرید کے لگائے ہوئے پودوں کو بحال کر دیا تھا۔ زمین کا وہ حصہ چھپ گیا تھا۔ ان کے جرم پر سرسبز و شاداب پودوں کا پردہ پڑ گیا تھا۔ وہ روز صبح اٹھ کر دیکھتی تھی۔ اب کتنی ہی شاخوں میں کلیاں نظر آنے لگی تھیں۔

ٹھیک ہے کہ تمام ثبوت مر گئے تھے۔ کوئی ان پر انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا لیکن ان کی خوشیاں دیرپا نہیں تھیں۔ ایک صبح انہوں نے کنویں کے اس پار دیکھا تو ان کے کلیجے

دھک سے رہ گئے۔

وہاں جتنی بھی کلیاں تھیں' ان کے منہ ذرا سے کھل گئے تھے اور ہر ایک کے منہ پر لہو کی سرخی جھلک رہی تھی۔

ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جہاں تک پودے نظر آ رہے تھے۔ وہاں تک خون کے چھینٹے پھیلے ہوئے تھے۔ وہ مرنے والی ان کلیوں کے کنوارے لبوں پر اپنے لہو کو قطرہ قطرہ تقسیم کر رہی تھی۔ وہ دونوں لرزتے ہوئے قدموں سے جھجکتی ہوئی ذرا قریب آ کر دیکھنے لگیں۔

"کیا ہو گیا۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ ماں جی...... اس کا خون چغلی کھا رہا ہے۔"

"نن...... نہیں بیٹی! ہوش کی باتیں کرو۔ یہ خون نہیں ہے۔ یہ سرخ کلیاں ہیں۔"

"ہاں وہ سرخ کلیاں تھیں۔ شام کو وہ ذرا اور کھل گئیں اور دوسری صبح پھول بن گئیں۔ سرخ گلاب کے پھول۔ جیسے وہ پھول نہیں تھے' شادو کا سرخ پیراہن تھا اور وہ اس پیراہن میں چھپی ہوئی یہاں کھل رہی تھی' مسکرا رہی تھی' خوشبو لٹا رہی تھی' شاخوں کے جھولے پر جھول رہی تھی......"

کندن بوکھلائی ہوئی ادھر ادھر بھاگ رہی تھی۔ کبھی کنویں کے پاس بیٹھتی تھی۔ کبھی اٹھ کر دور چلی جاتی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ کتنے پھولوں کو قتل کرے؟ کتنوں کو دفن کرے؟ دفن کرے گی اتنے ہی پھول اور کھلیں گے۔ جو چپ رہے گی زبان خنجر' لہو پکارے گا آستین کا۔ شادو مٹی کی تہ سے پکار رہی تھی۔

آہ! اب وہ ان پودوں کو اکھاڑ کر نہیں پھینک سکتی تھی۔ فرید کی سزا کی معیاد پوری ہو چکی تھی۔ وہ کسی بھی دن وہاں پہنچ سکتا تھا۔ وہ بڑے فخر سے یہ کہنا چاہتی تھی کہ دیکھو فرید' میں نے تمہارے لگائے ہوئے پودوں کی حفاظت کی ہے مگر..... مگر......جہاں سفید گلاب کھلتے تھے۔ وہاں سرخ گلاب کیسے کھل رہے ہیں؟

کیسے کھل رہے ہیں؟ اس کا جواب پودے' مٹی اور کھاد کے رشتے ہی دے سکتے ہیں یا پھر شادو کی خاموش دعا کچھ کہہ سکتی ہے۔

"ربا! مجھے ایسی زندگی دے جو سانسوں کی محتاج نہیں ہوتی۔ جیسے سرخ گلاب' جو سانس نہیں لیتا مگر ہنستا' کھلتا' مسکراتا اور مہکتا رہتا ہے۔ تو مجھ سے عورت کی زندگی چھین

رہا ہے تو چھین لے مگر ایک گلاب کی زندگی دے دے۔ میں اپنے فرید کے سامنے ہمیشہ مسکرانا چاہتی ہوں۔ ربا' تو بہت بڑا ہے اور میری دعا بہت چھوٹی ہے۔ قبول کر لے......"

اور وہ لہو کے گلاب مسکرا رہے تھے۔

○☆○

وہ جیل سے رہا ہو کر ایگریکلچر ڈیپارٹمنٹ کے ایک دفتر میں آیا۔ وہاں اس نے اپنے ایک دوست ظفر علی کے پاس پانچ سو روپے رکھوائے تھے۔ وہ جیل سے خالی ہاتھ نکلا تھا۔ لہٰذا اسے روپے کی ضرورت تھی۔ ظفر علی بڑے تپاک سے ملا اور اسے اپنے گھر لے گیا۔ فرید نے اس سے کہا۔

"ظفر! میں یہاں زیادہ دیر رکنا نہیں چاہتا ابھی دوپہر کی ٹرین سے لاہور جاؤں گا۔"

"لاہور؟" اس نے تعجب سے کہا۔ تین ماہ بعد جیل سے رہا ہو کر آ رہے ہو۔ وہاں عثمان گوٹھ میں تمہاری بیوی تمہارا انتظار کر رہی ہوگی اور تم لاہور جانا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔ وہاں بھی کسی کو میرا انتظار ہوگا۔" فرید نے سر جھکا کر ندامت سے کہا۔

"میں اس پر ظلم کر رہا ہوں۔ میں اپنے آپ پر ظلم کر رہا ہوں۔ اب یہ سلسلہ ختم ہو جانا چاہئے۔ اسی لیے میں لاہور جانا چاہتا ہوں۔ لاہور سے جڑانوالہ جاؤں گا اور اسے ساری حقیقت بتادوں گا۔ بتاؤں گا نہیں بلکہ اسے اپنے ساتھ عثمان گوٹھ لے آؤں گا۔ وہاں پہنچ کر اسے پتہ چل جائے گا کہ میں نے دوسری شادی کر لی ہے۔"

"دوسری شادی؟" ظفر نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا تم نے جڑانوالہ میں دوسری شادی کی ہے؟"

"نہیں۔ وہ میری پہلی شادی تھی۔ شادو میری پہلی بیوی ہے۔ سنا تھا کہ شادی کے بعد عورت رسمی طور پر بیوی بن کر رہ جاتی ہے۔ اس میں پہلی جیسی محبوبیت نہیں رہتی لیکن وہ اتنی اچھی اتنی حسین اور محبت کی ماری ہے کہ میں آج بھی ایک عاشق کی طرح اس کے لیے تڑپتا رہتا ہوں۔"

تم نے پہلے اس کا ذکر نہیں کیا؟ مجھ جیسے دوست سے بھی یہ بات چھپانے کا مطلب یہ ہے کہ شادو کے پیچھے کوئی گہرا راز ہے۔"

"کوئی راز نہیں ہے۔ وہاں لاہور میں' میں بڑے فخر سے کہا کرتا تھا کہ مجھے شادو

جیسی بیوی ملی ہے مگر جب سے عثمان گوٹھ میں دوسری شادی کی ہے' اس وقت سے میں خود کو مجرم سمجھ رہا ہوں۔ کیا شادو جیسی محبت کرنے والی حسین اور وفا شعار بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کرنا جرم نہیں ہے؟"

"تو پھر تم نے ایسا کیوں کیا؟"

وہ سرد آہ بھر کر بولا۔ "یا یہ سمجھ لو کہ انسان اپنی زندگی میں کبھی کبھی زبردست حماقتیں کرتا ہے۔ مجھ سے بھی یہ حماقت ہو گئی۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھ سے ایسی غلطی ہو جائے گی۔"

"جب شادو میری دلہن بن کر آئی تھی تو ان دنوں میں بہت غریب تھا۔ آمدنی کا کوئی معقول ذریعہ نہ تھا۔ مل گئی تو روزی' نہیں تو روزہ رکھنے والی بات تھی۔ شادو نے میرے ساتھ رہ کر دو دو چار چار وقت کے مسلسل فاقے کئے ہیں۔ یہ سوچ کر مجھے ندامت سی ہوتی ہے کہ وہ میرے برے وقتوں کی ساتھی تھی اور اچھا وقت آیا تو میں اسے اپنے سے جدا رکھتا ہوں کہ کہیں اس پر دوسری شادی کا بھید نہ کھل جائے۔ میں ڈرتا ہوں کہ وہ میری غربت کو تو برداشت کر سکتی ہے لیکن میری بے وفائی کا صدمہ برداشت نہیں کرے گی۔

مفلسی کے دنوں میں ہمارے خواب ایک جیسے تھے۔ ہم دونوں سوچتے تھے کہ کبھی ہمارے دن بھی پھریں گے۔ ہمارا ایک چھوٹا سا مکان ہو گا اور اس کے آنگن میں گلاب کھلیں گے' سرخ گلاب کے پھول۔ مجھے سرخ گلاب پسند ہیں۔ آج بھی جب وہ سرخ لباس پہنتی ہے تو اس گلاب سے مکھڑے کو دیکھ کر میرے خواب پورے ہو جاتے ہیں۔

پھر مجھے زمینیں حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ محکمہ زراعت سندھ کے افسران نے ایک اسکیم بنائی کہ غلام محمد بیراج اور سکھر بیراج سے نہریں نکال کر دور افتادہ علاقوں تک پہنچائی جائیں تو سندھ کی بنجر زمینیں قابل کاشت بنائی جا سکتی ہیں۔ حکومت نے اعلان کیا کہ ان علاقوں میں ہل چلانے والے کسانوں کو مفت زمینیں دی جائیں گی۔

وہ بنجر زمینیں جو صدیوں سے پیاسی تھیں جہاں کبھی سبزہ نہیں اگتا تھا۔ وہاں کی دھرتی پر ہل چلانا اور فصل اگانا جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔ تم اس محکمے میں ہو۔ تم جانتے ہو کہ آج بھی یہ کسان ان علاقوں میں کس طرح اپنا خون پسینہ ایک کر رہے ہیں۔

مجھے بھی اپنے حوصلے کو آزمانے کا موقع ملا۔ میں شادو کو اس کے میکے میں چھوڑ کر یہاں آ گیا یہاں عثمان گوٹھ میں زمین مل گئی۔ میری زمینوں کے ساتھ جو دوسری زمینیں تھیں وہ بورے والا کے ایک بوڑھے زمیندار رحیم بخش کو ملی تھیں۔ وہ بوڑھا اپنے جوان بیٹے کے ساتھ کھیتی باڑی کے لیے آیا تھا۔ اس کی بدقسمتی تھی کہ چھ ماہ کے بعد اس کا جوان بیٹا مر گیا۔

میں نے بوڑھے رحیم بخش کو تسلی دی کہ وہ حوصلہ نہ ہارے۔ میں اس کے کھیتوں کا کام سنبھال لوں گا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ ہمدردی مہنگی پڑے گی۔ میں نے پوری دیانت داری سے اس کا کام سنبھالا۔ کھیت مزدوروں کے ساتھ مل کر دن رات محنت کی۔ وہاں کی مٹی کو ہلوں اور مزدوروں کی محنتوں سے آشنا کیا۔ کھیت جاگے' فصلیں جوان ہوئیں' آمدنی بڑھی۔ میں نے رہائش کے لیے ابھی مکان نہیں بنایا تھا ورنہ شادو کو اپنے پاس بلا لیتا۔ لیکن اسے زیادہ سے زیادہ پیسے بھیجتا رہا۔ سال میں دو ایک بار ملنے چلا جاتا تھا۔ بوڑھے رحیم بخش نے اپنا مکان بنوا لیا تھا اس لیے اس نے اپنی بیٹی اور بیوی کو اپنے پاس بلا لیا۔

وہی بیٹی جو آج میری دوسری بیوی ہے۔

میں نے کبھی رحیم بخش کے سامنے شادو کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ بوڑھا تھا اور میں جوان۔ ایک بوڑھے کے سامنے اپنی جوان بیوی کی داستان لے کر بیٹھنا حماقت تھی اور جب اس گھر میں ایک جوان لڑکی آئی تو میں مزید حماقتوں میں مبتلا ہو گیا۔ لڑکی بے باک تھی گرم گرم نگاہوں سے دیکھتی تھی' مسکراتی تھی' کبھی موقع ملے تو چھیڑ کر گزر جاتی تھی۔ میں دن بھر کی محنت سے تھکا ہوا آتا تھا۔ شادو سے سیکڑوں میل دور تھا۔ ادھر کندن اپنی اداؤں اور معنی خیز اشاروں سے کچھ سمجھاتی تھی اور میں سمجھ جاتا تھا۔

لیکن میں سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔ میرے سمجھنے کے لیے جڑانوالہ میں شادو موجود تھی۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ضرورتیں بڑھ جاتی ہیں۔ ایسے حالات میں آدمی کچھ زیادہ ہی سمجھنا چاہتا ہے' عقلی طور پر نہیں جذبات کی آنچ پر جو بہت تیز ہوتی ہے۔ فولاد کو بھاپ بنا کر اڑا دیتی ہے۔ میں بھی فولاد کی طرح پگھل گیا تھا۔

○☆○

چنانچہ جب وقت گزر گیا۔ جب جذبات سرد پڑ گئے تو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ تب

دیر ہو چکی تھی۔ رحیم بخش نے بھی فولاد کے پگھلنے کا تماشا دیکھ لیا تھا

اب یہ کہنے کا وقت نکل چکا تھا کہ میں شادی شدہ ہوں اور وہ بھی میری یہ بات سننے کے مقام سے آگے نکل چکا تھا۔ بوڑھے نے سر جھکا کر کہا۔

میں نے کھیت تمہارے حوالے کر دیے' بیٹی بھی تمہارے حوالے کرنے والا تھا۔ بہر حال اس سلسلے میں بات بڑھانا دانش مندی نہیں ہے۔ اس میں ہم سب کی بد نامی ہے۔ کل تم دونوں کا نکاح پڑھا دیا جائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ بڑھیا بھی چلی گئی۔ اس کی بیٹی بھی چلی گئی اور میں تنہا ایک مجرم کی طرح بیٹھا رہ گیا۔ چوری پکڑی گئی تھی اس لیے میں بوڑھے کے فیصلے سے انکار نہ کر سکا۔

اب کندن میری بیوی ہے۔ یہ بات میں آج تک شادو کو نہ بتا سکا۔ کئی بار بتانے کی کوشش بھی کی مگر اس کی محبت اس کی معصومیت اور اس کا بے پناہ اعتماد دیکھ کر میں چوروں کی طرح چپ سادھ لیتا ہوں۔ وہ ضد کرتی ہے کہ میں اسے اپنے ساتھ یہاں لے آؤں لیکن میں بہانے کرتا ہوں' باتیں بناتا ہوں کہ یہاں کی آب و ہوا اچھی نہیں ہے۔ پانی کی قلت ہے۔ کھانے پینے کی چیزیں میلوں دور سے لانا پڑتی ہیں۔ آس پاس کوئی مکان نہیں ہے چور ڈاکوؤں کا خطرہ رہتا ہے۔ ایسی صورت میں' میں اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔

بارہا سمجھانے کے باوجود وہ بضد ہے کہ میرے ساتھ رہے گی۔ پچھلی بار جب اس سے مل کر آیا تو یہ وعدہ کیا تھا کہ چار ماہ کے بعد اسے بلا لوں گا۔ ایک ماہ کے بعد اس کا خط آیا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ اسے کچھ دن اور ٹالنے کا بہانہ مل گیا۔ میں نے لکھ دیا کہ زچگی کے بعد میں اسے لے آؤں گا۔ میں بہت مجبور ہو کر اسے ٹال رہا تھا مگر اب میری بے چینی بڑھ گئی تھی۔ ایک تو شادو کی محبت ہی کچھ کم نہ تھی۔ دوسرے اب وہ میرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ اس طرح وہ میری محبت کو میری آئندہ نسل تک پہنچا رہی تھی۔ اس بار میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس کی زچگی کے بعد اسے ضرور یہاں لے آؤں گا اور یہ بات میں نے کندن کو بتا دی۔ اپنی سوکن کا ذکر سن وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ اس کی بوڑھی ماں نے مجھے برا بھلا کہتے ہوتے ہوئے یہ بات بتائی کہ کندن بھی ماں بننے والی ہے۔ ایسی حالت میں اسے صدمہ پہنچانے والی باتیں نہیں کرنا چاہئیں۔ کندن کا باپ

رحیم بخش چھ ماہ پہلے اس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ دونوں ماں بیٹی میرے رحم و کرم پر ہیں۔ میں نے انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ ایسے وقت عورت پر رعب جما کر ہی اسے مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی سوکن کو برداشت کر لے۔ میں جانتا ہوں' شادو بھی اسی طرح روئے گی پھر حالات سے سمجھوتہ کر لے گی۔ میری کمزوری صرف اتنی سی ہے کہ میں شادو کے آنسو نہیں دیکھ سکتا۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ ظفر علی نے کہا۔

"شادو کے آنسو تو دیکھنے ہی پڑیں گے۔ غلطی تم نے کی ہے۔ زندگی بھر رونے کی سزا اسے ملے گی۔"

"خدا نہ کرے کہ اسے میری غلطی کی سزا ملے۔ میں اسے کسی نہ کسی طرح منا لوں گا۔"

وہ اپنی نگاہوں کے سامنے شادو کی تصویر بنانے لگا۔ کاجل بھری کٹورا سی آنکھیں' دودھ جیسے اجلے چہرے پر چھلکتی ہوئی گلابی رنگت' لبوں کی لالیاں سنہری زلفیں شانوں پر چھلکنے کے لیے لہرا رہی تھیں۔ جتنے رنگ گلاب کے پھولوں میں نہیں ہوتے' اتنے رنگ اس ایک حسینہ میں سمٹ آئے تھے۔

"شادو میری گلاب کی کلی! تم عثمان گوٹھ آؤ گی تو میں تمہیں دکھاؤں گا کہ میں نے آنگن میں گلاب کے پودے لگائے ہیں مگر وہاں سفید گلاب کھلتے ہیں۔ تم آؤ گی تو ان گلابوں میں شاید تمہارے شہابی وجود کی رنگت گھل جائے گی......"

وہ رنگت گھل چکی تھی اور وہ سوچنے والا خیال ہی خیال میں اسے اس آنگن تک بلا رہا تھا جہاں وہ پہلے ہی پہنچ چکی تھی اور اپنے لہو کی سرخی میں ڈوب کر اس کا انتظار کر رہی تھی۔

"آؤ فرید۔ تم اپنے آنگن میں پھول کھلانا چاہتے تھے' آؤ میں سرخ پیراہن میں کھل رہی ہوں۔"

سہاگ رات کو تم نے سرخ گھونگٹ اٹھا کر کہا تھا کہ میں تمہاری نگاہوں کی آسودگی کے لیے کبھی کبھی وہ لباس پہن لیا کروں سو میں نے سدا سہاگن کا وہ لباس پہن لیا ہے۔ آؤ۔ مجھے پہچان سکو تو پہچان لو......"

ابھی آنگن اس سے دور تھا۔ وہ اپنی محبوبہ سے ملنے اس کے میکے کی طرف چلا گیا۔

وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ شادو نے اسے کئی خط لکھے۔ صرف پہلے خط کا جواب ملا۔ اس کے بعد فرید کی مسلسل خاموشی سے وہ پریشان ہوگئی اور زچگی کے پندرہ دن بعد تیس جون کو وہاں سے عثمان گوٹھ چلی گئی۔ تب سے اس کی کوئی خبر نہیں ملی ہے اور نہ ہی اس نے میکے والوں کو خط لکھا ہے۔

فرید اسی دن وہاں سے لوٹ گیا۔ سفر کے دوران وہ سوچتا رہا کہ شادو کو ایک ننھی سی جان کے ساتھ تنہا اتنا طویل اور انجانا سفر نہیں کرنا چاہیے تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ وہ بے چاری اور کیا کرتی۔ برسوں کے بہلاوے اور انتظار سے تنگ آگئی ہوگی۔ اسے خطوط کے جوابات نہیں مل رہے تھے۔ کوئی خبر نہیں مل رہی تھی کہ خاوند کہاں گم ہوگیا ہے اس لیے وہ پریشان ہو کر اس کی تلاش میں نکل آئی ہوگی۔ وہ بھی مجبور تھی۔ یہ بھی مجبور تھا۔ شادو کا دوسرا تیسرا خط آتا تھا لیکن وہ رحیم کوٹ کے زمیندار سے نہری پانی کے جھگڑوں میں الجھا ہوا تھا۔ تھانہ کچہری اور کھیتی باڑی کی الجھنوں سے فرصت نہیں مل رہی تھی۔ پھر عدالت کا فیصلہ اس کے خلاف ہوگیا تو وہ تین ماہ کے لیے جیل کی چہار دیواری میں قید ہوگیا۔ انہی الجھنوں اور بکھیڑوں کا نام زندگی ہے۔

جڑانوالہ سے شور کوٹ۔ شور کوٹ سے شداد پور پھر وہاں سے عثمان گوٹھ۔ شادو اس کی تلاش میں ان راستوں سے گزرتی آئی تھی۔ اب انہی راستوں پر وہ شادو کو تلاش کرتا آرہا تھا۔

اپنے کھیتوں سے گزرتے ہوئے اس نے مزدوروں سے پوچھا۔

"میرے ہاں کوئی عورت آئی ہے۔ جس کے ساتھ ایک بچہ ہے۔"

"نہیں۔" جواب ملا۔ اس نے مایوسی اور پریشانی سے پوچھا۔ "کوئی مہمان عورت۔ ایسی عورت جو مجھے تلاش کرتی آئی ہو اور پھر چلی گئی ہو؟"

"نہیں۔ یہاں صرف بستی کی عورتیں آتی ہیں۔ گھر میں مالکن اور بوڑھی مالکن کے سوا ہم نے کسی کو نہیں دیکھا۔ ہاں' آپ کے ہاں بیٹا ہوا ہے۔ بہت ہی خوب صورت ہے۔ میری گھر والی کہہ رہی تھی کہ وہ بالکل آپ جیسا ہے۔"

فرید کسی خوشی کا اظہار کیے بغیر لانبے لانبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے مکان کی طرف

جانے لگا۔ اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی کہ شادو یہاں تک کیوں نہیں پہنچی۔ صحیح پتہ معلوم ہونے کے باوجود وہ کہاں بھٹک گئی ہے؟ کہیں وہ اکیلی عورت کسی بدمعاش کے ہتھے نہ چڑھ گئی ہو۔

اس نے دروازے پر پہنچ کر زور زور سے دستک دی۔ دروازہ کھلنے میں دیر ہوئی تو وہ دھڑا دھڑ گھونسے برسانے اور چیخنے لگا۔

"کندن۔! دروازہ کھولو کیا مرگئی ہو' سنائی نہیں دیتا ہے؟"

فرید کی آواز سنتے ہی کندن آنگن سے دوڑتی ہوئی کمرے میں آئی اور خوشی سے چیختے ہوئے بولی۔ "آتی ہوں۔۔ آرہی ہوں۔ ابھی دروازہ کھولتی ہوں۔" وہ بھاگتی ہوئی چارپائی کے پاس آئی اور وہاں سے بچے کو اٹھا کر گنگناتی ہوئی آواز میں بولی۔

"اٹھ منے! دیکھ تیرا باپ آیا ہے۔ وہ تجھے دیکھتے ہی مارے خوشی کے مجھے چوم لے گا۔"

وہ لہراتی اور اٹھلاتی ہوئی دروازے کے پاس آئی اور اسے کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی فرید نے بے تابی سے پوچھا۔

"شادو یہاں آئی ہے؟"

کندن کے دماغ میں ہتھوڑا سا لگا۔ پل بھر کے لیے یوں لگا جیسے فرید کو یہاں شادو کی آمد کا کوئی ثبوت مل گیا ہے۔ تب ہی وہ جیل سے آتے ہی پورے یقین سے کہہ رہا ہے کہ شادو یہاں آئی ہے مگر دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل کر بولی۔

"شادو؟...... کون شادو؟ کیا وہ جو تمہاری سگی ہے؟ وہ بھلا میرے پاس کیوں آنے لگی؟"

"وہ آئی ہے۔" اس نے پاؤں پٹخ کر چیختے ہوئے کہا۔ "وہ یہاں آئی ہے۔ میں اس کے میکے سے آرہا ہوں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ وہ دو ماہ پہلے اپنے گھر سے نکلی ہے۔ مجھ سے ملنے یہاں آئی ہے۔"

وہ ناگواری سے بولی۔ "وہ یہاں آتی تو کیا میں اسے کنویں میں پھینک دیتی یا اسے کچا کھا جاتی یا اسے ذبح کر دیتی۔ کیسی باتیں کرتے ہو۔ اتنی بڑی عورت بھلا کہیں چھپ سکتی ہے؟ میری بات کا یقین نہیں ہے تو گھر میں آکے دیکھ لو۔ تم تو دروازے پر ایسے کھڑے ہو

جیسے کوئی پولیس والے ہو۔ جیسے یہ تمہارا گھر نہیں ہے' میں تمہاری نہیں ہوں' یہ بچہ تمہارا نہیں ہے......"

بچے کے ذکر پر فرید نے پہلی بار اس ننھی سی جان کو دیکھا تو چند لمحوں کے لیے نظریں اس پر جم کر رہ گئیں۔ وہ دہلیز پار کر کے قریب آیا اور جھک کر غور سے اسے دیکھنے لگا۔ کندن یوں فاتحانہ انداز میں کبھی بچے کو اور کبھی فرید کو دیکھ رہی تھی جیسے کوئی شکاری جال بچھا کر کبھی اپنے جال کو اور کبھی پھنسنے والے شکار کو دیکھتا ہے۔

فرید کچھ اور ہی دیکھ رہا تھا نہ جانے کیوں اس بچے کو دیکھتے ہی شادو کچھ اور شدت سے یاد آگئی تھی۔ اس بچے میں کوئی بات تھی کوئی ایسی چیز تھی جو اپنی بچھڑی ہوئی ماں کی نمائندگی کر رہی تھی حالانکہ آنکھیں باپ کی طرح نیلی تھیں' ناک نقشہ بھی باپ ہی سے ملتا جلتا تھا مگر اس کے بال سنہرے تھے جب کہ فرید کے بال سیاہ تھے۔ وہ سنہری چمک اسے اپنی ماں سے ملی تھیں۔

ان سنہرے بالوں کو دیکھ کر اسے شادو کی زلفیں یاد آرہی تھیں۔ کندن کی کوکھ سے جنم لینے والا بچہ سیکڑوں میل دور رہنے والی شادو کی سنہری چمک کیسے چرا لایا؟ یہ سوال ذرا دیر کے لیے اس کے ذہن میں ابھرا پھر ڈوب گیا کہ یہ محض اتفاق ہے۔ ایسے ہی اتفاقات قدرت کی بوالعجبی سمجھے جاتے ہیں۔ پھر یہ کہ اس وقت وہ شادو کے لیے فکر مند تھا۔ اس نے کندن کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا۔

"تم نے مجھے بہت ہی خوب صورت بیٹا دیا ہے۔ میں اسے پیار کروں گا۔ خوب پیار کروں گا مگر ابھی میں بہت پریشان ہوں۔ شادو کو تلاش کرنے جا رہا ہوں۔ نہ جانے وہ صحیح پتے سے بھٹک کر کہاں چلی گئی ہے؟"

یہ کہہ کر وہ پلٹ گیا اور تیزی سے چلتا ہوا کندن کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ ذرا دم لینے کے لیے بھی ٹھہرا نہیں' اس نے کندن کی خیریت بھی نہیں پوچھی اور پلٹ کر چلا گیا۔ ٹھیک ہے کہ وہ پریشان تھا مگر وہ پریشانی سوکن کے لیے تھی۔ اس لئے دل میں چرکے لگ رہے تھے۔

وہ خود کو سمجھانے لگی کہ کوئی بات نہیں۔ ایک خاوند اپنی گمشدہ بیوی کے لیے کتنے دنوں تک پریشان رہے گا؟ ابھی اسے تلاش کرنے دو۔ وہ تھک ہار کر صبر کرنے پر مجبور

ہو جائے گا۔ پھر میں تنہا اس کی نگاہوں کا مرکز بنی رہوں گی۔ یہی کیا کم ہے کہ اس نے میری تعریف کی ہے کہ میں نے اس کے لیے ایک خوب صورت بیٹا پیدا کیا ہے۔

اس نے بچے کو سینے سے لگا کر چوم لیا۔ بے چاری مرنے والی نے اس کے لیے اس بچے کو جنم دیا تھا۔

فرید بستی میں جا کر جان پہچان والوں سے شادو کے متعلق پوچھتا رہا پھر اس نے تھانے میں جا کر رپورٹ لکھوا دی۔ تھانیدار نے کہا کہ وہ ۳۰ جون کو جڑانوالہ سے چلی تھی۔ تو پہلی جولائی کو شہداد کوٹ پہنچی ہوگی۔ میں ریلوے پولیس کے رجسٹر سے معلوم کروں گا کہ پہلی جولائی کو شہداد کوٹ کے اسٹیشن پر کون کون سے سپاہی ڈیوٹی پر تھے۔ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ایک تنہا عورت کو بچے کے ساتھ دیکھا ہو۔ تم شادو کی ایک تصویر ہمیں لا دو اگر وہ شہداد کوٹ تک آئی ہوگی تو کوئی نہ کوئی اسے پہچان لے گا۔

فرید نے شادو کی ایک تصویر لے کر تھانے پہنچا دی اور گھر واپس آگیا لیکن اطمینان سے نہ بیٹھ سکا اور دوبارہ باہر نکل کر آس پاس کے زمینداروں سے پوچھتا رہا حتیٰکہ ان زمینداروں کے پاس بھی گیا جن سے جھگڑا کر کے وہ جیل گیا تھا مگر ناکامی ہوئی۔ کسی نے بھی شادو کا سایہ تک نہیں دیکھا تھا۔

وہ آدھی رات کو گھر واپس پہنچا تو تھکن سے چور تھا۔ نہ بچے کو چوم سکا اور نہ ہی وہ کندن سے محبت کے دو بول کہہ سکا۔ بستر پر گرتے ہی گہری نیند سو گیا۔

کندن تمام رات اپنی چارپائی پر کروٹیں بدلتی رہی اور فرید کی بے اعتنائی اور بے مروتی پر جھنجلاتی رہی۔ اتنے دنوں بعد آیا تھا اور ایسے الگ تھلگ سو رہا تھا۔ جیسے آپس میں کوئی رشتہ ہی نہ ہو۔ وہ صبح اٹھی تو روٹھی ہوئی تھی۔ فرید نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ آنکھ کھلتے ہی وہ شادو کی گمشدگی کے متعلق سوچ رہا تھا۔

وہ بستر سے اٹھ کر سوچ میں ڈوبا ہوا کمرے سے باہر آیا۔ اتنے دنوں بعد پہلی بار آنگن میں آیا تھا۔ پھر سرخ گلابوں کو دیکھتے ہی اس کا دل بے اختیار دھڑکنے لگا۔ اس نے خوشی سے چیختے ہوئے کندن کو آواز دی۔

"کندن۔ تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ ہمارے ہاں سرخ گلاب کھل رہے ہیں۔ یہ سب کیسے ہو گیا۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ سفید گلاب سرخ کیسے ہو گئے؟"

بڑھیا نے باورچی خانے سے نکل کر کہا۔ "بیٹا۔ یہ سب خدا کی قدرت ہے۔ تم نے جو پودے لگائے تھے وہ سوکھ چلے تھے۔ تمہارے مزدوروں نے انہی پودوں کی شاخیں کاٹ کر دوبارہ لگادی تھیں۔ کندن دن رات ان کی دیکھ بھال کرتی رہی۔"

فرید پودوں کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ وہ دیوانہ وار ایک ایک پودے کے قریب جاتا' اس کی ریشمی پنکھڑیوں کو لرزتی ہوئی انگلیوں سے چھو رہا تھا۔ کندن دروازے پر کھڑی دانت پر دانت جمائے ہونٹوں کو سختی سے بھینچے ان گلابوں کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے اپنی سوکن کو دیکھ رہی ہو۔ فرید نے کبھی اسے اتنی توجہ سے نہیں دیکھا تھا مگر گلابوں کو دل کی گہرائیوں سے دیکھ رہا تھا۔ اسے کبھی اتنی نرمی سے ہاتھ نہیں لگایا تھا مگر سوکن کے سرخ پیراہن کو چھو رہا تھا۔

اب وہ ایک پودے کے قریب دوزانو ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ اور ایک پھول کو دونوں ہاتھوں سے یوں تھام رہا تھا جیسے شادو کے شہابی مکھڑے کو ہتھیلیوں کے گلدان میں سجا رہا ہو۔

وہ گلاب کی پتیوں میں چھپی ہوئی شبنم کے آنسو رو رہی تھی۔ شاید وہ خوشی کے آنسو تھے کہ ایک مدت کے بعد اس کی قربت نصیب ہوئی تھی۔

فرید محبت اور لگن سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اور تب آنکھیں بند کرتے ہی اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس کی تلاش ختم ہو گئی ہو۔

جان بہار اس کے ہونٹوں کے سائے میں ہے' وہی رنگ' وہی روپ۔ وہی جذبوں سے مہکتی ہوئی گلابی خوشبو' وہی گلبدن کی نزاکت اور ملائمت جو سمٹے تو پھول اور انگڑائی کی اٹھان پر آئے تو شادو کا سراپا بن جائے۔

آگ لگ رہی تھی۔

آگ لگ رہی تھی۔ کندن جل رہی تھی۔ وہ سرخ گلاب نہیں تھے' انگارے تھے جو اس کے جسم کے ہر ایک حصے کو داغ رہے تھے۔ وہ تڑپ رہی تھی اور اپنے اندر چیخ رہی تھی۔ "اری۔! تجھے کس لیے مارا تھا؟ کیا اس لیے کہ مرنے کے بعد بھی تو مجھے جلاتی رہے اور سوکن بن کر میرے خاوند کا راستہ کاٹتی رہے۔ کل سے میری سیج سونی ہے۔ ہائے' وہ

میری طرف ذرا بھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا........"

وہ دوڑتی ہوئی اپنی ماں کے کمرے میں گئی اور بستر پر اوندھے منہ گر کر رونے لگی۔

تھوڑی دیر کے بعد ماں نے آکر بتایا کہ فرید ناشتہ کیے بغیر تھانے چلا گیا ہے۔ بس یہی باتیں جی کو جلاتی تھیں کہ اسے کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں ہے۔ بیوی بچے کی پروا نہیں ہے' رات کو مسافر کی طرح آیا اور صبح اٹھ کر سوکن کو گلے لگایا' اسے پیار کیا اور چلا گیا۔

وہ غصے میں تنتناتی ہوئی کمرے سے نکلی' آنگن میں آئی اور غراتے ہوئے ان گلابوں کو دیکھنے لگی پھر پاؤں پٹختے ہوئے اس پھول کے پاس گئی جسے وہ چوم کر گیا تھا۔ اس کے تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ غصے کی شدت سے کانپ رہی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے دایاں ہاتھ اٹھایا اور اپنی پوری طاقت سے اس پھول کو ایک طمانچہ مارا۔

"ہائے!" ایک زور کی چیخ بلند ہوئی۔

وہ پھول کی چیخ نہیں تھی۔ کندن چیختی چلاتی وہاں سے بھاگی آرہی تھی۔ ماں نے کمرے سے نکل کر پریشانی سے پوچھا۔

"کیا بات ہے بٹیا؟ کیا ہو گیا......؟"

بٹیا بیچ آنگن میں آکر گر پڑی تھی اور دہشت زدہ سی کبھی پھول کی جانب دیکھ رہی تھی اور کبھی دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو۔ اس ہتھیلی پر خراشیں پڑی ہوئی تھیں اور ان میں سے خون کی سرخی جھلک رہی تھی۔

کانٹوں نے طمانچے کا جواب دیا تھا اور وہ پھول جوں کا توں ان کانٹوں کی آغوش میں مسکرا رہا تھا۔

○☆○

فرید تھانیدار کے ساتھ شہداد کوٹ گیا تھا۔ پہلی جولائی کو جن سپاہیوں کی ڈیوٹی اسٹیشن پر تھی ان میں سے ایک سپاہی نے شادو کی تصویر پہچان کر کہا کہ اس عورت کو اس نے اسٹیشن ماسٹر کے ساتھ دیکھا تھا۔ اسٹیشن ماسٹر نے بتایا کہ وہ عورت عثمان گوٹھ کا راستہ پوچھتی ہوئی اس کے پاس آئی تھی۔ اس نے فلاں گدھا گاڑی والے سے کہا تھا کہ اسے عثمان گوٹھ تک پہنچا دے۔ پھر تھانیدار نے گدھا گاڑی والے کو پکڑا۔ وہ قسمیں کھانے لگا کہ اس عورت کو وہ عثمان گوٹھ تک صحیح سلامت پہنچا کر آیا ہے۔ لیکن اس

کے سچ پر کسی نے یقین نہیں کیا۔ تھانیدار نے اس پر ڈنڈے برسانے شروع کر دیے۔

فرید نے کہا۔ "اگر تم نے اسے میرے گھر تک پہنچا دیا تھا تو وہ گھر پر ہی ملتی۔ سچ بتاؤ کہ تم اسے کہاں لے گئے؟"

گاڑی بان نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "میں قسم کھاتا ہوں کہ اسے آپ کے دروازے تک پہنچا کر آیا ہوں۔"

تھانیدار نے پوچھا۔ "کیا تم ان عورتوں کو پہچان لو گے جنھوں نے شادو کو گھر میں بلایا تھا؟"

"عورتیں؟" گاڑی بان نے بوکھلا کر کہا۔ "وہاں میں نے کسی عورت کو نہیں دیکھا۔"

میرا مطلب ہے کہ مکان کا دروازہ بند تھا۔ میرے واپس جانے تک وہ عورت کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹا کر کسی کو آواز نہیں دی تھی۔ میں نہیں جانتا کہ میرے جانے کے بعد وہ اس مکان میں گئی تھی یا کسی دوسری طرف چلی گئی تھی۔"

"یہ بکواس کرتا ہے، تھانیدار صاحب!" فرید نے کہا۔ "شادو دروازے تک پہنچے اور گھر کے اندر نہ جائے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ بدمعاش ہے جھوٹ بولتا ہے۔ میرے کھیت مزدوروں یا کسی نے بھی اسے نہیں دیکھا۔ فرض کر لیا جائے کہ میری دوسری بیوی نے شادو کو سوکن سمجھ کر گھر میں گھسنے نہیں دیا تھا تو ایسی صورت میں وہ وقتی طور پر پناہ لینے قریبی بستی میں جاتی اور آس پاس کے کسی زمیندار کے ہاں پناہ لیتی لیکن تمام لوگوں کا یہی بیان ہے کہ انھوں نے شادو کو کہیں نہیں دیکھا۔ یقیناً یہ بدمعاش اسے کہیں لے گیا ہے۔ نہ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟ نہ جانے وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔"

تھانیدار نے کہا۔ "میں سمجھ رہا ہوں یہ بدمعاش سیدھی طرح سچ نہیں بولے گا۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ اسے حوالات میں بند کر دو۔ روز صبح شام ڈنڈے پڑیں گے تو اس کا باپ بھی سچ بولنے پر مجبور ہو جائے گا......"

گاڑی بان چیختا چلاتا، روتا پیٹتا رہا مگر اس پر لاتیں، جوتے اور ڈنڈے برستے رہے جب مار کھا کھا کر اس پر نیم بے ہوشی طاری ہو گئی تو اسے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ جرم

کسی نے کیا تھا۔ شامت کسی کی آئی تھی۔

واپسی پر تھانیدار نے فرید سے کہا۔ "یہ گاڑی بان اسی طرح مار کھاتا رہے گا مگر سچ نہیں بولے گا۔ ایسے مجرموں سے اکثر ہمارا سابقہ پڑتا ہے جو عورتوں کو اغوا کرتے ہیں۔ انہیں بیچتے ہیں یا قتل کر دیتے ہیں۔ گرفتار ہونے پر اپنے جرم کا اقرار نہیں کرتے کیوں کہ انہیں پھانسی یا عمر قید کی سزا کا خطرہ ہوتا ہے۔ انکار کرتے رہنے سے زیادہ سے زیادہ دو چار روز تک مار کھانی پڑتی ہے۔ اس گاڑی بان کے خلاف بھی کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے کہ اس نے شادو کو کہیں بیچ دیا ہے یا قتل کر دیا ہے۔ قانون ہر پہلو کو ٹٹولتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے شادو کو گھر کے دروازے تک پہنچا دیا ہو۔ تمہاری دوسری بیوی نے اسے گھر میں آنے کی اجازت نہ دی ہو یا شادو نے ہی سوکن کے ساتھ رہنا گوارا نہ کیا ہو۔ وہ پناہ کی تلاش میں کسی دوسری جگہ چلی گئی ہو اور کسی اور کے ہتھے چڑھ گئی ہو۔ سوچنے اور عمل کرنے کے ہزار راستے ہیں۔"

تھانیدار اس کے ساتھ گھر پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ اس نے کندن اور اس کی ماں کو بلا کر مختلف سوالات کیے۔ دونوں ماں بیٹی سمجھتی تھیں کہ ایسی تحقیقات سے بھی گزرنا ہو گا۔ انھوں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ چاہے جان چلی جائے مگر اقرار نہیں کریں گی کہ شادو یہاں آئی تھی۔

تھانیدار مایوس ہو کر چلا گیا۔

گاڑی بان پر کھو کھلا مقدمہ چلایا جا سکتا تھا مگر یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا کہ شادو کو اس نے گم کیا ہے یا شادو خود کہیں چلی گئی ہے۔

کندن پر بھی شبہ نہیں تھا۔ سب یہی کہتے تھے کہ شادو کو کسی نے عثمان گوٹھ میں نہیں دیکھا ہے گھر کی گونگی دیواریں اس خونی واقعے کی گواہی نہیں دے سکتیں تھیں۔ آنگن میں کھلنے والے سرخ گلاب رہ رہ کر فرید کی توجہ کو پکارتے تھے۔ فرید انہیں دیکھتا تھا، چھوتا تھا، سونگھتا تھا مگر سمجھ نہیں سکتا تھا۔ بس دل تھا کہ ادھر کھنچا چلا جاتا تھا۔ صبح و شام جب اسے فرصت ملتی تو وہ کنویں کے چبوترے پر آ کر بیٹھ جاتا تھا۔ ایک عجیب حسرت بھری نگاہوں سے ان پھولوں کو دیکھتا اور زیر لب بڑبڑاتا رہتا۔ ایک نیم دیوانگی سی کیفیت اس پر طاری ہو گئی تھی۔ وہ کیا بڑبڑاتا تھا؟ یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ کندن ادھر سے

گزرتی تو وہ یہی سمجھتی کہ وہ شادو سے باتیں کر رہا ہے۔

کیا وہ سمجھ رہا ہے کہ شادو وہاں چھپی ہوئی ہے؟

یا وہ لہو کے پھول چغلی کھا رہے ہیں۔ "میں یہاں ہوں۔ میں یہاں ہوں۔"

وہ مرنے والی ہر وقت اس مجرمہ کا دل دہلاتی رہتی تھی۔

پھر ایک رات وہ فرید سے بولی۔ "تم کب تک مجھ سے دور رہو گے.....؟"

"میں بہت پریشان ہوں کندن۔"

"تم مجھے سمجھنے کی کوشش کرو فرید۔ میں تمہاری پریشانیاں دور کر دوں گی۔ میں تمہیں اتنا پیار دوں گی' اتنا پیار دوں گی کہ تم سب کچھ بھول جاؤ گے۔"

فرید نے گہری سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ وہ بھی پیار اور توجہ کی مستحق تھی۔ وہ بھی اس کی بیوی ہی تھی۔ ایسی بیوی جو ایک گناہ کی سزا بھگتنے کے لئے ملی تھی۔ بعض عورتیں ایسی ہوتی ہیں جو عام حالات میں ذرا بھی اچھی نہیں لگتیں۔ صرف گناہ کے وقت برداشت کرلی جاتی ہیں۔ مگر اب فرید کے سامنے گناہ نہیں تھا ایک خاوند کا فرض تھا۔ اس نے سر جھکا کر کہا۔

"اچھی بات ہے بتی بجھا دو۔"

"کیوں؟" وہ اٹھلا کر بولی۔ "ہم کوئی گناہ تو نہیں کر رہے ہیں۔"

"جو کہتا ہوں وہ کرو۔ ورنہ میں سو جاؤں گا۔"

وہ چپ چاپ اٹھی اور لالٹین بجھا دی۔

کمرے میں تاریکی پھیل گئی اس تاریکی میں فرید نے کندن کو گم کر دیا اور آنکھیں بند کر کے شادو کا سراپا تلاش کرنے لگا...... اور وہ آ گئی۔ اس کے برابر لیٹ گئی۔

وہ کون ہے؟ وہ آنے والی کون ہے؟

اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے چھو لیا۔ تمام نازک بدن تقریباً ایک جیسے ہوتے ہیں۔ صرف ادائیں اور انداز مختلف ہوتے ہیں۔ اندھیرے میں جس پیکر جاں کا تصور کرو۔ وہی سامنے آ جاتا ہے اور وہ سامنے تھی اس کے ہاتھ سنہری زلفوں سے کھیل رہے تھے پھر اس کی انگلیاں رخساروں پر آئیں تو رخسار شہابی تھے۔ اس کے ہونٹ سرخ گلاب کی پتیوں کی طرح ملائم تھے اور جذبوں کی حدت سے لرز رہے تھے۔

تاریکی جگمگا رہی تھی۔ سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ ریشمی پنکھریوں کا پیراہن کھل رہا تھا۔ ذہنوں پر نشیلی دھند چھائی جا رہی تھی۔ ایک اپنے راستے پر بہکا کر لانا چاہتی تھی۔ دوسرا اپنے راستے پر بھٹکتا جا رہا تھا۔ بعض اوقات منزل ایک ہوتی ہے مگر راستے الگ الگ ہوتے ہیں۔ دو بدن ایک دوسرے کے بہت قریب ہوتے ہوئے ذہنی طور پر دور رہتے ہیں۔ کچھ اسی انداز میں وہ بھٹک رہے تھے۔

ٹھیک اسی وقت فرید جذبات سے مغلوب ہو کر بڑبڑانے لگا۔

"شادو۔ میری شادو۔ میں اب تم سے دور نہیں......"

یک بیک کندن تڑپ کر اس سے الگ ہو گئی اور چیخ کر بولی۔

"کون شادو؟ کہاں کی شادو؟ مر گئی تمہاری شادو' تم شادو سمجھ کر میرے قریب آئے ہو۔ میں کتیا بننا پسند کروں گی مگر شادو بن کر تمہارے پاس نہیں آؤں گی......"

وہ روتی ہوئی اپنی منجھی پر آ کر گر پڑی۔

فرید اندھیرے میں اپنا سر تھامے بیٹھا رہا اور سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔ "میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ میں بہت پریشان ہوں مجھے تم سے نفرت نہیں ہے کندن مگر ابھی میں تمہیں محبت نہیں دے سکتا۔ وہ بری طرح میرے حواس پر چھائی ہوئی ہے۔ شاید میں اسے کبھی نہ بھلا سکوں۔ جب میں ان گلابوں کو دیکھتا ہوں تو وہ آپ ہی آپ میری نگاہوں میں روشن ہو جاتی ہے۔

باپ نے ایک بیٹی کی آرزو کی
ماں نے پیدا کیا
ربِ کریم نے اس میں جان ڈالی۔
مگر جس کی آرزو کی گئی، جسے پیدا کیا گیا
جس میں جان ڈالی گئی، وہ ننگی تھی۔
مَنے بھائی نے اسے دیکھا تو حیا آ گئی۔
تب ایک بھائی نے
اس بے لباس تخلیق کو لباس پہنانے کے لیے
اپنی تخلیق کا تمام جوہر فروخت کر دیا۔
(یہ کہانی حیا کی معراج پر تمام انسانیت
کا سر جھکا دیتی ھے۔

حیا آتی ہے

گنگا کا پانی اتر چکا تھا۔ پھر بھی جس قدر پانی بہہ رہا تھا وہ کسی کی بوڑھی لاش کو بہا کر اُدھر سے ادھر لے جا سکتا تھا یا ساحل تک پہنچا سکتا تھا۔ کسی بھی دن، کسی بھی وقت میری لاش یہاں سے بہتی ہوئی گزر سکتی تھی لیکن ابھی میں موت سے ڈر رہا ہوں۔

جب موت سے ڈر لگتا ہے تو انسان جینے کا کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتا ہے۔ میں اس بہانے کبھی کبھی بادام تلی گھاٹ پر آکر کھڑا ہو جاتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ کبھی کسی وقت میری آسی کی لاش کہیں سے بہتی ہوئی ساحل پر میرے قدموں تک آئے گی تو میں اس سے لپٹ کر ماتم کروں گا پھر اس کی لاش کے ساتھ بوڑھی گنگا کی آغوش میں بہہ جاؤں گا۔

یوں میں اب تک زندہ ہوں۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ ماہ دسمبر تک بہتی ہوئی لاشیں اکثر نظر آتی تھیں۔ جنیوا کی امدادی پارٹی اور ریڈ کراس سوسائٹی نے جگہ جگہ کیمپ بنا دیئے تھے تاکہ بچھڑے ہوئے رشتوں اور بچھڑی ہوئی محبتوں کو زندہ یا مردہ ان کیمپوں تک پہنچایا جائے۔ مجھ جیسے تلاش کرنے والے ان کیمپوں میں جاتے تھے اور لہو کے رشتوں کو پہچاننے کی کوششیں کرتے تھے۔ لیکن وہاں بھی میری آسی مجھے نہ ملی۔

آسی میری چھوٹی بہن ہے۔ بہت کم لوگ بہن کے ساتھ جینا یا مرنا پسند کرتے ہیں۔ محبوبہ کے ساتھ موت آئے تو ایک یادگار رومانی داستان بطور مثال قائم رہ جاتی ہے۔ یہ

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میں سچ مچ اپنی بہن کی ساتھ مر سکتا ہوں یا نہیں لیکن جب بھی کوئی لہو کا رشتہ بچھڑتا ہے یا مرتا ہے تو ہم چھاتی پیٹ کر اس کے ساتھ مرنے کے دعوے کرتے ہیں اور اس کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔

میرا نام فضل احمد ہے۔ میں اپنی ماں، ایک بیوی اور ایک بچی کے ساتھ دکھن منڈی میں رہتا تھا۔ ان دنوں میرا کوئی ایک ٹھکانہ نہیں تھا۔ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق مجھے بنگالی بن کر رہنا پڑتا تو میں بنگالی بیوی کلثوم کے ساتھ دکھن منڈی آجاتا اور جب بہاری بن کر پناہ لینے کی ضرورت پیش آتی تو محمد پور میں اپنے بھائی کے ہاں چلا جاتا تھا۔

محمد پور میں میرا نام صحیح تلفظ کے ساتھ فضل احمد تھا۔ دکھن منڈی میں یہی نام فجل احمد بن جاتا تھا۔ ایک جگہ میں بہاری اور میری زبان اردو تھی۔ دوسری جگہ میں اپنی بنگالی بیوی کے طفیل پیدائشی بنگالی تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری طرح بہت سے لوگ اپنی جان کی سلامتی کے لیے دوغلی زندگی گزارتے ہیں۔

مارچ کا مہینہ شروع ہوا تو شہر کی فضا پر عجیب سی گھمبیرتا چھا گئی۔ یوں تو سب ہی چپکے چپکے ایک عرصے سے سمجھتے آرہے تھے کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ بازار سے کپڑے، اناج اور دوسری ضروریات زندگی کی چیزیں آہستہ آہستہ غائب ہو رہی تھیں۔ جن کے پاس کچھ پیسے تھے، وہ راشن جمع کر رہے تھے جن کے پاس زیادہ پیسے تھے، وہ لاہور اور کراچی کی طرف بھاگ رہے تھے۔

پھر اچانک ہنگامے شروع ہو گئے۔ ان دنوں چونکہ بہاریوں کا پلہ بھاری تھا۔ اس لیے میں بھائی سے ملنے اپنے خاندان کے ساتھ محمد پور چلا گیا۔ اس وقت آسی بھی میرے ساتھ تھی اور دسویں جماعت میں اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ دراصل میں اسی کے لیے زیادہ فکر مند تھا۔ وہ بچپن سے عربی اور اردو پڑھتی آئی تھی اردو بولنے والی لڑکیوں کے ساتھ وقت گزارتی تھی۔ اس لیے بنگالی نہیں بول سکتی تھی۔ محمد پور میں ہی اس کا گزارا ہو سکتا تھا۔

ایوب گیٹ کے قریب میرے بھائی کے مکان میں صرف دو کمرے تھے۔ وہاں وہ بھابی اور جوان بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ادھر سے میرا جو قافلہ آیا تو اس میں امی اور آسی کے علاوہ میری بیوی کلثوم اور میری ننھی بیٹی ڈولی بھی تھیں۔ میرے بھائی اور بھابی

نے ہمیں دیکھ کر ناگواری کا اظہار کیا لیکن حالات ایسے تھے کہ انہیں ہمارے لیے ایک کمرہ خالی کرنا پڑا۔

بھابی کی بے زاری بجا تھی کیونکہ میں کبھی مستقل طور سے کماتا نہیں تھا۔ کلثوم طعنے دیتی تو کبھی سائیکل رکشا چلا لیتا یا پھر سینما کے ٹکٹ بلیک کرتا تھا۔ اب تو سینما گھر بھی بند پڑے تھے۔ ہمارے کھانے پینے کا خرچ بھی بھائی پر آ پڑا تھا۔ بہاری عورتیں پیٹی کوٹ اور بلاؤز کے بغیر ساریاں نہیں پہنتیں۔ کلثوم سے شادی کرنے کا ایک فائدہ یہ تھا کہ وہ عام بنگالی عورتوں کی طرح صرف ایک ساڑی میں گزرا کر لیتی تھی۔ پیٹی کوٹ اور بلاؤز سلوانے کے لیے پیسے ہوتے ہی نہیں تھے۔

ایک نقصان بھی تھا کہ وہ مچھلی زیادہ کھاتی تھی اور مچھلیاں ہضم کرنے کے لیے میرے ہی بستر پر سوتی تھی۔ میں نے بھائی کے ہاں پہنچ کر اسے سمجھایا۔ "دیکھو! یہاں ایک ہی کمرہ ہے۔ امی اور آسی کیا سوچیں گی؟ تم آسی کے پاس جا کر سو جاؤ۔"

وہ برا مان کر آسی کے پاس چلی گئی۔ ڈولی میری امی کے پاس سو رہی تھی۔ میں لائٹ آف کر کے اپنے بستر پر آ گیا۔ آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ رات کی تاریکی میں تقریباً سارا شہر جاگ رہا تھا۔ کسی کو اپنے جان و مال کی فکر تھی۔ کوئی لوٹ کھسوٹ میں مصروف تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ برے وقت کے لیے کیڑے مکوڑے بھی خوراک جمع کر لیتے ہیں، میں نے کچھ نہیں کیا۔ بھائی کب تک میرا بوجھ اٹھائے گا؟ اب مجھے کچھ کرنا چاہیے۔

میں نے کوئی ہنر نہیں سیکھا۔ کبھی کوئی ملازمت نہیں کی۔ صبح سے شام تک مزدوری کرنے کے تصور ہی سے دل گھبرانے لگتا تھا۔ ایسے وقت مجھ جیسے لوگ وقت سے فائدہ اٹھا کر لوٹ کھسوٹ کے متعلق ہی سوچتے ہیں۔ میں اسی لائن پر سوچ رہا تھا کہ اچانک میرا خالی بستر بھر گیا۔

وہ اپنی سانسوں میں مچھلی کی بساند لے کر آ گئی تھی۔ میں اس بساند کا عادی ہوں۔ اس لیے کہ میں بھی شوق سے مچھلیاں کھاتا ہوں۔ اس وقت میں نے غصے میں سرگوشی کی "تم کیوں آ گئیں؟"

وہ بھی سرگوشی میں بولی۔ "آسی تھم کورے نیلو (آسی سو چکی ہے)"

میں نے کہا۔ "جوان لڑکیوں کی آنکھیں سوتی ہیں مگر احساسات جاگتے رہتے ہیں۔

کبھی ہماری ڈولی بھی جوان ہوگی۔ تمہیں ابھی سے محتاط رہنا چاہیے۔"

وہ جواباً محتاط رہنے کے لیے میری سانسوں میں سماگئی۔ سانولی سلونی کلثوم پٹ سن کے سنہرے ریشوں کی طرح ملائم بھی ہے اور مضبوط بھی۔ اکثر اپنے ارادوں کی مضبوطی سے مجھے باندھ لیتی ہے۔ آدھی رات کے قریب مکان کے دروازے پر دستک سنائی دی۔ میں بستر سے اٹھ کر دروازہ کھولتا ہوا باہر آیا۔ میرے بھائی جان دوسرے کمرے کا دروازہ کھول کر برآمدے میں آچکے تھے اور محلے کے کچھ لوگوں سے باتیں کر رہے تھے۔

محلے کا ایک نوجوان کہہ رہا تھا۔ "آپ لوگ یہاں آرام سے سو رہے ہیں اور محلے کے ہر گھر کا ایک آدمی پہرہ دے رہا ہے۔ آپ دونوں میں سے کسی ایک کو ہمارے ساتھ جاگنا چاہیے۔"

میرے بھائی جان نے میری جانب دیکھا۔ میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں ان کے ساتھ جارہا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں قمیص پہننے کے لیے کمرے میں آیا۔ کلثوم نے رازداری سے کہا۔ "میرے پاس یہی ایک ساری رہ گئی ہے، کہیں سے ہاتھ لگے تو میرے لیے ضرور لے آنا۔"

یہ بات میرے دماغ میں بھی پک رہی تھی۔ لوٹ کھسوٹ کی فضا گرم تھی۔ کسی بھی گھر میں گھس کر ساری اور چاول وغیرہ اٹھا کر لائے جاسکتے تھے۔ کمائی کرنے کا بہترین موقع تھا۔ میں کلثوم سے وعدہ کر کے باہر آگیا لیکن اس رات کچھ نہ ہو سکا۔ جن لوگوں کے ساتھ میں پہرہ دینے نکلا تھا۔ وہ سیدھے سادے اور بے ضرر لوگ تھے۔ صرف اپنے جان و مال اور بہو بیٹیوں کے لیے باری باری جاگنا چاہتے تھے۔

اتنا تو میں سمجھتا ہوں کہ جہاں گھوڑے ہوتے ہیں، وہاں گدھے بھی پائے جاسکتے ہیں۔ شریفوں کے ساتھ موقع پرست غنڈے بھی ہوتے ہیں۔ چند راتیں جاگنے کے بعد مجھے اپنے مطلب کے بندے مل گئے۔ انہوں نے مجھے نور جہاں روڈ کی طرف پہرہ دینے کے لیے بلایا۔ وہاں دس آدمی ہمارے مطلب کے تھے۔ ہم دسوں بیک وقت پہرے داری کے فرائض چھوڑ کر ڈکیتی کے لیے نہیں جاسکتے تھے۔ لہٰذا فیصلہ یہ ہوا کہ ہر رات صرف چار آدمی محلے سے باہر جائیں گے۔ باقی چھ پہرہ دیں گے۔ اس رات میری باری نہیں

آئی۔

صبح سے پہلے چاروں خالی ہاتھ واپس آئے۔ ایک کی قمیص پر لہو کے چھینٹے تھے۔ وہ اپنی قمیص اتارتے ہوئے بولا۔ "سالا چیخنا چاہتا تھا۔ میں نے چھری پھیر دی۔"

دوسرے نے کہا۔ "بنگالیوں کے پاس ہے ہی کیا؟ پہننے کے لئے کپڑے نہیں ہوتے۔ کمانے کے لیے اناج نہیں ہوتا۔ ہمیں کیا خاک ملے گا ان کے گھروں سے؟"

تیسرے نے کہا۔ "ادھر فارم گیٹ اور نیو مارکیٹ کی طرف مال دار بنگالی رہتے ہیں۔ ان کی عورتیں سونے کے زیورات پہنتی ہیں۔ کل ہم ادھر جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ نہیں، کل ہماری باری ہے ہم جائیں گے۔"

وہ چاروں میرے خلاف ہوگئے کیونکہ وہ خالی ہاتھ آئے تھے۔ شرمندگی مٹانے کے لیے آنے والی رات اپنی کارکردگی دکھانا چاہتے تھے۔ لہٰذا فیصلہ یہی ہوا کہ کوئی بھی جائے۔ مال غنیمت میں سب کا حصہ ہوگا۔ اس لیے وہ چاروں جائیں گے۔ یعنی اگلی رات بھی میری باری نہیں آئی۔

دوسری رات وہ چاروں گئے اور صبح سے پہلے ڈھیر ساری چیزیں بٹور کر لائے۔ کپڑے، ریڈیو، ٹیلی وژن اور دو ہزار روپے نقد۔ ان کے بیان کے مطابق انہوں نے کسی رئیس کے گھر میں ڈاکہ ڈالا تھا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ وہ چاروں بے ایمانی کر رہے ہیں۔ میں ان کی یہ بات تسلیم نہیں کر سکتا تھا کہ رئیس کی کوٹھی میں انہیں سونے کے زیورات نہ ملے ہوں اور صرف دو ہزار روپے نقد حاصل ہوئے ہوں۔ میں نے سوچ لیا کہ میری باری آئے گی تو میں بھی گھپلا کروں گا۔

بہرحال مال غنیمت کے بٹوارے میں مجھے دو سو روپے، ایک پاجامہ، ایک جوڑی چپل اور ایک ریڈیو ملا۔ میں نے سوچا کہ بھائی جان کو پاجامہ اور چپل دے کر خوش کردوں گا حالانکہ ہم ان کے گھر میں بیٹھ کر کھا رہے تھے۔ لیکن دو سو روپے چھپالوں گا۔ اس طرح ...ذش ہو جائے گی۔

جب میں نے بھائی جان کو اپنی طرف سے وہ تحفے دیے تو وہ ایک دم سے بگڑ گئے۔ انہوں نے میرا گریبان پکڑ کر کہا۔ "چور بدمعاش! کیا یہ شریفوں کا کام ہے۔ اگر کوئی ہمارے گھر کو لوٹنے آئے تو ہم پر کیا گزرے گی؟"

میری امی مجھے بہت چاہتی ہیں۔ انہوں نے فوراً ہی میرا گریبان ان کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے کہا۔ "کیا میرے بچے کو مار ڈالو گے؟ اگر یہ تمہارے گھر بیٹھ کر کھا رہا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ......"

بھائی جان نے ڈانٹ کر کہا۔ "بس کیجئے امی! آپ کے لاڈ پیار نے اسے چور بنا دیا ہے لیکن میں عزت دار آدمی ہوں۔ میرے گھر میں یہ تماشا نہیں ہوگا۔ اگر میرے گھر میں شرافت سے رہنا ہے تو چوری کا تمام مال میرے سامنے رکھ دو۔ میں محلے کے بڑے بوڑھوں کو بتاؤں گا کہ رات کو پہرے داری کی آڑ میں کچھ لوگ جرائم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔"

"ہائے ہائے۔ کیا تم محلے والوں کے سامنے میرے بیٹے کو چور بناؤ گے۔ کیا اس وقت تمہاری عزت پر حرف نہیں آئے گا؟ صاف کیوں نہیں کہتے کہ ہم یہاں سے چلے جائیں۔"

بھابی نے بھائی جان سے کہا۔ "ہم تو نیکی کر کے پھنس گئے۔ محلے والے آپ کے بھائی پر تھوکیں گے تو وہ تھوک ہم پر بھی آئے گا۔ آپ ان سے کہیں کہ چوری کا مال لے کر یہاں سے چلے جائیں اور پھر کبھی ادھر کا رخ نہ کریں۔"

امی نے کہا۔ "ہاں بہو! اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر لو۔ ہم ابھی یہاں سے چلے جائیں گے۔"

امی میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی دوسرے کمرے میں لے گئیں۔ کلثوم نے روانگی کے لیے سامان باندھتے ہوئے کہا۔ "امی کچھو پائی نا۔ پاجمہ اور چاپول نئے کی کور بو (مجھے تو کچھ نہ ملا۔ پاجامہ اور چپل لے کر کیا کروں گی)"

میں نے اس کے قریب جھکتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ "اری نیک بخت میری جیب میں دو سو روپے ہیں۔ تیرے لیے نئی ساری خریدوں گا۔"

وہ خوش ہو گئی۔ بیوی کو خوش کر کے اپنا دل بھی باغ باغ ہو جاتا ہے۔ میں نے امی کو دو سو روپے کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ اگرچہ میں آپ کو بہت چاہتا ہوں۔ اس کے لیے بھی ایک ساری خرید سکتا تھا۔ ننانوے فیصد گھرانوں میں بیوی کا سکہ چلتا ہے۔ کلثوم نے دو سو روپے اپنے آنچل میں باندھ لیے تھے۔ بھائی جان نے امی کو اپنے پاس رکھ لیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان ہنگاموں میں وہ ایک چور بھائی کے پاس رہے۔

جب ہم وہاں سے جانے لگے تو بھائی جان نے کلثوم کو سمجھایا۔ "دلہن! تم ایک بنگالی عورت ہو، اپنے میاں کو سمجھاؤ۔ ہم بنگالیوں سے نفرت نہیں کرتے۔ اگر کرتے تو تم ہمارے گھر کی بہو نہ بنتیں۔ کیا اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ تم اپنے میاں کے ساتھ اپنوں کا گھر لوٹ رہی ہو؟"

"آپنار بھاشا آمی بوجھتے پاری نا (آپ کی زبان میری سمجھ میں نہیں آتی)"

یہ کہہ کر وہ میرے ساتھ باہر آ گئی۔ کچھ دور جا کر ہمیں ایک سائیکل رکشا مل گیا۔ سائیکل رکشا کی سیٹ پر صرف دو آدمیوں کی گنجائش ہوتی ہے۔ کلثوم نے ڈولی کو گود میں بٹھا لیا۔ امی میرے پاؤں کے پاس نیچے بیٹھ گئیں۔ یہ مائیں ہر حال میں سمجھوتہ کر لیتی ہیں۔ اپنے قدموں تلے جنت رکھ کر ہمارے قدموں تلے بیٹھ جاتی ہیں۔

ہم رکشا میں نیو مارکیٹ تک آئے۔ وہاں سے پیسے بچانے کے لیے بس میں بیٹھ کر رتھ کھولا جا رہے تھے کہ گلستان کے پاس بس خراب ہو گئی۔ وہاں سے پیدل نواب پور آئے تو حقا کے شراب خانے کے پاس غنڈوں نے ہمیں گھیر لیا لیکن یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ ہم بنگالی ہیں یا بہاری؟ ایسی صورت میں انہوں نے کلثوم کے آنچل سے دو سو روپے نکالے، ریڈیو ضبط کیا پھر ہمیں چھوڑ دیا۔

گناہ بے لذت والی بات ہو گئی۔ بھائی کے گھر سے بھی نکلے اور چوری کا مال بھی ساتھ نہ رہا۔ کلثوم رونے لگی۔ میں نے دلاسا دیا۔ گھر پہنچ کر اس کے آنسو پونچھے اور وعدہ کیا کہ اس کی ساری کے لیے لمبا ہاتھ ماروں گا۔

دکھن منڈی اور اس کے اطراف بنگالیوں کی آبادی تھی۔ وہاں واردات نہیں کر سکتا تھا پہچان لیے جانے کا خدشہ تھا۔ دو مہینے اس انتظار میں گزر گئے کہ کہیں لمبا ہاتھ مارنے کا موقع ملے گا۔ امی اور کلثوم دونوں کی ساریاں میلی چیکٹ ہو رہی تھیں۔ کبھی سامان خریدنے اور کبھی چاول خریدنے کے پیسے نہیں ہوتے تھے۔ ہم چٹائی پر سوتے تھے اور پرانے کپڑوں کی کترن سے بنا گا کھیتا اوڑھتے تھے۔ وہاں غربت کا یہ عالم تھا کہ جس کے پاس بدن چھپانے کے لیے ایک چادر ہوتی تھی، وہ مال دار سمجھا جاتا تھا۔

میرے گھر کی یہ حالت تھی کہ کلثوم دو ماہ میں ایک بار ساری دھو کر پہن لیتی تھی۔ وہ اس طرح کہ رات کو بتی بجھانے کے بعد ساری کو دھو کر سوکھنے کے لیے کمرے کی کھڑکی

کے پاس پھیلا دیتی تھی

اسی بر آمدے میں سوتی تھیں مجھے کبھی پوچھنے کا حوصلہ نہ ہوا کہ وہ کس طرح ساڑی دھوتی سکھاتی اور پہنتی ہیں۔ پوچھنا تو دور کی بات ہے سوچنے سے ہی حیا آتی تھی۔ وہ جو تخلیق کا سرچشمہ ہے جو بھائی جان کو مجھ کو اور آسی کو جنم دے کر اپنی جوانی کو بیوگی کی دھوپ میں سکھاتی اور جلاتی رہی' اب بڑھاپے میں صرف اولاد کے نام کو اوڑھ رہی تھی۔ کوئی پوچھنے والا نہ تھا کہ کیا دھوتی ہو اور کیا پہنتی ہو؟ کیونکہ اولاد شادی کے بعد صرف بیوی بچوں میں اپنا سب کچھ تقسیم کرتی رہ جاتی ہے۔

مجھے حیا آئی تو ایک رات میں گھر سے نکل گیا۔ مصمم ارادہ تھا کہ کہیں سے ماں کے لیے ایک ساری لاؤں گا۔ مجھے مزدوری نہیں آتی۔ بھیک مانگنا بھی نہیں آتا۔ صرف چھیننا جھپٹنا جانتا ہوں۔ ایسے وقت یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ میں کسی دوسری ماں کے بدن سے ساری نوچ کر اپنی ماں کو پہناؤں گا۔ میں کیا کروں مجھے حیا آرہی تھی۔ اکثر حالات میں ہم انسانوں کو صرف اپنے معاملے میں حیا آتی ہے۔

راستے میں ایک سپاہی نے مجھے روکا۔ میں نے گڑگڑا کر کہا۔ "میری ماں سخت بیمار ہے مجھے جانے دو۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔"

سپاہی کی بھی ایک ماں ضرور ہوگی۔ اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں فقیرا پل کے پاس پہنچ کر گلیوں میں بھٹکنے لگا۔ شہر میں ایک عرصے سے خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا اس لیے بہت سے گھروں میں روشنی نظر آئی۔ سہمے ہوئے لوگ گہری نیند نہیں سوتے تھے۔ تھوڑی دیر میں یہ بات سمجھ میں آگئی کہ کسی پکے مکان میں دال نہیں گلے گی۔ جن کے پاس مال ہے وہ ہوشیاری سے راتیں گزارتے ہیں اور انہوں نے یقیناً حفاظتی اقدامات بھی کیے ہوں گے۔

میں بانس کی ایک جھونپڑی کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ اندر سے ایک عورت کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے بچے سے کہہ رہی تھی۔ "چپ کورے گھم کورے لو ایک ماوڑا آشتے چھے (چپ چاپ سو جاؤ۔ ایک بہاری آرہا ہے۔)"

یہاں اردو بولنے والے سب ہی بہاری نہیں ہیں پنجاب' یوپی اور مدراس کے لوگ بھی اردو بولتے ہیں لیکن سب ہی بہاری کہلاتے ہیں اور نفرت سے انھیں ماوڑا کہا جاتا

ہے۔ پہلے تو مجھے یوں لگا جیسے اس عورت کو میری آمد کا علم ہوگیا ہے کہ ایک بہاری آرہا ہے لیکن کیسے؟ میں بہاری نہیں ہوں' میں بنگالی نہیں ہوں' میں مدراسی اور پنجابی بھی نہیں ہوں۔ اگر میں انسان ہوں تو پھر شوکت صدیقی کا "تیسرا آدمی" ہوں جو آدمیوں کے درمیان آدمیت کو ذبح کرتا ہے۔

میں کچھ دیر تک بانس کی دیوار سے لگا کھڑا رہا۔ اس عورت کی بکواس سے پتہ چل گیا کہ اس کا شوہر نائٹ ڈیوٹی کے لیے گیا ہے۔ میں نے دروازے کے پاس پہنچ کر ہولے سے دستک دی۔ اندر سے آواز آئی۔ "کے؟ (کون)"

میں نے کہا "تمہارے شوہر کو حادثہ پیش آیا ہے' وہ ہسپتال میں ہے۔"

دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ میرے ایک ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ چیختی' میں نے دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ "خبردار آواز کروگی تو تمہیں اور تمہارے بچے کو مار ڈالوں گا۔"

میں نے دروازہ بند کردیا۔ اس کی خوب صورت سی کٹورا جیسی آنکھیں دہشت سے پھیل گئی تھیں۔ اس کے بدن پر بھی ایک ہی ساری تھی۔ اس گھر کو دیکھ کر مایوسی ہوئی کیونکہ وہ بنگال کے کروڑوں گھروں کی طرح ایک خالی گھر تھا۔ بچہ چٹائی پر سو رہا تھا۔

میں اسے چھوڑ کر بچے کے پاس دوزانو ہوگیا اور عورت سے کہا۔ "اگر اس کی زندگی چاہتی ہو تو کپڑا چاول اور نقد رقم لے آؤ۔"

وہ فرش پر گھٹنے ٹیک کر اور ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "تم خود ہی دیکھ لو۔ یہاں کچھ نہیں ہے۔ کھوکا کے باپ کو ابھی تنخواہ نہیں ملی' میں نے اسے بھوکا سلایا ہے۔"

میں جھلا گیا۔ اتنے عرصے بعد چوری کا موقع ملا تو بھی کچھ ہاتھ نہیں آرہا تھا۔ میں نے کہا۔ "میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے کم از کم ایک ساری چاہیے۔ ورنہ میں......"

میں نے بات ادھوری چھوڑ کر چاقو کی نوک خوابیدہ بچے کے سینے پر رکھ دی۔ وہ ماں ہی سے سرہلا کر نہیں نہیں کی گردان کرتے ہوئے بولی۔ "میں دوں گی۔ میں تمہیں ساری لا کر دوں گی۔ چاقو ہٹالو نہیں تو میرا دم نکل جائے گا۔"

وہ اٹھ کر دوسرے کمرے کا دروازہ کھولنے لگی۔ میں نے دھمکی دی کہ کسی کو اگر بلائے گی یا شور مچائے گی تو بچہ زندہ نہیں ملے گا۔ ویسے ماؤں کی ممتا کو کون نہیں سمجھتا۔ وہ

حلق سے ذرا سی بھی آواز نکال کر اپنے بچے کی زندگی کو داؤ پر نہیں لگا سکتی تھی۔

میں نے دیکھا وہ دروازے کے پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔ بانس کی تیلیوں سے بنے ہوئے دروازے کے پیچھے کوئی موجود ہو تو اس کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ایک آدھ سوراخ سے وہ جھلک رہی تھی۔ شاید اپنی ممتا کا حساب کر رہی تھی۔

ممتا کے پلڑے میں اپنی شرم کو تولنے والی عورت نے سمجھ لیا کہ حیا کا کوئی وزن نہیں ہے۔ ذرا دیر بعد دروازے کے پیچھے سے اس عورت کا ہاتھ باہر آیا۔ اس ہاتھ میں ایک لپٹی ہوئی ساری تھی۔

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ ساری انسانی تہذیب کے بدن سے اتر کر آئی تھی۔ میں اندر سے لرزنے لگا۔

اس نے ساری کو میری طرف فرش پر پھینک دیا۔ وہ ساری ایسے آئی جیسے تھوک آتا ہے جیسے میری ماں نے مجھ پر تھوک دیا ہو۔ لے جاؤ۔ یہ ساری اٹھا کر لے جاؤ۔ میں تم سب کو پیدا کرتی رہوں گی۔ تم سب مجھے بے عزت کرتے رہو گے۔ میں عورت ہوں، مجبور ہوں۔

میں نے بے اختیار دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیا۔ اگر ہم اپنی ماؤں اور بہنوں کو لباس میں چھپا سکیں تو اپنا منہ چھپانے کی ضرورت نہ پڑے۔ تب مجھے خیال آیا کہ میں ساری اٹھا کر اس کے پاس نہیں جا سکتا اور وہ دروازے کے پیچھے سے نہیں آسکتی۔ میں جلدی سے اٹھا اور بیرونی دروازہ کھول کر باہر تاریکی میں بھاگتا چلا گیا۔

اس دن سے میرا مزاج بدل گیا۔ کوئی عورت سامنے سے گزرتی تو میری آنکھیں جھک جاتیں۔ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر حیا کا طمانچہ پڑتا ہے تو شرم آہی جاتی ہے۔

چونکہ میں انسان ہوں اس لیے شریف بھی ہوں اور بدمعاش بھی۔ میں نے عورتوں کی عزت کرنا سیکھ لیا لیکن چوری اور ہیرا پھیری باقی رہی کیونکہ پیٹ پالنے کے یہی ڈھنگ آتے تھے۔

دسمبر کا مہینہ گولہ بارود کے دھماکوں سے گزرنے لگا۔ پھر ہم بنگلہ دیشی بن گئے۔ پہلے ہم ہندوستانی تھے پھر پاکستانی ہوئے اور اب تیسرے ملک کے باشندے بن گئے۔ مجھے تاریخ یاد نہیں اتنا یاد ہے کہ اس رات ہم مکان کا دروازہ اندر سے بند کیے سہمے سہمے بیٹھے

تھے۔ پاس پڑوس والے بتا رہے تھے کہ مکتی باہنی والے بہاریوں کے گھروں پر چھاپے مار رہے ہیں۔ مردوں کو گولی سے اڑا رہے ہیں۔ بچوں کو خنجر کی نوک پر اچھال رہے ہیں اور...... اور ساریاں اتار رہے ہیں۔

مجھے ڈرنا نہیں چاہیے تھا کیونکہ میری کلثوم بنگالی تھی۔ میں بھی بھاشا روانی سے بول سکتا تھا۔ امی کو ہم گونگی بنا دیتے لیکن ہم سب طاق پر رکھے ہوئے کلام پاک کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اگرچہ مکتی باہنی کی فوج میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی اور وہ بحیثیت مسلمان کلام پاک کا احترام کرتے تھے۔ اس کے باوجود ہمیں خطرہ تھا۔ کیونکہ جو مقدس کتاب ہمارے گھر میں تھی، اس کی آیتوں کا ترجمہ اردو میں تھا۔ اس طرح ہم پہچان لیے جاتے کہ ہم اردو پڑھنے اور بولنے والے بہاری ہیں۔

میں نے کہا۔ "کلثوم! تم یہ قرآن مجید کسی پڑوسی کے ہاں پہنچا دو۔"

امی نے کہا۔ "لڑکے تیرا دماغ چل گیا ہے۔ اتنی زندگی چوری چکاری میں گزار دی۔ اب کلام پاک کے سائے میں جان جائے گی تو ہمارے کچھ نہ کچھ گناہ دھل جائیں گے۔ میں اسے اپنے سینے سے لگا کر رکھوں گی۔"

انہوں نے طاق پر سے کلام پاک کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس پر اتنی گرد جمی ہوئی تھی کہ امی کو کھانسی آگئی۔ مجھے یاد نہیں کہ کتنے برس پہلے ہم نے یہ مقدس کتاب طاق پر رکھی تھی۔ اسے سینے سے لگانا یا پڑھنا تو دور کی بات ہے۔ ہم نے کبھی ادھر منہ کر کے دیکھا بھی ہوتا تو پتہ چل جاتا کہ ہمارے ایمان پر صدیوں کی گرد جمی ہوئی ہے۔

میں نے کہا۔ "امی! ہم کچھ دنوں کے لیے اس کتاب کو کسی کے ہاں رکھوا دیں گے تو بے دین نہیں بن جائیں گے۔ ایمان تو دل میں ہوتا ہے۔ کیا آپ کو اپنی ڈولی سے پیار نہیں ہے۔ وہ ظالم لوگ اس ننھی سی بچی کو بہاری کی اولاد سمجھ کر مار......"

امی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ گھبرا کر بولیں۔ "نہیں، نہیں، میری بچی کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ میں کلام پاک کو مسجد میں رکھ آؤں گی۔"

انہوں نے مقدس کتاب کو زور سے بھینچ لیا۔ اس پر پیشانی ٹیک کر رونے لگیں۔ وہ کتاب چودھویں صدی کے آخری چند سالوں سے گزر رہی تھی۔ چودہ سو سال کی تاریخ میں ایسے موڑ بھی آئے ہیں جب مسلمانوں نے اپنی مقدس کتاب کو کافروں کے سائے

سے بچانے کے لیے ایک ملک سے دوسرے ملک ہجرت کی ہے لیکن اسلام کی تاریخ میں پہلی بار ایسا موڑ آیا تھا کہ چند مسلمان دوسرے چند مسلمانوں سے اپنی جان بچانے کے لیے کلام پاک کو اپنے گھر سے مسجد تک پہنچانے پر مجبور ہوگئے تھے اور یہ صرف اس لیے کہ اس کے ترجمہ اور تفسیر کی زبان اردو تھی۔

یہ اردو کیا ہے؟ اردو بابائے ملت حضرت قائد اعظم محمد علی جناحؒ کی زبان کا معاہدہ ہے کہ پاکستان کی زبان اردو اور صرف اردو ہوگی۔ اور یہ اردو حسینؓ کا سر ہے۔ تاریخ کے ہر کربلا میں اس کا سر قلم کیا جاتا ہے۔

عربی' فارسی' انگریزی' ہندی اور بنگالی زبانوں کو محبت سے اپنے دامن میں سمیٹنے والی کا نام اردو ہے۔ پھر بھی یہ دیش بدیش بھٹکتی ہے اور اس کے بولنے والے بھی جانے کب تک خانہ بدوش رہیں گے۔ کب تک اپنی جانیں اور اپنی عورتوں کی عصمتیں لٹاتے رہیں گے؟

امی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ زبان ہم سب کو ایک ایک کرکے ختم کردے گی۔ میں اسے مسجد میں چھوڑ آتی ہوں۔"

میں نے ان کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔ "نہیں امی! آپ ان کی زبان اچھی طرح نہیں بول سکتیں۔ میں جاؤں گا۔"

کلثوم نے میرا راستہ روک لیا۔ "ناتی تھا کو آمی جابو (نہیں تم رہو۔ میں جاؤں گی)"

'ڈولی اپنی ماں کے پاؤں سے لپٹ کر رونے لگی۔ میں اپنی ماں کے سائے سے' کلثوم میرے سائے سے اور ڈولی کلثوم کے سائے سے محروم نہیں ہونا چاہتی تھی۔ ہم سب ایک دوسرے کے سائے سے بندھے ہوئے تھے۔ ایک ساتھ مر سکتے تھے مگر بچھڑ کر مرنا منظور نہ تھا۔

کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ سب تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ رات زیادہ ہونے لگی تو میں نے چٹائی پر لیٹتے ہوئے کہا۔ ہمیں یہ جگہ چھوڑ دینا چاہیے۔ یہاں کچھ لوگ مجھے پہچانتے ہیں۔"

کلثوم نے مشورہ دیا کہ ہم سب اس کے میکے چلے جائیں۔ وہاں کوئی ہمیں بہاری کی حیثیت سے نہیں پہچان نہیں سکے گا۔ یوں بھی میرا کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا۔ بیوی کے

میکے میں کچھ عرصے تک مفت گزارا ہوسکتا تھا۔

امی ایک گوشے میں کلام پاک کو بدستور سینے سے لگائے بیٹھی تھیں اور ممتا بھری نظروں سے سہم سہم کر کبھی مجھے اور کبھی ڈولی کو دیکھ رہی تھیں۔ میں نے انہیں سو جانے کے لیے کہا اور خود سو گیا۔

رات کو کسی وقت کلثوم کی بھی آنکھ لگ گئی۔ ہم پچھلی کئی راتوں سے آدھی نیند سوتے تھے اور اس آدھی نیند میں بھی مارے دہشت کے جاگتے رہتے تھے۔ چونک چونک کر اٹھ بیٹھتے تھے۔ زندگی میں پہلی بار معلوم ہوا کہ نیند ہمیں ڈرانے کے لیے سلاتی ہے۔ یک بیک میری آنکھ کھل گئی۔ جیسے موت نے دھاوا بول دیا ہو۔ میرے ساتھ کلثوم بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

میں نے چاروں طرف دیکھا۔ امی نظر نہیں آئیں۔ شاید وہ قرآن شریف مسجد میں رکھنے نکل گئیں تھیں۔ ابھی کچھ اندھیرا تھا۔ میں کچھ دیر امی کا انتظار کرتا رہا پھر صبح ہوتے ہی میں ان کی تلاش میں نکل گیا۔

میں نے سب سے پہلے مسجد میں جاکر پیش امام سے پوچھا۔ "کیا یہاں میری امی کلام پاک لے کر آئی تھیں؟"

پیش امام نے مجھے ہمدردی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا وہ تمہاری ماں تھی؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے میرے شانہ پر ہاتھ رکھ کر لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کا نیک مقصد پورا ہوگیا۔ اس نے کلام پاک کو یہاں پہنچا دیا مگر وہ تمہارے پاس اب کبھی نہیں پہنچ سکے گی۔"

میرے دل اور دماغ کو شدید جھٹکا پہنچا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "شاید وہ گونگی تھی یا بولنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ لوگ پوچھتے رہے کہ وہ کہاں سے آئی ہے؟ اور یہ اردو ترجمہ پڑھنے والے کون لوگ ہیں؟ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔"

میں نے چشم تصور میں دیکھا کہ امی کی نگاہوں کے سامنے اپنے بیٹے اور پوتی کی صورتیں گھوم رہی تھیں اور میرے کانوں میں پیش امام کی آواز آرہی تھی۔ "میں سمجھتا ہوں تمہاری ماں گونگی بن گئی تھی۔ جب بار بار پوچھنے کے باوجود وہ کچھ نہ بولی تو ایک مکتی باہنی کے جوان نے رائفل کے کندے سے اس کے منہ پر ضرب لگائی۔ وہ فرش پر گر کر

تڑپنے لگی۔ دو جوانوں نے رائفل کے کندے تان کر پھر سوال کیا مگر وہ ہمیشہ کے لیے شانت ہو گئی تھی۔"

میں روتے روتے مسجد کے زینے پر بیٹھ گیا۔ میری نگاہوں کے سامنے دین و دنیا مسجد و بت خانے سب ہی گڈمڈ ہونے لگے۔ وہ مسلمان ہیں جو قتل ہو رہے ہیں وہ بھی مسلمان ہیں' جو قتل کر رہے ہیں۔ میدان کربلا میں بھی قاتل اور مقتول مسلمان تھے۔ کیسے فیصلہ ہو کہ کون حق پر ہے؟ اگر کسی نے میری ماں کی زندگی اتاری تھی تو میں نے بھی کسی ماں کی ساری اتاری تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میرا احساس جاگ گیا تھا۔ میں نے ساری واپس کر دی تھی وہ زندگی واپس نہیں کر سکتے تھے۔

ہم دکھن منڈی کا مکان چھوڑ کر ہسپتال میں آ گئے۔ میرے ساس سسر ہمارا خرچ اٹھا رہے تھے۔ میں تو جیتے جی مر گیا تھا۔ امی کی ابدی جدائی نے مجھے نڈھال کر دیا تھا۔ پھر پتہ چلا کہ آسی گم ہو گئی ہے۔ میں ایک دم سے تلملا گیا۔ آدمی خواہ کتنا ہی بے حس ہو' جوان بہن کی گمشدگی سے اس کی غیرت ضرور جاگتی ہے۔ اگر وہ اپنی جان کی سلامتی کے باعث دشمنوں کو نہ للکارے تو اپنے آپ کو للکارتا ہے اور اپنے بچھڑے ہوئے رشتوں کو تلاش کرتا ہے۔

میں محمد پور پہنچا تو پتہ چلا کہ میرے بھائی جان کا گھر ایوب گیٹ کے قریب تھا اور فارم گیٹ کی طرف سے حملہ ہو سکتا تھا اس لیے وہ محفوظ نہ رہ سکتے تھے۔ وہ پناہ لینے کے لئے میرے پاس دکھن منڈی کی طرف چلے گئے تھے۔ دوپہر کو میرے بھائی جان کا بڑا لڑکا ہانپتا کانپتا آیا۔ اس نے بتایا کہ امی ابا اور چھوٹا بھائی سب ہی مارے گئے ہیں۔ آسی جوان تھی۔ حملہ آور اسے اٹھا کر کہیں لے گئے۔ میرا بھتیجا بڑی مشکلوں سے بھاگ کر چھپتا چھپاتا محمد پور تک واپس آیا تھا۔ وہاں کتنے ہی لوگ اسے اپنے ہاں پناہ دینا چاہتے تھے لیکن وہ میرپور کی طرف چلا گیا۔

میں اس کو تلاش کرنے کے لیے میرپور پہنچا۔ اس کے ذریعے آسی کا سراغ لگایا جا سکتا تھا۔ میں نے میرپور میں کتنے ہی لوگوں کو اپنے بھتیجے سلمان کا حلیہ بتایا کہ وہ دبلا پتلا سا اٹھارہ برس کی عمر کا لڑکا ہے۔ کئی لوگوں نے ایسے ایک لڑکے کو دیکھا تھا۔ ایک شخص نے کہا "جناب! وہ پاگل ہو چکا ہے۔ ادھر ادھر مارا مارا پھرتا ہے۔ کسی کے ہاں پناہ نہیں

لیتا۔ کوئی اسے کھانے کے لیے دیتا ہے تو وہ دودھ مانگتا ہے۔ کہتا ہے۔ امی کا دودھ پیوں گا۔ مگر کیسے پیوں گا۔ انہوں نے امی کی چھاتی کاٹ ڈالی۔ کہنے لگے۔ اب یہ بہاریوں کی نسل کو دودھ نہیں پلائے گی۔ میں پیوں گا۔ میں پیوں گا۔ امی دودھ......"

میں چکرا کر زمین پر گر پڑا۔ جنگل کے درندوں نے کبھی اپنی نسل کے خاتمے کے لیے کسی کی کوکھ نہیں جلائی۔ دودھ کے چشمے کاٹ کر کبھی لہو کی نہر کا افتتاح نہیں کیا۔ ایسے کارنامے صرف تہذیب کے جنگلوں میں ہوتے ہیں۔

مجھے چپ سی لگ گئی۔ اب کچھ بولنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ جب ہم مر نہیں سکتے تو اپنے اندر خاموشی اور سناٹا طاری کر کے عارضی مردے بن جاتے ہیں۔ مجھے اپنے اندر کی موت سے کچھ سکون حاصل ہو جاتا تھا۔ کلثوم شکایتیں کرتی تھی کہ پہلے میں کام چور تھا۔ ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتا تھا۔ اب زبان بھی نہیں ہلاتا۔ کچھ پوچھو تو ہوں ہاں کہہ کر ٹال دیتا تھا۔

لیکن میرے پاؤں گردش میں تھے۔ میں آسی کو تلاش کرنے کے لئے محلے محلے گھومتا رہتا تھا۔ بائیس چوبیس برس کی کسی جوان لڑکی کو دور سے دیکھ کر بھاگتا ہوا جاتا پھر قریب پہنچ کر مایوس ہو جاتا تھا۔ کبھی کبھی شام کو بوڑھی گنگا کے کنارے جاتا تھا کیونکہ اکثر وہاں سے لاشیں بہتی ہوئی گزرتی تھیں۔ بہت سی لاشوں کو ساحل تک لایا جاتا تھا لیکن ان میں آسی نظر نہیں آئی۔

دن' مہینوں اور سالوں میں بدلتے جا رہے تھے۔ دن بہ دن مہنگائی ایسے بڑھتی جا رہی تھی کہ اناج اور کپڑا عام لوگوں کی قوت خرید سے باہر ہو چکا تھا۔ سیدھے سادے لوگ ایک وقت کسی طرح کھاتے تھے اور دوسرے وقت شرافت سے فاقے کرتے تھے۔ کچھ لوگ ہیرا پھیری سے پیٹ پال رہے تھے اور کچھ ایسے تھے جو جرائم میں اضافہ کر رہے تھے۔ ایسی خبریں بھی موصول ہوتی تھیں کہ کپڑا نہ ہونے کے باعث مرنے والوں کو کیلے کے پتوں میں لپیٹ کر دفن کیا جا رہا تھا۔

ان حالات میں میرے سسرال والے ہمارا بوجھ مزید نہیں اٹھا سکتے تھے۔ میں نے ملازمت کی کوشش کی تو ایک ماہ کی بھاگ دوڑ کے بعد ریڈ کراس کے ایک امدادی کیمپ میں وارڈ بوائے کا کام مل گیا۔ میں ایک بہاری نرس کا اسسٹنٹ تھا۔ اس کے علاوہ چار

نوجوان تھے جو دوسرے تمام شہروں کے امدادی کیمپوں سے رابطہ قائم کر کے ایسے لوگوں کی فہرستیں تیار کرتے تھے جو اپنے عزیزوں سے بچھڑ گئے تھے۔ اس طرح بہت سے لوگوں کا بھلا ہوتا تھا۔ ان فہرستوں کے ذریعے معلوم ہو جاتا تھا کہ ان کا کون سا عزیز کس شہر یا علاقے میں ہے۔

ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ تھی جو کھانا اور کپڑا حاصل کرنے کیمپ میں آتے تھے۔ ریڈ کراس سوسائٹی کروڑوں بھوکے اور ننگے لوگوں کو چاول اور کپڑا فراہم نہیں کر سکتی تھی۔ ہمارے کیمپ کے ایک انگریز نے کہا۔ "اس قدر بھوک اور افلاس کے باوجود آبادی بڑھ رہی ہے۔ لوگوں سے کہو کہ وہ خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کریں۔ بچے کم ہوں گے تو اناج اور کپڑے کی قلت نہیں ہوگی۔"

ہم لوگوں کو سمجھانے لگے لیکن ہمارے سمجھانے سے کیا ہوتا ہے؟ ایک طویل مدت سے خاندانی منصوبہ بندی کی اہمیت اور افادیت سمجھائی جا رہی ہے اور جتنا زیادہ سمجھایا جا رہا ہے اتنے ہی زیادہ بچے ہوتے رہتے ہیں۔ جب خاندانی منصوبہ بندی کے لیے ہمارے کیمپ میں کوئی نہ آیا تو انگریز صاحب نے کہا۔ "اپنے لوگوں کو کوئی لالچ دو۔ ان سے بولو کہ جو عورت آپریشن کرائے گی' اسے ایک ساری دی جائے گی اور نس بندی کرانے والے مرد کو ایک لنگی اور ایک بنیان ملے گی۔"

موجودہ حالات میں یہ بہت بڑا لالچ تھا۔ ہماری ایک ٹیم نے محلے محلے جا کر یہ اعلان کیا تو کچھ لوگ آنے لگے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ وہ سب لنگی اور ساری کے لالچ میں آ رہے تھے۔ ہم رسمی طور پر ان سے سوالات کرتے تھے کہ کب شادی ہوئی اور ابھی ان کے کتنے بچے ہیں؟ وہ جو جواب دیتے تھے ہم یقین کر لیتے تھے۔ زیادہ تحقیقات کرنے کے لیے ہمارے ہاں کارکنوں کی کمی تھی۔

ایک بار ایک بوڑھی عورت میلی اور پھٹی ہوئی ساری پہن کر آئی۔ سسٹر نے اسے دیکھ کر کہا۔ "ماں جی! تم اس عمر میں یوں بھی بچے پیدا نہیں کر سکتیں۔ تم کس لیے آئی ہو؟"

وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ "کیا پیدا کروں گی۔ تب ہی ساری دو گی؟ تم جوان چھوکری ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میرے بڑھاپے کا مذاق اڑاؤ۔"

سسٹر نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "مائی! معاف کرو۔ جھگڑا کرنے سے ساری نہیں ملے گی۔"

"تو پھر آپریشن کرو۔"

ہم سب اس بڑھیا کو حیرانی سے تکنے لگے۔ سسٹر اسے واپس جانے کے لیے کہہ رہی تھی۔ اس نے جھنجلا کر سسٹر کا گریبان پکڑ لیا۔ اور غصے سے لرزتے ہوئے بولی۔ "دیکھو میری ساری ایسی تار تار ہو رہی ہے کہ اب یہ مجھے چھپا نہیں سکتی۔ مجھے موت بھی نہیں آتی۔ بتاؤ کہ میں کس کے سامنے یہ دھجیاں اتاروں؟ کس حرامی بچے کی ماں بنوں کہ تمہیں یقین آجائے؟"

سسٹر کو پسینہ آنے لگا۔ ہم چار آدمی اس بڑھیا کو پکڑ کر ایک طرف لے گئے۔ اسے دیر تک سمجھاتے رہے۔ پھر اسے لالچ دیا کہ اگر وہ پانچ عورتوں کو آپریشن کے لئے لے آئے تو اسے ایک ساری دے دی جائے گی۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔

اکثر ایسی عورتیں اور مرد ہمارے لیے پریشانیوں کا باعث بن جاتے تھے۔ ایک دن ایک نوجوان لڑکا آیا۔ اس کی عمر بمشکل سولہ یا سترہ برس کی ہوگی لیکن وہ اپنی عمر پچیس برس بتا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "تم کپڑے کے لالچ میں آئے ہو۔ تمہاری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی ہوگی۔"

اس نے کہا۔ "میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری ایک بیوی ہے اور ایک بچہ ہے۔ ہم ایک بچے سے زیادہ بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔"

اس کی باتوں کا یقین کرنا پڑا کیونکہ ہنگاموں کے دوران بہت سے کم عمر لڑکوں اور لڑکیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ بہت سے گھرانوں میں جوان لڑکیوں کی عزت و آبرو قائم رکھنے کے لیے جو لڑکے بھی ملے' ان سے نکاح پڑھا دیا گیا۔ اس طرح یہ ہوا کہ ایک تو لڑکیاں عزت و آبرو سے رخصت ہو گئیں دوسرے یہ کہ جوانوں پر ان کی حفاظت کی ذمے داریاں عائد ہو گئیں۔

اس لڑکے نے کہا۔ "میرا نام ارشد ہے۔ میرے خاندان کے سب ہی لوگ مارے جا چکے ہیں۔ میں تنہا تھا۔ ایک شریف خاندان کے بزرگ نے اپنی صاحبزادی سے نکاح پڑھا دیا۔ اب میرا ایک بچہ ہے۔ میں اور بچے نہیں چاہتا۔ میں نس بندی کے لیے آیا

ہوں مگر میری ایک شرط ہے۔"

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا پھر ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "مجھے لنگی اور بنیان نہیں چاہیے۔ میں ساری لوں گا۔"

ہمیں اس پر بڑا پیار آیا۔ وہ بحیثیت مرد اپنے فرائض کو سمجھ رہا تھا کہ پہلے اپنی عورت کی عزت کو ڈھانپنا چاہیے۔ ہماری خاندانوں کے بزرگوں نے حالات کے پیش نظر دانش مندانہ فیصلے کیے تھے۔ اپنی لڑکیوں کو نوجوانوں کے نکاح میں دے کر انہیں معاشرے کا ذمے دار فرد بنا دیا تھا۔

ارشد شام تک ایک ساری لے کر چلا گیا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ اب وہ کبھی باپ نہیں بن سکے گا۔ ایک بچے کا کیا بھروسہ جب کہ ہزاروں بچے بے موت مارے گئے تھے۔ اگر ارشد کے اکلوتے بچے کی زندگی نے وفا نہ کی تو کیا ہوگا؟

میں نے کہا۔ "اتنی کم عمری میں ایک بچے والے کی نس بندی نہیں کرنی چاہیے۔"

سب نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ شاید سب لوگ یہی سوچ رہے تھے۔ ایک نے کہا اگرچہ ہم دو یا تین بچوں کی شرط لگائیں گے تو کپڑے کے لالچ میں آنے والے تین بچوں کا حساب دیں گے۔ ہمارے پاس آدمی کہاں ہیں کہ ان کے گھروں میں جا کر صحیح معلومات حاصل کریں۔"

کبھی کبھار اتفاقاً معلومات حاصل ہو جاتی تھیں۔ ایک ہفتے بعد نرائن گنج سے ایک بیمار بوڑھے کو کیمپ میں پہنچایا گیا۔ اس نے اپنے بیٹے کا پتہ بتایا جو میرپور میں رہتا تھا۔ میں ایک ساتھی کے ساتھ اس کے بتائے ہوئے پتے پر میرپور پہنچا۔ وہاں پتہ چلا کہ وہ نیپال کے راستے پاکستان جانے کے لیے یہاں کی سرحد پار کر چکا ہے۔ ہم ناکام ہو کر لوٹنے لگے۔ گوردہاٹ کے قریب پہنچ کر یاد آیا کہ ارشد نے اسی جگہ کا پتہ لکھوایا تھا۔ جب وہاں تک پہنچ ہی گئے ہیں تو اس کی خیریت معلوم کر لینا چاہیے۔

ہم وہاں کے لوگوں سے پوچھتے ہوئے ایک جھونپڑی کے سامنے پہنچ گئے۔ تقدیر عجب تماشے دکھاتی ہے۔ وقت کو جیسے میرا انتظار تھا۔ اسی وقت جھونپڑی کا دروازہ کھلا تو میں ٹھٹک گیا۔ وہ بھی دروازے پر ٹھٹک گئی تھی۔ چند ساعت کے لیے ہم پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ پھر میں چیختا ہوا آسی کو پکارتا ہوا دروازے پر آیا اور اس سے لپٹ کر بے اختیار

رونے لگا۔ وہ بھی بلک بلک کر رو رہی تھی۔ میرا ساتھی باہر کھڑا رہا۔ میں نے دروازے کو بند کرتے ہوئے پوچھا۔ "تم کہاں گم ہو گئی تھیں؟"

اس نے جواباً دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھپا لیا۔ مجھے غلطی کا احساس ہوا کہ اب کسی بھائی یا باپ کو اپنی بہن یا بیٹی سے یہ سوال نہیں کرنا چاہیے۔ گم شدگی کے پیچھے چھپے ہوئے واقعات کا اندازہ کرتے ہوئے حیا آتی ہے۔

میں نے دوسرا سوال کیا۔ "تم یہاں کیسے پہنچ گئیں۔ یہ کس کا مکان ہے؟"

وہ دھیمی آواز میں بولی۔ "یہ میرے منے بھائی کا گھر ہے۔ میں غنڈوں سے پیچھا چھڑا کر بھاگتی ہوئی ادھر سے گزر رہی تھی۔ منے بھائی نے مجھے اس گھر میں چھپا لیا۔ میں چھ ماہ سے یہاں رہ رہی ہوں۔ وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ مجھے آپا جان کہتا ہے۔ تقدیر نے مجھ سے سارے رشتے چھین لیے مگر ایک چھوٹے بھائی کا پیار دے کر زندہ رہنے پر مجبور کر دیا۔"

میں آسی سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کلثوم کے میکے کیوں نہ آگئی لیکن شرم سے جھکی ہوئی گردن اور نگاہیں بتا رہی تھیں کہ ہم سے نگاہیں ملاتے ہوئے اب اسے حیا آتی تھی۔

اتنے میں ارشد دروازہ کھول کر اندر آیا پھر مجھے دیکھتے ہی گھبرا گیا۔ آسی نے میرا تعارف کرایا۔ وہ جلدی سے چٹائی بچھاتے ہوئے بولا۔ "آپ میرے بھائی جان ہیں۔ آیئے بیٹھیے۔"

میں نے پوچھا۔ "تمہاری بیوی اور بچہ کہاں ہیں؟"

"بیوی؟ بچہ؟" آسی نے حیرانی سے کہا۔ "ابھی تو منے بھائی کی شادی بھی نہیں ہوئی۔"

میرے دماغ کو بڑا سا جھٹکا پہنچا۔ تب میں نے دیکھا۔ آسی کی بدن پر وہی کیمپ سے لائی ہوئی ساری تھی اور میری بھیگی ہوئی آنکھوں کے سامنے منا بھائی سر جھکائے فرش پر اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔

○☆○

دیوانے پروانے

پروانے میں اس وقت تک جل مرنے کی لگن پیدا
نہیں ہوتی،
جب تک اس میں دیوانے جیسی دیوانگی پیدا نہ ہو۔
اور دیوانے کی دیوانگی اس وقت تک تشنہ ہے۔
جب تک اس میں پروانے کی طرح جل مرنے کی
بے باکی نہ ہو۔
وہ دیوانہ تھا، تیر کی طرح صرف محبت کے دل میں
ترازو ہوتا تھا۔
وہ پروانہ تھا۔ شمع کے باہر آگ ہوتی ہے۔ پروانے
کے اندر آگ تھی۔
اور پروانے کو اپنی آگ نہیں جلاتی
اسے شمع جلاتی ہے اور موم کے آنسو روتی ہے۔

دیوانے پروانے

[illegible] رڈی بابا کی کٹیا کے آگے ان کے عقیدت مندوں کا میلہ سا لگا تھا۔ عورتیں شب [illegible] کی پوریاں پراٹھے اور حلوے لے کر آئی تھیں۔ بچے پٹاخوں سے دل بہلا رہے [illegible] ڑھے کٹیا کے آس پاس موم بتیاں روشن کر رہے تھے اور نوجوان آنکھیں سینک [illegible] تھے۔

[illegible] ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ شادی بیاہ کی تقریب ہو یا عرس مبارک کا میلہ یا [illegible] کا دیدار، جہاں عورتیں ہوتی ہیں وہاں صرف کسی بزرگ سے عقیدت نہیں [illegible] چور محبتیں اور چور نگاہیں بھی ہوتی ہیں جو اس بھیڑ میں ایک دوسرے کو [illegible] ٹٹولتی رہتی ہیں۔

[illegible] رنگ برنگ آنچل لہرا رہے تھے۔ چہروں کی چاندنی میں جلتی ہوئی موم بتیاں ماند [illegible] تھیں۔ گوٹے کناری اور سنہری ستاروں سے مزین ملبوسات میں بجلیاں بھری تھیں [illegible] سے ادھر کوند رہی تھیں۔ پٹاخے چھوٹ رہے تھے ہفت رنگ مہتابیاں سرسراتی [illegible] ن کی طرف جا کر چیخ رہی تھیں اور رنگوں کے فوارے چھوڑ رہی تھیں۔ ان [illegible] دھوپ چھاؤں میں حسیناؤں کے چہروں پر کبھی نارنجی رنگ لہراتا، کبھی دھانی، کبھی [illegible]۔ کبھی وہ چہرے شہابی شہابی ہو جاتے اور ترستی نگاہوں کے لیے جوالی جوالی بن

جاتے۔ رنگ ونور کے سیلاب میں نگاہیں کہیں ٹھہرتی نہیں تھیں اور روگی بابا کو دعائیں دیتی تھیں۔

پھر تمام چہرے ماند پڑنے لگے۔

شاداں آرہی تھی۔

ستاروں کے جھرمٹ میں چاند طلوع ہو رہا تھا۔ پھولوں کی انجمن میں گلاب کھل رہا تھا۔ تمام نگاہیں خود بخود اس پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ وہاں جتنے رنگ تھے وہ سب کے سب اس کے حسین وجود میں سمٹ آئے تھے۔ وہ خراماں خراماں آرہی تھی۔ اس کی چال میں ایسی نزاکت اور لطافت تھی جیسے ریشم لہرا رہا ہو۔ اس ریشمی بدن کا نام خوب سوچ سمجھ کر شاداں رکھا گیا ہو گا۔

اس کے آگے پیچھے کنیزیں تھیں جو اپنے ہاتھوں میں حلوے پوریوں اور موم بتیوں کے تھال اٹھائے ہوئے تھیں۔ مرد' عورتیں' بچے اور بوڑھے سب کے سب دو حصوں میں تقسیم ہو کر اسے درمیان سے گزرنے کا راستہ دے رہے تھے۔ وہ جاگیردار چوہدری برکت علی بنگش کی بیٹی اور سات کڑیل بھائیوں کی ایک بہن تھی۔ سات گاؤں ادھر اور سات گاؤں ادھر تک ان کی زمینیں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ جہاں سے گزرتی' اس کی راہ میں آنکھیں بچھادی جاتیں۔ کتنے ہی دل والے ایسے تھے جو اس کے قدموں تلے اپنا دل بچھانا چاہتے تھے لیکن دولت کی افراط' جاگیرداری کا رعب اور خونخوار جلاد قسم کے سات بھائیوں کی ہیبت ایسی طاری تھی کہ شاداں کے جلو میں ہمیشہ موت نظر آتی تھی۔

چھپر پھاڑ کر دینے والے نے اسے بے حساب دولت کے ساتھ بے پناہ حسن بھی دیا تھا تاکہ نوجوان دور سے دیکھیں' تڑپیں' للچائیں اور آہیں بھرتے رہ جائیں۔ ایک بار کسی نوجوان کی آہیں سات بھائیوں تک پہنچ گئی تھیں۔ کہتے ہیں کہ ساتوں بھائی اسے پکڑ کر کہیں لے گئے تھے اور سات دنوں تک باری باری ہر بھائی اسے اذیتیں دیتا رہا۔ آٹھویں دن کپاس کے کھیت میں اس کی لاش ملی۔ اس کے جسم پر کوڑوں کے نشانات' جلتی ہوئی سلاخوں کے داغ' ٹوٹے ہوئے دانت اور اکھڑے ہوئے ناخن بتا رہے تھے کہ وہ اذیتوں اور عذابوں سے گزر کر موت کی آغوش تک پہنچا ہے۔

بستی والے لاش کو اٹھا کر تھانے لے گئے۔ پھر تھانے والوں کے حکم سے مجبور ہو کر

اسے چپ چاپ قبرستان میں دفن کر آئے۔ ان دنوں انگریزوں کی حکومت تھی اور بنگش بھائی حکومت برطانیہ کے وفادار تھے۔ لہٰذا خون معاف تھے۔ اس واقع کے بعد پھر کسی نے شاداں کے لیے آہیں بھرنے کی جرات نہیں کی۔

دل کے تہ خانے میں آہوں کو قید کیا جا سکتا ہے مگر نگاہوں کو بے لگام ہونے سے روکا نہیں جا سکتا۔ وہ ان کے درمیان سے گردن اکڑائے سینہ تانے ایک شان بے نیازی سے گزر رہی تھی اور دل والے سہمی سہمی اور جھکی جھکی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے اور خاموشی سے سوچ رہے تھے کہ کوئی تو ہو گا جو اس حسن وشباب کی تجوری کو کھولے گا اور اس کے بھائیوں کی تنی ہوئی گردنوں کو جھکا دے گا۔ ہاں کوئی تو ہو گا......

وہ کٹیا کے دروازے کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ کنیزیں پرے ہٹ کر دروازے سے ذرا دور ہو کر کھڑی ہو گئیں۔ وہ دروازہ ہمیشہ بند رہتا تھا۔ صرف شاداں کی آمد پر کھلتا تھا۔ برسوں سے یہی دستور تھا۔ وہ روزانہ شام کو روٹیاں لے کر آتی تھی۔ روگی بابا کے نماز پڑھنے اور روٹیاں کھانے تک ان کے پاس ادب سے سر جھکائے بیٹھی رہتی تھی پھر خالی برتن لے کر واپس چلی جاتی تھی۔

کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ دنیا سے رغبت نہ رکھنے والے روگی بابا نے بھی ایک حسین امیرزادی کو لفٹ دی ہے۔ حالانکہ دست شفقت رکھنے کے لیے بستی میں اور بھی غریب لڑکیاں تھیں۔ ویسے حقیقت یہ ہے کہ روگی بابا اس سلسلے میں غیر جانب دار تھے۔ ان کی نگاہوں میں کسی کی دولت اور شان وشوکت کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ جاگیردار کی لڑکی شاداں بھی ان کے لیے ایک عام سی لڑکی تھی۔ شاداں اور روگی بابا کی قربت کا قصہ یوں ہے کہ شاداں کو بچپن میں سوکھے کی بیماری لگ گئی تھی۔ یہ مرض ایسا ہوتا ہے کہ جان لے کر ہی چھوڑتا ہے۔ وہ سات بیٹوں کے بعد ایک بیٹی تھی جو بڑی منتوں اور مرادوں کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ چوہدری برکت علی نے اس کا علاج کرنے کے لیے اپنی تجوری کا منہ کھول دیا۔ حکیم' ڈاکٹروں کی دوائیں کھلائیں۔ ٹونے ٹوٹکوں سے کام نکالنا چاہا لیکن وہ دن بہ دن سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچا بنتی چلی گئی۔ جب دنیا جہان کی دوائیں کام نہ آئیں تو وہ دعا کے لیے اس ننھی سی بچی کو لے کر کٹیا کے دروازے پر گئے۔

روگی بابا کی گوشہ نشینی کا یہ عالم تھا کہ اس علاقے کا جاگیردار چوہدری برکت علی بھی

کٹیا کے اندر جا کر ان کی عبادت میں مخل ہونے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے بیمار بچی کو دہلیز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"بابا! شاید میرے نصیب میں بیٹی نہیں ہے۔ میں مایوس ہو گیا ہوں لیکن آپ خدا کی ذات سے مایوس نہیں ہوتے۔ میں اسے آپ کے دروازے پر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ آپ کی دعاؤں کے طفیل یہ بچ گئی تو تمام عمر آپ کی خدمت کرتی رہے گی۔ یہ پہلے آپ کی خادمہ ہو گی پھر میری بیٹی کہلائے گی۔"

وہ دن تھا اور آج کا دن ہے۔ شاداں اس دروازے کی ہو کر رہ گئی۔ روگی بابا کسی کی خدمت گزاری پسند نہیں کرتے تھے۔ دنیاوی رشتے توڑنے کے باوجود انہوں نے شاداں کو گود میں کھلایا تھا۔ راتیں جاگ جاگ کر اس کی تیمارداری کی تھی اس لیے اس لڑکی سے انہیں گہری انسیت اور لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ انہوں نے ہر شام اسے کٹیا میں تھوڑی دیر کے لیے آنے کی اجازت دے دی تھی۔ شب معراج اور شب قدر کی شام کو بھی عام عقیدت مندوں کے لیے اس وقت تک دروازہ نہ کھلتا جب تک شاداں نہ آ جاتی۔ وہ بڑی خوش نصیب تھی کہ اسے دولت بھی ملی تھی عزت اور حسن بھی ملا تھا اور ایک درویش کی ترجیحی شفقت بھی۔ شاید ان ہی باتوں نے اسے حد سے زیادہ مغرور بنا دیا تھا۔

اس نے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا۔

"بابا دروازہ کھولیے۔ میں ہوں شاداں۔"

یہ کہہ کر اس نے چاروں طرف مجمع کو یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ عالی شان محل ہو یا فقیر کی جھونپڑی، ہر جگہ مجھے اولیت حاصل ہے۔

ایک حسین دوشیزہ بے اعتنائی اور بے نیازی کا مظاہرہ کرے تو وہ ستم شعار کچھ اور زیادہ حسین نظر آتی ہے بلکہ ایک چیلنج بن جاتی ہے کہ کوئی اس کی پرچھائیں تک نہیں پہنچ سکتا۔ وہاں اس مجمع میں کوئی تو ایسا دل جلا ہو گا جو اس چیلنج کو قبول کر رہا ہو گا اور اسے حاصل کرنے کے لیے دل ہی دل میں قسمیں کھا رہا ہو گا۔

دروازہ کھل گیا۔ کٹیا کے اندر وہ نیم تاریکی میں کھڑے ہوئے تھے۔ دراز قد، جھکی ہوئی کمر، کھانستا ہوا بڑھاپا اور کراہتی ہوئی آواز۔

"آؤ بیٹی! آ جاؤ......"

وہ پلٹ کر زمین پر بچھی ہوئی چٹائی پر آئے اور کٹیا کی پچھلی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ شاداں چٹائی پر دو زانو ہو کر موم بتی جلانے لگی۔ بابا نے کہا۔

"بیٹی! ایک سے زیادہ نہ جلانا۔"

"کیوں؟ میں تو پوری سو موم بتیاں لائی ہوں۔"

"دوسرے بھی تو لائے ہیں بیٹی! وہ بھی اس کٹیا کو روشن کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے تمہیں بارہا سمجھایا ہے کہ اپنی خوشی کے آگے دوسروں کی خوشیوں کو فراموش نہ کرو۔ یہ لوگ جو میرے دروازے پر آئے ہیں۔ وہ ایک ایک موم بتی کی تھوڑی تھوڑی سی روشنی مجھے دے کر خوش ہونا چاہتے ہیں۔ تم ان سے ان کا حق نہ چھینو۔"

وہ ناراضگی سے منہ پھلا کر بولی۔

"وہ بھی ایک جلائیں گے اور میں بھی ایک جلاؤں گی تو ہمارے درمیان فرق کیا رہ جائے گا۔ آپ یہ نہیں سوچتے کہ میں مرحوم برکت علی کی بیٹی ہوں۔ اگر کوئی ایک موم بتی جلاتا ہے تو مجھے سو سے زیادہ جلانا چاہیں۔"

"اگر کوئی ایک روٹی کھاتا ہے تو تمہیں سو روٹیاں کھانی چاہئیں۔ کیا تم امیری غریبی کی تفریق کے لیے سو روٹیاں ہضم کر سکتی ہو؟ میں تمہیں دنیاوی خواہشات سے چھڑا کر دین دار نہیں بنا سکتا مگر اتنی نصیحت ضرور کرتا ہوں کہ خود کو برتر نہ سمجھو۔ افضل اور برتر ذات صرف خدا کی ہے۔ تم عورت ذات ہو اور عورت ایک شمع کی مانند ہوتی ہے جو اپنی طبعی عمر تک جل جل کر اپنے گھر کی جنت کو روشن رکھتی ہے۔ ایک کسان کی بیٹی ہو یا جاگیردار کی لخت جگر، دونوں ہی کا کام جلنا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ جلنے والیاں اپنے گھروں کو بھی جلا کر رکھ دیتی ہیں۔"

شاداں نے ابھی ابھی ایک شمع روشن کی تھی۔ اسی وقت ایک پروانہ کہیں سے آ گیا تھا اور شمع کے اطراف چکر کاٹ رہا تھا۔ بابا کی نصیحتیں اب اس کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ وہ بڑی محویت سے اس پروانے کو دیکھ رہی تھی۔ بابا نے یہ تو کہا تھا کہ وہ شمع ہے مگر یہ نہیں کہا تھا کہ اس شمع کا طواف کرنے کے لیے کوئی پروانہ بھی آ سکتا ہے۔

وہ مغرور تھی مگر کسی پروانے کے متعلق سوچتی ضرور تھی۔ یہ ناممکن ہے کہ عمر کے الاؤ پر کورے بدن کی ہانڈی چڑھی ہو اور جذبات کی کھچڑی نہ پکتی ہو۔ وہ پکتی ضرور تھی مگر

بھائیوں سے سہمی رہتی تھی۔ اس کے بھائی کسی اونچے خاندان کے کسی ایسے بے وقوف نوجوان کی تلاش میں تھے جو شاداں سے شادی کر کے ان کی حویلی میں رہے اور شاداں کے حصے کی زمینیں لے کر الگ ہونے کا خواب نہ دیکھے۔ وہ بھی یہی سوچتی تھی کہ کوئی پروانہ اونچے خاندان سے اڑتا ہوا آئے لیکن وہ احمق نہ ہو بلکہ اس کے بھائیوں کی طرح دلیر ہو۔ وہ بچپن ہی سے بھائیوں کو دیکھتی آئی تھی۔ ان کے غرور اور غلبے' حاکمانہ اور ظالمانہ رویے' ان کی دلیری اور درندگی کو یکجا کر کے اس نے اپنے خیالوں میں ایک گبرو جوان کی تصویر بنائی تھی۔ وہ اس کے خیالوں میں آتا تھا اور محبت کی خیرات مانگنے کے بجائے اس سے چھین کر لے جاتا تھا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"آں۔" وہ چونک گئی۔ "جی کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔"

"جاؤ دروازہ کھول دو۔ دوسروں کو بھی آنے دو۔"

وہ چپ چاپ اٹھ کر دروازے تک گئی اور اسے کھول دیا۔

"اندر آجاؤ۔" اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"مرد عورتیں' بچے اور بوڑھے ایک ایک دو دو کر کے دروازے سے داخل ہونے لگے اور با آواز بلند بابا کو سلام کرنے لگے پھر کچھ لوگ دوزانو ہو کر ادب سے بیٹھ گئے۔ کچھ موم بتیاں جلانے لگے۔ مرد عورتیں سب کے سب کھچڑی ہو کر کٹیا میں بھر گئے تھے۔ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ شاداں خود کو بلند اور نمایاں رکھنے کے لیے بابا کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

کچھ لوگ بابا کو دیکھ رہے تھے اور کچھ شاداں کو تک رہے تھے۔ بابا کلام پاک اور احادیث کے حوالے دے کر نصیحتیں کر رہے تھے۔ شاداں ایک شان بے نیازی سے گردن اکڑائے سامنے دیوار کو تک رہی تھی۔ اپنے سے چھوٹے لوگوں پر نظر ڈالنا اس کی توہین تھی۔ وہ دیکھنے کے لیے نہیں خود کو دکھانے کے لیے پیدا ہوئی تھی۔

پھر ایسا ہوا کہ ایک گوشے میں بیٹھی ہوئی عورت کے سر سے چادر ڈھلک کر پیچھے جلتی ہوئی ایک موم بتی پر گر گئی۔ بتی کی لو نے چادر کو پکڑ لیا' چادر نے آگ قبول کر لی۔ ایک بچے نے چیخ کر کہا۔

"آگ۔ آگ لگ گئی....."

عورت نے گھبراہٹ میں اپنے بدن پر پڑی آدھی چادر بھی ایک طرف اچھال دی۔ چادر کے ساتھ آگ کے شعلے لپکتے ہوئے پیال کے بستر پر آئے اور چشم زدن میں گھاس کے بستر کو اپنی لپیٹ میں لیتے چلے گئے۔ لوگ ہڑبڑاتے شعلوں کو بجھانے کی کوشش کرنے لگے۔ عورتیں اور بچے چیخیں مارتے ہوئے دروازے کی جانب بھاگنے لگے۔

دروازہ چھوٹا تھا اس لیے مختلف سمت سے بھاگنے والے اس میں پھنس گئے تھے' الجھ رہے تھے' چیخ رہے تھے۔ اسی افراتفری میں کتنی ہی موم بتیاں ٹھوکروں میں آکر دیواروں کے پاس گر گئیں کچھ بجھ گئیں اور کچھ دیواروں کو چومنے لگیں۔ چھت گھاس پھوس کی بنی ہوئی تھی اور دیواریں بانس کی کھپچیوں سے کھڑی کی گئی تھیں۔ لہٰذا آگ پکڑتے دیر نہ لگی۔ ادھر بھی آگ ادھر بھی آگ۔ شعلے' تپش' دھواں اور کھانسیاں۔ راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ آگے بڑھتی تھی پھر لوگوں سے ٹکرا کر پیچھے لڑکھڑا جاتی تھی۔ سب کو اپنی اپنی فکر تھی کوئی ایک دوسرے کو نہیں پہچان رہا تھا۔ عورت ہو یا مرد سب ہی دروازے کی طرف بڑھنے کے لیے اسے پیچھے کی طرف دھکیل رہے تھے۔ کچھ عقیدت مند روگی بابا کو پہلے ہی اٹھا کر دروازے کی جانب لے گئے تھے۔ وہ اکیلی بھٹک رہی تھی۔ جاگیردار کی بیٹی' سات جیالے بھائیوں کی بہن سیکڑوں مربع گز زمین کی مالکہ جس کی راہ میں لوگ آنکھیں بچھاتے تھے۔ اس بھیڑ میں اکیلی رہ گئی تھی اور ایک معمولی لڑکی کی طرح ٹھوکریں کھا رہی تھی۔ وہ فریاد کرنا یا گڑگڑانا نہیں جانتی تھی مگر اس وقت گڑگڑا رہی تھی۔ اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی۔

"بچاؤ..... مجھے بچاؤ۔ مجھے راستہ دو..... ہائے ربا میں مرجاؤں گی....."

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ دھوئیں سے اس کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ بس اب میں گرنے ہی والی تھی۔ اسی وقت کسی نے اسے تھام لیا۔ اپنے بازوؤں کے حلقے میں قید کر لیا۔ سہارا ملتے ہی اس نے سنبھلنے کی کوشش کی۔ دماغ گھوم رہا تھا۔ جلتے ہوئے نظارے گھوم رہے تھے۔ ان شعلہ جوالہ نظاروں کے پیش منظر میں ایک خوب صورت نوجوان نظر آیا۔ وہ کون تھا' وہ نہیں جانتی تھی۔ کسی کو جاننے پہچاننے کا ہوش نہیں تھا۔ اس ایک ہی التجا تھی کہ وہ جو کوئی بھی ہے' اسے شعلوں کی لپیٹ سے نکال کر لے جائے۔

"مجھے بچاؤ۔ خدا کے لیے یہاں سے مجھے نکال لو۔ میں تمہیں منہ مانگا انعام دوں گی۔ ہائے اللہ تم میرا منہ کیا تک رہے ہو؟ مجھے یہاں سے نکالو......

اس نے دونوں بازوؤں میں اسے اٹھالیا جیسے وہ کوئی ننھی سی بچی ہو یا پھولوں کی لچکیلی ہوئی ٹہنی ہو یا منہ مانگا انعام ہو جسے اٹھانے میں زحمت نہیں ہوتی' راحت ملتی ہے۔

پھر وہ پچھلی دیوار کی جانب بڑھا۔ حالانکہ دروازے کی طرف اب بھیڑ نہیں تھی۔ کچھ لوگ رہ گئے تھے جو تیزی سے نکلتے جا رہے تھے۔ وہ بھی دروازے کے راستے آسانی سے نکل سکتا تھا لیکن وہ پچھلی دیوار کی جانب بڑھا جہاں شعلے بھڑک رہے تھے۔ دیوار آدھی سے زیادہ جل چکی تھی۔ اسے شعلوں کی جانب بڑھتے دیکھ کر شاداں نے ایک چیخ ماری اور اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر لپٹ گئی۔ وہ بھول گئی کہ وہ خود ایک شعلے کی طرح لپٹ کر اجنبی کو جلا رہی ہے۔ اجنبی نے دیوار پر ایک زوردار لات ماری۔ دیوار کا کچھ حصہ ٹوٹ کر دوسری طرف گر پڑا۔ پھر وہ دوڑتا ہوا۔ لپکتے دہکتے شعلوں کے درمیان سے گزرتا ہوا کٹیا کے پیچھے چلا آیا۔ پیچھے چند قدم کے فاصلے پر گندم کی فصل کھڑی تھی۔ وہ لہلاتی فصل کی ہریالی میں دور تک دوڑتا چلا گیا۔

ایسی بات نہیں تھی کہ کسی نے اسے دیکھا نہ ہو۔ سب ہی ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے لیکن بدحواسی میں پہچان نہیں رہے تھے۔ کتنے ہی مرد تھے جو عورتوں اور بچوں کو اٹھا کر شعلوں سے دور لیے جا رہے تھے۔ ان میں وہ اجنبی بھی تھا جو ایک لڑکی کو گلے کا ہار بنائے کھیتوں کی طرف چلا گیا تھا اور لوگوں نے دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیکھا تھا۔

شاداں گردن میں بانہیں ڈالے اس کے شانے میں منہ چھپائے' خوف سے آنکھیں بند کیے ہوئے تھی۔ وہ کچھ اس طرح خوفزدہ تھی کہ اب تک شعلوں کو اپنے آس پاس محسوس کر رہی تھی۔ بستی والوں کی آوازیں گڈمڈ ہو کر اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ آوازیں سمجھا رہی تھیں کہ وہ ابھی تک رقص کرتے ہوئے شعلوں کے درمیان ہے۔

پھر وہ آوازیں دور ہونے لگیں۔ دور ہوتے ہوئے معدوم ہونے لگیں۔ خطرہ دور ہوا تو وہ اپنی موجودہ حالت کو سمجھنے کے قابل ہوئی۔ تب اسے پتہ چلا کہ اب شعلوں کی تپش ختم ہو چکی ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں۔ کوئی اسے اٹھائے بھاگتا چلا

جا رہا ہے۔ ہر قدم پر اس کا بدن پھولوں بھری شاخ کی طرح جھٹکے کھا رہا ہے' لچک رہا ہے' مسک رہا ہے اور سانس لیتا ہوا سینہ کسی اجنبی کے پیشانی سینے سے ٹکرا ٹکرا کر دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو رہا ہے۔

اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں اور شانے پر سے سر اٹھایا تو اسے چاروں طرف کھیت ہی کھیت نظر آئے۔ وہ کٹیا نظر نہیں آ رہی تھی۔ دور کہیں درختوں کے پیچھے چھپ گئی تھی۔ شعلوں کی سرخی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ شاید آگ پر قابو پا لیا گیا تھا یا کٹیا جل کر راکھ ہو گئی تھی۔ اس نے اجنبی کو دیکھا۔ اس کا چہرہ اس کے بالکل قریب تھا۔ چاندنی میں صاف نظر آ رہا تھا۔ سرخ و سفید رنگت' کشادہ پیشانی' شکار کو جھپٹ کر لے جانے والے چیتے کی طرح چمکیلی آنکھیں' ہانپتی اور غراتی ہوئی سانسیں' ہونٹ ایسے سفاک جو پیار کے لئے پکارتے ہیں اور پتھر کی طرح پیس کر رکھ دیتے ہیں۔ شاداں کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔

"میں کہاں ہوں؟ تم کون ہو؟ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟ یہ حویلی کا راستہ تو نہیں ہے۔ چھوڑ دو۔ مجھے چھوڑ دو۔"

وہ بازوؤں کی گرفت میں مچلنے لگی۔ اجنبی دوڑتے دوڑتے لڑکھڑا کر گر پڑا۔ گرنے سے جو چوٹ لگی' شاداں کو اس کا احساس ذرا کم ہوا۔ کیوں کہ اجنبی کا لمس کچھ نئے احساسات سے آشنا کر رہا تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے مچلنا اور تڑپنا بھول گئی پھر وہ پتھر کی سل کو اپنے اوپر سے ہٹانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"ہٹ۔ چھوڑو مجھے۔ نہیں تو شور مچا دوں گی......"

اس نے شاداں کی دھمکی پر...... مہر لگا دی۔ وہ چند ساعتوں کے لیے جکڑ گئی۔ گونگی بن گئی۔ وحشت سے دیدے پھیلا کر اپنے چہرے پر چھائے ہوئے چہرے کو تکنے لگی۔ اس اچانک حملے سے وہ بوکھلا گئی تھی۔ پھر وہ اپنا سر دائیں بائیں جھٹکنے لگی۔ اجنبی نے الگ ہو کر کہا۔

"منہ مانگا انعام۔ تم نے کہا تھا۔ منہ مانگا انعام دوں گی۔ دو......"

وہ دوبارہ اس پر جھکا۔ شاداں جلدی سے کروٹ بدل کر لڑھکتی ہوئی ایک ہاتھ کے فاصلے پر ہٹ گئی اور اٹھ کر اپنا دوپٹہ اٹھانے لگی۔ اجنبی نے دوپٹے کو دوسری طرف سے

تھام لیا۔

پھر دونوں میں رسہ کشی ہونے لگی وہ دوپٹے کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور وہ اپنی طرف بلا رہا تھا۔ وہ چاہتا تو اسے ایک ہی چھلانگ میں دبوچ لیتا لیکن محبت کے کھیل میں شکار کے اصول بدل جاتے ہیں۔ وہاں پنجے نہیں مارے جاتے بلکہ پچکار کر بلایا جاتا ہے۔ ذرا ڈھیل دی جاتی ہے تاکہ بدکنے والی ہرنی مانوس ہو جائے۔

وہ پرے کھسکتے ہوئے بولی۔

"تم کون ہو؟"

"پروانہ۔" وہ ذرا آگے سرک گیا۔ "جب سے تمہیں دیکھا ہے۔ آنکھوں سے نیند اڑ گئی ہے۔"

"میرے بھائیوں کو جانتے ہو۔ وہ جلاد ہیں۔ تمہاری گردن اڑا دیں گے۔ بھاگ جاؤ یہاں سے۔"

وہ گھٹنوں کے بل دور ہونے لگی۔

اجنبی بھی گھٹنوں کے بل بڑھتے ہوئے بولا۔

"پروانے ڈرنا نہیں جانتے' جلنا جانتے ہیں۔ میں اس علاقے میں پہلی بار آیا ہوں۔ تم اپنے بھائیوں سے مجھے نہ ڈراؤ ہو سکے تو اپنے جلاد بھائیوں کو میرا نام بتا دینا۔ تم پر جان دینے والا مردا علی بنگش ہے جس کے نام سے کشمیر کے مہاراج ادھیراج تھراتے ہیں اور ان کے انگریز حاکم نے میرے سر کی قیمت دس ہزار روپے رکھی ہے۔ تمہارے بھائی دس ہزار لے جائیں گے یا میں تمہیں لے جاؤں گا۔"

وہ گھبرا کر تھوک نگلتے ہوئے بولی۔

"تت...... تم مجھے زبردستی لے جاؤ گے؟"

وہ جواب دینے سے پہلے چند لمحوں تک اس کے گلابی مکھڑے کو دیکھتا رہا۔ وہ سہمی سہمی سی دوشیزہ اتنی حسین لگ رہی تھی کہ اسے کھینچ کر آغوش میں چھپا لینے کا جی چاہتا تھا۔ اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

"میں تمہیں اٹھا کر لے جا سکتا ہوں مگر تمہیں لے جاؤں گا۔ میں نے آج تک کمزوروں پر ظلم نہیں کیا اور تم کمزور ہو۔ میری محبت ہو۔ میں تمہیں بڑی نرمی سے اور

بڑے پیار سے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ آؤں میرے پاس آجاؤ۔"

وہ ذرا آگے بڑھا۔ وہ ذرا پیچھے چلی گئی۔

"مم...... میرے پاس نہ آؤ۔ مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔"

"وہ تو لگا چکا ہوں۔ شاداں! میری محبت کا جواب محبت سے دو۔ پھر دیکھو کہ میں تمہارے اشارے پر کس طرح جان دیتا ہوں یا پھر مجھ سے نفرت کرو۔ مجھے برا بھلا کہو۔ مجھ سے دور بھاگو تاکہ مجھے غصہ آئے اور میں ایک ہی ہلے میں تمہیں اپنا لوں۔ دو میں سے کوئی ایک بات ہو گی۔ بولو' مجھ سے محبت کرو گی یا نفرت؟"

وہ الجھن میں پڑ گئی۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ وہ محبت اس لیے نہیں کر سکتی تھی کہ برسوں کا غرور اور برتری کا احساس اس پر حاوی تھا۔ وہ اتنی آسانی سے کسی اجنبی کو اپنی انگلی سے پہنچے تک پہنچنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس نے سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا اور سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔

"مم۔ میرے بھائی مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔ میں جاؤں گی۔"

وہ دوپٹہ چھڑا کر' گھٹنوں کے بل اس سے دور ہونے لگی۔

"دوپٹہ لیتی جاؤ۔" اس نے غرا کر حکم دیا۔

وہ ٹھٹک کر کانپنے لگی۔ وہ اس کی طرف آ رہا تھا۔ دونوں ہاتھ اور دونوں گھٹنے زمین پر ٹیکے' مست ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا' قریب سے قریب تر ہو رہا تھا۔ وہ اپنے آپ میں سمٹنے لگی۔ اس نے گندم کے کتنے ہی خوشوں کو اپنی باہوں میں سمیٹ کر آنے والے سے پردہ کر لیا۔ وہ ایک دم سے بدک کر بھاگنے لگی۔ ہریالی کا پردہ کام نہیں آیا تھا۔

پھر بھاگنے اور ہانپنے' دیکھنے اور چھپنے کی آنکھ مچولی شروع ہو گئی۔ وہ گندم کی کھڑی فصل میں گم ہو گئے تھے۔ چاند انہیں نہیں دیکھ رہا تھا۔ چاندنی میں صرف اتنا نظر آ رہا تھا کہ ہری بھری فصلوں میں کہیں کہیں ہلچل سی ہو رہی ہے۔ گندم کے جوان خوشے کبھی ادھر سے سرسرا رہے تھے۔ کبھی یہاں ٹکرا رہے تھے۔ جھپٹنے اور پلٹنے اور پلٹ کر جھپٹنے کا رد عمل پیش کر رہے تھے۔

ٹی

"میں جاؤں گی......" احساس برتری جا رہا تھا۔ شان و شوکت جا رہی تھی۔ کر

"میں شور مچاؤں گی......" ایک نازک سی دھمکی تھی تاکہ ہونٹوں کی م

جائے۔

رات چپ ہوگئی۔ رات ایک بچھونا ہے۔ چاند ایک مسافر ہے جو چاندنی کے پنکھ پھیلا کر اس بچھونے پر آرام کرتا ہے اور اپنے وجود کی روشنی اس کے وجود میں سموتا ہے۔ روشنی کے اس ریلے سے رات کبھی گھبرائی رہتی ہے اور کبھی اس روشنی کے طلسم سے سحرزدہ ہو کر آہیں بھرتی ہے۔ آہ تم اب تک کہاں تھے۔ میری روشنی کے سمندر۔ کہاں تھے تم؟"

رات سوالی تھی۔ چاند جوابی تھا اور وقت ان کے درمیان سے گزرتا جا رہا تھا۔

پھر بہت دیر ہوگئی۔ بہت سارا وقت گزر گیا۔ تب رات نے بڑی محبت سے آہیں بھرتے ہوئے کہا۔

"نہیں جاؤں گی۔ تمہیں چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گی۔ نہیں جاؤں گی....."

کٹیا کے شعلے بجھنے سے پہلے ہی ساتوں بھائی وہاں پہنچ گئے۔ وہاں بستی کی سب ہی عورتیں تھیں۔ ایک شاداں نہیں تھی۔

"کہاں ہے شاداں...... شاداں...... شاداں......"

سات گرجتی گونجتی آوازوں سے لوگوں کے دل دہلنے لگے۔ سب ہی ادھر سے ادھر بھاگتے ہوئے شاداں کو تلاش کرنے لگے۔ ساتوں اس علاقے کے حاکم تھے۔ انہوں نے پردہ کرنے والی عورتوں کے سر سے چادریں کھینچ لیں۔ گھونگٹ کاڑھنے والیوں کے گھونگٹ نوچ لئے لیکن بہن کا چہرہ کہیں نظر نہ آیا۔ تب انہوں نے بستی والوں کو حکم دیا کہ سب اپنے اپنے گھروں میں چلے جائیں۔ ہر گھر کی تلاشی لی جائے گی۔ جس کے ہاں وہ پائی جائے گی۔ اس کے سارے کنبے کو زندہ جلا دیا جائے گا۔

تمام مرد' عورتیں' بچے اور بوڑھے اپنے اپنے گھروں کی طرف بھاگنے لگے۔ کتنے ہی ملازموں اور کھیت کے مزدوروں کو بستی کے چاروں طرف دور دور تک پھیل جانے کا حکم دیا پھر ساتوں بھائی گھوڑوں پر سوار اپنے ہاتھوں میں گنڈاسے اور رائفلیں لیے اس کی تلاش میں نکل گئے۔

رات کے سناٹے میں ان کے للکارنے اور گرجنے کی آوازیں گونج رہی تھیں اور گھوڑوں کی ٹاپیں زمین کے سینے پر دور تک بجتی جا رہی تھیں۔

تین بھائی بستی کے ایک ایک گھر کی تلاشی لے رہے تھے۔ چار بھائی بستی کے باہر جانے والے راستوں پر دوڑے جا رہے تھے۔ کھیتوں کی طرف مزدور گئے ہوئے تھے۔

آدھی رات کے بعد وہ مایوس ہو کر گھوڑے سے اتر گئے اور کھیتوں کی طرف جانے لگے۔ وہ جہاں سے گزرتے تھے۔ مزدوروں کو آوازیں دے کر پوچھتے تھے۔ ہر جگہ یہی جواب ملتا کہ شاداں وہاں نہیں ہے پھر وہ اس جگہ آئے جہاں شاداں کو ہونا چاہیے تھا۔

وہ نہیں تھی وہاں دو مزدور بے ہوش پڑے تھے تیسرا ملازم جو قوی ہیکل تھا اور جو مرنے مارنے میں ہمیشہ ان بھائیوں کا ساتھ دیتا تھا۔ وہ زخمی پڑا ہوا کراہ رہا تھا۔

دو بھائیوں نے آگے بڑھ کر اسے جھٹکے سے اٹھایا اور جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں ہے شاداں؟"

"وہ شاداں کو حویلی کی طرف لے گیا ہے......" وہ رک رک کر کراہتے ہوئے بول رہا تھا۔ "کون لے گیا ہے اسے؟" ایک نے چیخ کر کہا۔

"وہ اشتہاری ملزم مراد علی بنگش......" زخمی کا سر شانے پر ڈھلک گیا۔ وہ بھی بے ہوش ہو گیا تھا۔

ساتوں بھائی لمحے بھر کے لیے سکتے میں آگئے۔ ایک دوسرے کو حیرانی اور تشویش سے دیکھنے لگے پھر بڑے بھائی نے بڑک مار کر کہا۔

"اوئے مراد علی کی موت اسے یہاں لے آئی ہے۔ آؤ میرے ساتھ......"

وہ حویلی کی طرف دوڑنے لگا۔ اس کے ساتھ تمام بھائی فصلوں کو روندتے ہوئے اور شیروں کی طرح دھاڑتے ہوئے جا رہے تھے۔ حویلی کے راستے میں دو چار جیالے ملازم زخمی پائے گئے اور یہ بات ثابت ہوئی کہ وہ شاداں کو لے کر حویلی کی طرف گیا ہے۔

حویلی کے احاطے میں پہنچتے ہی چوکیدار نے بتایا کہ بی بی جی واپس آگئی ہیں۔"

"کس کے ساتھ آئی ہے؟" ایک بھائی نے پوچھا۔

"کسی کے ساتھ نہیں سرکار۔ اکیلی آئی ہیں؟"

وہ سب تیر کی طرح حویلی میں داخل ہوئے۔ شاداں اپنی خواب گاہ میں پلنگ پر سمٹی سکڑی ہوئی بیٹھی تھی اور اس کی آدھی درجن بھابیاں اس سے طرح طرح کے سوالات کر رہی تھیں۔ شاداں کے جوابات سے وہ مطمئن نہیں تھیں۔ وہ بڑی ٹٹولتی ہوئی نظروں

سے اس کی بکھری ہوئی زلفیں، شکن آلود لباس اور چہرے کی اڑی ہوئی رنگت دیکھ کر اپنے طور پر بہت کچھ سوچ رہی تھیں...... اتنے میں اس کے تمام بھائی وہاں آگئے۔ بڑے بھائی نے ڈانٹ کر پوچھا۔

"کہاں گئی تھی؟"

"مم..... میں اپنی مرضی سے نہیں گئی تھی۔ وہ مجھے اٹھا کر لے گیا تھا۔"

سات جیالے بھائیوں کے جیتے جی کوئی ایک بہن کو اٹھا کر لے جائے۔ یہ توہین وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ غصے سے کانپنے لگے۔ ایک نے پوچھا۔ "وہ کہاں گیا ہے؟"

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپائے رو رہی تھی۔ اس نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

"میں نہیں جانتی۔ وہ مجھے حویلی کے سامنے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اس نے راستے میں آنے والے کتنے ہی لوگوں کو مار گرایا ہے۔ وہ بہت خطرناک ہے۔"

ساتوں اس خطرناک کو خطرناک قسم کی گالیاں دینے لگے اور اسے مار ڈالنے کی قسمیں کھانے لگے۔ ایک بھائی نے کہا۔

"وہ ہم سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ رجب علی نے اسے پہچان لیا ہے۔"

"پہچان لیا ہے؟" ایک بھائی نے پوچھا۔ "کون ہے وہ؟"

"مراد بنگش۔" ایک نے زمین پر تھوک کر کہا۔

شاداں چونک کر اپنے بھائیوں کو دیکھنے لگی۔ وہ اب تک دانستہ مراد کا نام نہیں لے رہی تھی۔ کسی خطرناک اجنبی کا ذکر کر رہی تھی تاکہ اس کے بھائی کسی اجنبی کی تلاش میں بھٹکتے رہ جائیں اور اس کے مراد پر شبہ نہ کریں۔

اس کا مراد۔ ہاں اب وہی اس کے دل کی مرادیں پوری کرنے والا مراد تھا۔ وہ اگرچہ چلا گیا تھا مگر اس کے بدن کے جوڑ جوڑ میں دکھ رہا تھا۔ اس کی نس نس میں سلگ رہا تھا۔ اس کے رس بھرے لبوں پر خیالی سانسوں کے سنگم سے مچل رہا تھا۔ جہاں دیکھنے والی آنکھیں بھی نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ وہ صرف چشم احساس سے دیکھ رہی تھی کہ وہ مسافر بدن کے شہر میں کہاں کہاں نشان سفر چھوڑ گیا ہے۔ وہ اتنی دور تک اور اس کے جذبات کی اتنی گہرائی تک پہنچ گیا تھا کہ سات بھائی اسے اپنی دنیا سے نکال سکتے تھے مگر اپنی بہن کے دل سے نہیں نکال سکتے تھے۔

اس رات کوئی نہ سو سکا تمام بھائیوں کو اس خوشی سے نیند نہیں آئی کہ جس بہن کو پھول کی طرح رکھا گیا تھا۔ اسے ایک گبرو جوان مسل کر چلا گیا ہے۔ ساتوں بھائی یہ سوچ رہے تھے کہ مراد علی بنگش ابھی ان کے علاقے سے باہر نہیں گیا ہوگا۔ ابھی وہ ناکہ بندی کر سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنے تمام ملازموں اور بستی کے جوانوں کو بلایا جو انگریز سرکار کی جانب سے شائع ہونے والے پوسٹروں میں اس اشتہاری مجرم کی تصویر دیکھ چکے تھے۔ انہیں بستی کے چاروں طرف دور دور تک ڈیوٹی پر لگا دیا گیا۔ چار بھائیوں نے آس پاس کی بستیوں میں جا کر جوانوں کی یہ ڈیوٹی لگائی اور یہ اعلان کر دیا کہ جو مراد علی بنگش کو زندہ یا مردہ لے کر آئے گا۔ اسے سرکار کی طرف سے اعلان کی ہوئی انعامی رقم دی جائے گی۔

تین بھائی بستی کا چکر کاٹتے جلی ہوئی کٹیا کے پاس سے گزرے تو روگی بابا ایک درخت کے نیچے پلتھی مارے ہوئے تھے۔ انہیں اس حال میں دیکھ کر بھائیوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ دشمن کی تلاش کرنے کی دھن میں بابا کو بھول گئے۔ ان کے باپ چوہدری برکت علی نے بابا کو سکون سے عبادت کرنے کے لیے وہ کٹیا بنا کر دی تھی جو اب جل کر راکھ ہو گئی تھی۔ وہ تینوں بابا کے سامنے دو زانو ہو گئے۔ ایک نے کہا۔ "بابا۔ آج رات آپ ہماری حویلی میں عبادت کریں کل آپ کے لیے نئی کٹیا تیار ہو جائے گی۔"

بابا کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ عبادت میں مشغول تھے۔ انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

"نہیں بیٹے۔ فقیر کی جگہ محلوں میں نہیں کٹیا میں ہے یا درختوں کے سائے میں۔ میں یہاں مطمئن ہوں۔ تم یہ بتاؤ کہ میری شاداں مل گئی؟"

"آپ کی دعاؤں سے مل گئی ہے۔" ایک نے جواب دیا۔

دوسرے نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

"بابا! آپ بھی شاید کشمیر کے رہنے والے ہیں؟"

"ہاں"

"وہاں بنگش کے علاقے میں رہ چکے ہیں؟"

"ہاں۔"

"آپ مراد علی بنگش کو جانتے ہیں؟"

روگی بابا کی آنکھیں پھیل گئیں۔ چاند کی روشنی ان کی آنکھوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ درخت کے سائے آنکھوں کو چھپا رہے تھے۔ اس لیے یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں یا خوف سے۔

وہ چند لمحوں تک خاموش رہے پھر انہوں نے لرزتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"کون مراد علی؟"

"مہاراجہ کے ایڈی کانگ دھرم دیر کا قاتل۔ اس قتل کے بعد وہ کتنے ہی ڈوگرا سپاہیوں کو قتل کرتا رہا ہے۔ جس نے بھی دس ہزار کا انعام حاصل کرنے کے لیے اس کا پیچھا کیا وہ زندہ لوٹ کر نہیں آیا۔"

روگی بابا نے افسوس کا اظہار کیا۔

"آہ بے چارا مراد......!"

ایک بھائی نے تعجب سے کہا۔

"آپ اسے بے چارہ کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں وہ مظلوم ہے۔ وہ قاتل نہیں تھا۔ اسے قاتل بنا دیا گیا ہے۔ یہ بہت غلط ہے ایک شخص نے اس کی جوان بہن کو ایڈی کانگ کے عیش کدے میں پہنچا دیا۔ کون ایسا بے غیرت ہے جو اس ذلت کو برداشت کر سکتا ہے؟ وہ برداشت نہ کر سکا۔ درندہ بن گیا۔"

"پھر بھی بے چارہ کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ وہ اپنی بہن کا انتقام لینے کے لیے دوسروں کی بہنوں کو اٹھا لے جاتا ہے۔"

"نہیں بیٹے۔ میں نے تو یہی دیکھا ہے کہ وہ دوسروں کی ماں بہنوں کی عزت کرتا ہے۔"

"آپ کچھ نہیں جانتے بابا۔ اب آپ سے کیا چھپانا۔ یہ بات تو اب دور دور تک جائے گی کہ وہ شاداں کو اٹھا کر لے گیا تھا۔"

"کب؟" بابا نے حیرت سے پوچھا۔

"آج شام کو جب آپ کی کٹیا میں آگ لگی تھی۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ شاداں کو لے جانے کے لیے اسی نے کٹیا میں آگ لگائی تھی۔"

روگی بابا خاموشی سے ان بھائیوں کو باری باری دیکھتے رہے پھر انہوں نے کہا۔

مجھ سے بحث نہ کرو۔ خاموشی سے میری باتیں سنو اور یہاں سے چلے جاؤ۔ وہ اتنا ظالم اور سنگ دل نہیں ہے کہ بستی کی بہو بیٹیوں اور معصوم بچوں کو زندہ جلانے کے لیے کٹیا میں آگ لگا دے۔ تم لوگ یہ نہ سمجھو کہ میں ایک قاتل درندے کی حمایت کر رہا ہوں' نہیں۔ میں صرف ان خوبیوں کو بیان کر رہا ہوں جو اس میں موجود ہیں۔ وہ چوٹ کھایا ہوا بندہ ہے' کسی کی بہن کو بری نظر سے نہیں دیکھتا۔ وہ شاداں کو اٹھا کر کیوں لے گیا تھا میں نہیں جانتا' خدا جانتا ہے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ شاداں کا دشمن نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو وہ تمہیں واپس نہ ملتی۔"

ایک بھائی نے ناگواری سے کہا۔

"وہ تنہا کہیں بھی چھپ سکتا ہے۔ شاداں اس کے لیے مصیبت بن جاتی۔ اسی لیے وہ اسے چھوڑ گیا ہے لیکن وہ بچ کر نہیں جائے گا۔ ہمارے آدمی چاروں طرف اسے تلاش کر رہے ہیں۔ صبح تک وہ ہمارے قدموں میں ہوگا۔"

روگی بابا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ تینوں تھوڑی دیر انتظار کرتے رہے کہ شاید وہ کچھ کہیں گے' پھر ایک نے کہا۔

"کل شام تک آپ کے لیے ایک نئی کٹیا تیار ہو جائے گی۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ کٹیا حویلی کے سامنے بنائی جائے کیونکہ ہم نہیں چاہتے کہ اب شاداں تنہا اتنی دور آیا کرے۔ وہ بد معاش جب تک گرفتار نہیں ہوگا۔ ہم محتاط رہیں گے۔"

"جہاں چاہو وہاں کٹیا بنا دو۔ دنیا والوں سے دور گوشہ نشینی چاہتا ہوں۔ کٹیا بن جائے گی تو کل رات سے میں کٹیا میں بیٹھوں گا۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ میری زندگی کے دن پورے ہو گئے ہیں۔ خدا کرے کہ مجھے چلے کے دوران موت آ جائے۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ تینوں بھائی وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔

○☆○

شاداں ایک تکیے کو سینے سے لگائے خوب گہری نیند سوتی رہی۔ صبح آنکھ کھلی تو بدن ٹوٹ رہا تھا۔ گہری نیند کے بعد بھی رات کی تھکن دور نہیں ہوئی تھی۔ اس نے بستر پر لیٹے ہی لیٹے انگڑائی لی۔ ریشمی بدن کھنچ کر کمان ہو گیا۔ انگڑائی لینے سے ذرا آرام آیا۔ تو وہ

مراد کے متعلق سوچنے لگی۔

"وہ کہاں ہوگا؟ پھر کب آئے گا؟"

وہ جاتے جاتے کہہ گیا تھا کہ وہ پھر آئے گا اور بار بار آئے گا۔ کیوں کہ پروانہ جلنے سے اور مرنے سے نہیں ڈرتا۔ یہ تو سب ہی جانتے تھے اور مانتے تھے کہ شاداں بے حد حسین تھی لیکن مراد جیسے نڈر اور سرپھرے کے لیے اس وجہ سے حسین و دل نشین تھی کہ خطرات سے کھیل کر اسے حاصل کرنا پڑتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کسی وقت بھی کوئی دشمن پیچھے سے موت بن کر آسکتا ہے یا وہ قانون کے ہتھے چڑھ کر پھانسی کے پھندے تک پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے اس نے موت کی دہشت کو دل سے نکال دیا تھا اور اس میں شاداں کو بٹھا دیا تھا اور اس کے پیار بھرے ہنگامے دشمنوں کو للکار رہے تھے۔

"آؤ تم ظلم کی چھاؤں میں لڑو۔ میں زلفوں کی چھاؤں میں لڑتا ہوں۔ تم مجھے اذیتیں دے کر مارنا چاہتے ہو۔ میں بڑے اطمینان اور خوب صورتی سے مرنا چاہتا ہوں۔ شہر شہر، گاؤں گاؤں قانون سے منہ چھپاتے رہنے سے بہتر ہے میں اپنی شاداں کی چاہت میں جان دے دوں۔۔۔۔۔"

شاداں بستر پر اوندھی لیٹی زیر لب مسکرا رہی تھی۔ یہ خیال کتنا خوش کن ہے کہ کوئی ہمیں چاہتا ہے اور ہمارے لیے جان کی بازی لگاتا ہے۔ اس نے ایسے ہی جیالے محبوب کے سپنے دیکھے تھے جو اس کے بھائیوں کی طرح دلیر بھی ہو اور درندہ بھی۔ اس کے بھائی دولت کے دیوانے تھے اور وہ محبت میں جل جانے والا پروانہ تھا۔ تب ہی اسے آگ کے شعلوں سے نکال کر لے گیا تھا۔

وہ سوچتی رہی اور کروٹیں بدلتی رہی۔ اتنے میں اس کی چھوٹی بھابی مسکراتی ہوئی کمرے میں آئی اور دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔ چھوٹی بھابی اس کی ایک بے تکلف سہیلی بھی تھی۔ وہ دونوں بند کمرے میں بیٹھی گھنٹوں چٹخارے دار موضوع پر باتیں کرتی رہتی تھیں۔ اب تک بھابی بولتی تھی اور وہ سنتی تھی۔ آج اس کے بولنے اور بھابی کے سننے کی باری تھی۔ بھابی نے پلنگ پر آکر دھپ سے اس کے قریب گرتے ہوئے کہا۔

"اب بتا۔ رات کیا ہوا تھا؟"

"کچھ نہیں۔" وہ شرما کر تکیے میں اپنا منہ چھپانے لگی۔

بھابی نے اس کی پیٹھ پر ایک دھپ مارتے ہوئے کہا۔

"کیسے کچھ نہیں۔ مجھ سے اڑتی ہو۔ ارے یہاں تمام بھابیوں نے تاڑلیا ہے۔ وہ سب تیرے بھائیوں کے ڈر سے خاموش ہیں ورنہ اب تک تجھے چاروں کھونٹ بد نام کردیتیں۔ کل رات جو لوگ زخمی ہوئے تھے تیرے بھائیوں نے انہیں اچھی طرح ڈرایا دھمکایا ہے کہ وہ تیری اور مراد کی ملاقات کا ذکر کسی سے نہ کریں۔ اب وہ بے چارے یہی کہتے ہیں کہ جب مراد سے ان کا مقابلہ ہوا تو وہ تنہا تھا اور تیرے بھائی یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ جب کٹیا میں آگ لگی تو وہاں سے بھاگ کر سیدھی حویلی میں آگئی تھی۔ بدحواسی میں کسی نے اسے نہیں دیکھا۔ سب یہی سمجھتے رہے کہ تو نہ جانے کہاں غائب ہوگئی ہے۔ بستی کے سیدھے سادے لوگ اس جھوٹ پر یقین کر رہے ہیں۔ یقین نہ بھی کریں تو کیا کریں۔ کس کی شامت آئی ہے کہ مراد سے تیرا رشتہ جوڑ کر اپنی موت کو دعوت دے گا۔ بہرحال بات دب گئی ہے۔ اس خاندان کی عزت رہ گئی ہے۔ اب چھوڑ ان باتوں کو اپنی بتا کیسا ہے وہ؟"

"میں نے سنا ہے مراد ڈاکو ہے۔ کئی قتل کرچکا ہے۔"

"اس نے تو مجھے قتل کردیا ہے۔" شاداں لذت انگیز لہجے میں بولی۔

"مگر اس کے بارے میں یہی مشہور ہے۔" بھابی نے دوبارہ کہا۔

"غلط مشہور ہے۔ کوئی میری نظر سے اسے دیکھے۔ وہ پیار کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے جس میں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے۔"

بھابی نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"تو ٹھیک کہتی ہے۔ یہ مرد پہلے تن کو اچھے لگتے ہیں پھر من کو بھاتے ہیں۔ تیری باتوں سے لگتا ہے کہ تو اس کی دیوانی ہوگئی ہے مگر شاداں! وہ تو جنگل کا شیر ہے۔ بھولے سے بستی کی طرف آگیا تھا۔ اول تو وہ دوبارہ نہیں آئے گا اور آئے گا تو شکاریوں کے پھندے میں پھنس جائے گا۔"

وہ بھابی کا ہاتھ تھام کر بولی۔

"یہی سوچ کر میرا دل گھبراتا ہے۔ وہ اکیلا ہے اور ساری دنیا اس کی دشمن ہے۔ بھابی! خدا کی قسم، اسے کچھ ہوگیا تو میں مرجاؤں گی۔"

"میریں تیرے دشمن۔ تو جتنا اس کے لیے سوچے گی۔ تیری دیوانگی بڑھتی جائے گی
دانشمندی یہی ہے کہ جو گزر چکی ہے اسے بھول جا۔ وہی ایک چھیل چھبیلا نہیں ہے
روگ وہ تجھے لگا گیا ہے اس کا علاج شادی کے بعد ہو جائے گا۔"

وہ بھابی کا ہاتھ جھٹک کر بولی۔

"ایسی باتیں نہ کرو۔ میرے مراد کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا' کوئی لے سکتا ہے تو بتا
کون ہے وہ جو مراد کی طرح موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھ سے پیار کرے گا
بول ہے کوئی؟"

بھابی نے لاجواب ہو کر پوچھا۔

کیا یہی بات تو اپنے بھائیوں سے کہہ سکتی ہے؟"

وہ چپ ہو گئی۔ اس میں اتنی جرات نہیں تھی کہ وہ بھائیوں کے سامنے مراد کی محبت
کا دم بھرتی۔ وہ ساتوں اس کی کھال کھینچ کر رکھ دیں گے۔ وہ اپنی بزدلی کو اچھی طرح سمجھ
رہی تھی۔ اس کے دل میں بیک وقت محبت بھی تھی اور دہشت بھی۔ مراد آندھی اور
طوفان کی طرح اسے اڑا لے جانا چاہتا تھا اور اس کے بھائی حفاظتی بند باندھ رہے تھے
نہ تو وہ بندشوں کو توڑنے کی جرات کر سکتی تھی اور نہ ہی مراد کی چاہت سے انکار کر سکتی
تھی۔

بھابی اسے بہت دیر تک سمجھاتی رہی اور وہ چپ چاپ سنتی رہی پھر دونوں کمرے
سے باہر آگئیں۔ باہر آنے کے بعد جو پہلی خوش خبری سنائی دی وہ یہ تھی کہ مراد ابھی تک
گرفتار نہیں ہو سکا۔ رات بھر کے جاگے ہوئے چھ بھائی سو رہے تھے۔ بڑا بھائی ریذیڈنسی
کی طرف گیا تھا تاکہ صاحب بہادر کے دفتر میں مراد کے متعلق معلومات فراہم کرے اور
اس کی گرفتاری کے لیے سرکار سے کچھ امداد حاصل کرے۔ جانے سے پہلے اس نے گھر
کی عورتوں کو تاکید کر دی تھی کہ شاداں کو حویلی سے باہر نکلنا تو دور کی بات ہے۔ انہوں
نے اسے کھڑکیوں اور دروازوں تک جانے سے بھی منع کر دیا۔ چھوٹی بھابی اسے باہر کی
خبریں پہنچاتی رہی۔ اسے پتہ چلا کہ حویلی کے سامنے سو گز کے فاصلے پر روگی بابا کی نئی کٹیا
بنائی جا رہی ہے تاکہ وہ شام کو بابا کے لیے روٹی لے کر جائے تو حویلی والوں کی نظروں میں
رہے۔ اڑتی اڑتی خبر ملی کہ ایک مزدور کھیت میں زخمی ہو گیا ہے۔ تمام بھائی بھاگے بھاگے

جائے واردات پر پہنچے۔ کسی کے زخمی ہونے کا مطلب یہی سمجھا جا رہا تھا کہ مراد پہنچ گیا ہے
لیکن وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ فصل کی کٹائی کے دوران دو مزدوروں میں جھگڑا ہو گیا تھا اور
ایک نے اپنی درانتی سے دوسرے کو زخمی کر دیا تھا۔ "کھسیانی بلی کھمبا نوچے" کے مصداق
تمام بھائیوں نے دونوں مزدوروں کی خوب پٹائی کر دی اور یہ اعلان کر دیا کہ مراد کے ہاتھ
آنے تک کوئی ہاتھا پائی نہ کرے۔ ورنہ انہیں سخت سزائیں دی جائیں گی۔

شام ہونے سے پہلے ہی بڑا بھائی ریذیڈنسی سے واپس آگیا۔ اس نے تمام بھائیوں کو
اپنے کمرے میں بلا کر کہا۔

"ریذیڈنٹ صاحب ہمارے معاملے میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ اتنے بڑے انگریز
افسر مجھ سے بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پچھلی رات کے تمام واقعات سننے کے بعد
انہوں نے بھی وہی بات کہی جو روگی بابا نے کہی تھی۔ یعنی یہ کہ مراد کبھی عورتوں سے
دلچسپی نہیں لیتا ہے۔ اس کی ہسٹری شیٹ میں یہی لکھا ہے کہ اس نے قتل کیے ہیں۔ ڈاکے
بھی ڈالے ہیں لیکن آج تک کسی کی بہن یا بیٹی کو اٹھا کر نہیں لے گیا ہے۔ اگر وہ شاداں
کو اٹھا کر لے گیا ہوتا تو پھر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ دوبارہ آئے گا کیونکہ شاداں اس کی
کمزوری بن گئی ہے۔"

یہ بڑے شرم کی بات ہے کہ ریذیڈنٹ صاحب نے ہماری بہن کے متعلق ایسی بات
کہی ہے۔ لیکن سچائی کڑوی ہوتی ہے۔ ہمیں اس کڑواہٹ کو برداشت کرنا ہی پڑے گا ہم
اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ وہ شاداں کو چاہتا ہے اسی لیے اسے بدنام نہیں کرنا
چاہتا اور بڑی خاموشی سے اسے حویلی تک پہنچا گیا ہے۔

ہم عشق کو ایک حماقت یا بیماری سمجھتے ہیں لیکن عورت اچھے سے اچھے ذہین اور دلیر
سے دلیر انسان کو اس بیماری میں مبتلا کر دیتی ہے۔ ریذیڈنٹ صاحب نے فرنگی چال بتائی
ہے کہ مراد کو زیادہ سے زیادہ اس بیماری میں مبتلا کیا جائے اور اس کے لیے نہایت سخت
انداز میں مشورہ دیا ہے کہ ہم شاداں کو حویلی میں قید نہ کریں بلکہ اسے تنہا گھومنے پھرنے
کے لیے آزاد چھوڑ دیں۔

ایک بھائی نے غصے سے کہا۔

"یہ ریذیڈنٹ صاحب ہمیں بے غیرتی کا سبق سکھا رہے ہیں۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ

اس طرح ہماری اور ہمارے خاندان کی کیسی بدنامی ہوگی؟"

دوسرے بھائی نے پوچھا۔ پھر تیسرے نے۔ پھر چوتھے نے۔ سب ہی اس مشورے کی مخالفت کرنے لگے۔ بڑے بھائی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"پہلے یہ بتاؤ کہ ہم نے یہ عزت' یہ مرتبہ کیسے حاصل کیا ہے؟ ہم یہاں کے جاگیردار اور حاکم بن کر اپنے رعب اور دبدبے سے لوگوں کو مجبور کردیتے ہیں کہ وہ ہماری عزت کریں۔ یہ برتری' یہ عظمت اور یہ شان و شوکت ہمیں سرکار برطانیہ کی مدد سے حاصل ہوئی ہے۔ تم سب اچھی طرح جانتے ہو کہ حکم عدولی کرنے والوں سے خطابات چھین لیے جاتے ہیں اور انہیں زمینوں سے بے دخل کردیا جاتا ہے۔ کیا تم اتنی بڑی جاگیر سے محروم ہونا پسند کروگے؟"

سب ہی کو چپ لگ گئی۔ وہ ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ بڑے بھائی نے کہا۔

"میں نے ان کا مشورہ قبول کرلیا ہے لیکن میں بے غیرت نہیں ہوں۔ اگر سوچنے کا انداز ذرا سا بدل دیا جائے تو غیرت کے معنی میں ذرا سی لچک پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ہم یہ کیوں نہ سوچیں کہ مراد نے شاداں کو ہاتھ لگا کر ہماری غیرت کو للکارا ہے۔ وہ بزدل دشمن ہے جو چھپتا پھرتا ہے۔ نہ وہ مقابلے پر آئے گا اور نہ ہم انتقام لے سکیں گے۔ اگر ہم اپنی غیرت کا بھرم رکھنا چاہتے ہیں تو کیوں نہ شاداں کو ذرا سی ڈھیل دے کر مراد کو سامنے آنے پر مجبور کریں۔ ہم اسے اتنا موقع ہی نہیں دیں گے کہ وہ دوبارہ شاداں کو ہاتھ بھی لگا سکے۔ بس ایک بار وہ اس سے ملنے کے لیے آجائے پھر ہم اسے گھیر کر کتے کی موت ماردیں گے۔"

بڑے بھائی کا یہ مشورہ قابل قبول تھا۔ سب ایک دوسرے سے رائے لینے لگے۔ آخر کار یہ فیصلہ ہوگیا کہ شاداں پر سے پابندیاں ہٹالی جائیں۔ چھپ چھپ کر اس کی نگرانی کی جائے۔

ٹھیک ہے سوچنے کا انداز بدل جائے تو غیرت کے معنی بھی بدل جاتے ہیں۔ اب بہن کو چارہ بنا کر دشمن پر ہاتھ ڈالنا بے غیرتی نہیں تھی۔ اب غیرت کے معنی یہ تھے کہ کسی طرح دشمن کو گھیرا جائے اور انگریز سرکار کو اپنی فرماں برداری کا ثبوت دیا جائے۔

شام کو شاداں کٹیا کی جانب جانے لگی تو اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کے ساتھ کوئی ملازمہ نہیں جارہی تھی۔ اس کے بڑے بھائی نے اپنے کمرے میں اسے بلا کر سمجھایا۔

"تم چوہدری برکت علی کی بیٹی ہو اور ہم سب کی غیرت ہو۔ اپنی اور اپنے خاندان کی عزت کو برقرار رکھنا تمہارا فرض ہے۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ ایک قاتل اور بدمعاش تمہارے قدموں میں بھی بیٹھنے کے قابل ہے؟"

"نن..... نہیں۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ بھائی کے سامنے یہ کہنے کی جرات نہ ہوئی کہ میں اس کے قدموں میں رہنا چاہتی ہوں۔"

"اگر وہ تمہیں نظر آیا تو تم کیا کروگی؟"

"میں اس سے بات نہیں کروں گی۔"

"نہیں۔" بھائی نے کہا۔ "تم اس سے باتیں کروگی۔" وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ مراد کو اس کے قدموں میں بیٹھنے کے قابل نہیں سمجھا جارہا تھا مگر اس سے باتیں کرنے کا مشورہ دیا جارہا تھا۔

"شاداں! جو کچھ میں کہہ رہا ہوں۔ اس پر پوری طرح عمل کرنا۔ وہ جب بھی نظر آئے تو اس سے کسی خاص جگہ اور خاص وقت ملنے کا وعدہ کرلینا۔ ہمیں بتادینا صرف ایک بار وہ ہمارے گھیرے میں آجائے پھر بچ کر نہیں جائے گا۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ ایسا تم کس لیے کروگی۔"

"اس لیے کہ آپ حکم دے رہے ہیں۔"

"نہیں۔ تم چاہو تو میرے حکم کو ٹھکرا سکتی ہو۔ اس بدمعاش کے فریب میں آسکتی ہو لیکن جب تمہیں احساس ہوگا کہ تمہاری ایک ذرا سی غلطی سے تمہارے باپ دادا کے ناموں پر حرف آئے گا۔ ہمارے سر شرم سے جھک جائیں گے اور لوگ اس حویلی کی طرف منہ اٹھا کر تھوکیں گے تو تم ایک بدمعاش کو کبھی اہمیت نہیں دوگی۔ کبھی اس کے فریب میں نہیں آؤگی۔ دیکھو شاداں! میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنی عزت اور اپنے مرتبے کو سمجھو۔ تم میرے سامنے قسم کھاؤ کہ تم اپنی نادانی سے مراد کو یہ موقع نہیں دوگی کہ وہ تمہارے باپ دادا کی عظمتوں پر کیچڑ اچھال سکے۔"

"میں قسم کھاتی ہوں بھائی جان۔ مجھے اپنے باپ دادا کے ناموں سے صرف محبت ہی نہیں عقیدت بھی ہے۔ میں اپنے خاندان کی عزت اور شہرت پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔"

"شاباش۔ اب تم جاسکتی ہو۔ تم پر کسی قسم کی پابندی نہیں لگائی جائے گی۔"

اس نے پانی کی چھوٹی سی مٹکی سر پر رکھی' روٹیوں کا چھابہ اٹھایا اور بھائی کے کمرے سے باہر آگئی۔

حویلی کے سامنے دور ایک کٹیا نظر آرہی تھی۔ بانس کی کھپچیوں سے چار دیواری کھڑی کی گئی تھی۔ صرف چھت ڈالنے کا کام رہ گیا تھا۔ وہ نظریں جھکائے کٹیا کی طرف جارہی تھی۔ ہر قدم پر اس کا دل کچھ محبت اور کچھ خوف سے دھڑک رہا تھا کہ وہ دیوانہ اچانک ہی کہیں سے آئے گا اور اسے اٹھا کر لے جائے گا لیکن وہ نہیں آیا۔

کٹیا کے دروازے پر پہنچ کر اس نے دل کو سمجھایا کہ ابھی وہ کیسے آئے گا۔ ابھی تو کچھ اجالا سا ہے' کچھ کچھ اندھیرا ہے اور وہ لیٹرا تو شب خون مارتا ہے۔ اس نے دستک دی۔ دروازہ کھل گیا۔ کٹیا کے اندر وہی روگی بابا کی کھانسیاں اور نصیحتیں تھیں۔ وہ مراد کے متعلق اسے سمجھا رہے تھے کہ وہ دل کا اچھا ہے مگر تقدیر کا کھوٹا ہے۔ کسی وقت بھی قانون کے شکنجے میں آسکتا ہے۔

شاداں ان کی باتیں سن رہی تھی اور چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چھت نہیں تھی۔ اوپر ایک گھنے درخت کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ اللہ کرے وہ اس گھنے درخت میں کہیں چھپا ہو اور اچانک دھم سے کود کر کٹیا کے اندر آجائے لیکن وہ نہیں آیا۔

کٹیا سے واپسی پر اندھیرا ہو چکا تھا۔ وہ شب خون مارنے والا اندھیرے میں بھی نہیں آیا۔ شاداں کی بے چینی بڑھ گئی۔ کھانے کا وقت آیا تو بھوک مرگئی۔ سونے کا وقت آیا تو آنکھوں سے نیند اڑ گئی۔ دوسری صبح چھوٹی بھابی اس کے کمرے میں آئی تو اس سے بھی باتیں کرنے کو دل نہ چاہا۔ وہ اضطراب اور پریشانیاں صرف اس کے ساتھ نہیں تھیں۔ اس کے ساتوں بھائی بھی انتظار کے کانٹوں پر لوٹ رہے تھے۔ ہر صبح' ہر شام یہی کھٹکا لگا رہتا کہ وہ آنے والا ہے۔ وہ کھیتوں میں نظر آئے گا یا کھلیانوں میں۔ گھنے درختوں میں

چھپا ہوگا یا پھر...... یا روگی بابا کی کٹیا میں۔

ہاں پہلے یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ بابا کی کٹیا میں چھپ سکتا ہے۔ بعد میں ایک بھائی نے سوچا۔ تو سب ہی سوچنے لگے۔ ان دنوں صورت حال یہ تھی کہ بابا چلے میں بیٹھ گئے تھے یعنی چالیس دنوں تک کسی کو کٹیا کے اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ صرف شاداں دستور کے مطابق شام کو وہاں کچھ دیر کے لیے جاتی تھی۔ کچھ بھائی ایسے تھے جنہیں شاداں پر اعتماد نہ تھا۔ وہ کہتے تھے کہ جب عورت دیوانی ہوتی ہے تو اپنی آسودگی کے لیے اپنوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر گھر سے نکلتی ہے۔ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس نے مراد کو کٹیا میں چھپا رکھا ہو۔ مراد ایک قاتل ہے اس نے بابا کو ہلاک کر کے اس کٹیا میں دفن کر دیا ہوگا۔ سب یہی سمجھتے رہ جائیں گے کہ بابا چلہ کاٹ رہے ہیں اور وہ ایک بہن کو اس کے بھائیوں کے رشتے سے کاٹ رہا ہوگا۔

یہ سوچ کر وہ کٹیا میں جھانکنے لگے۔ صبح کو یا آدھی رات کو دو تین بھائی چپکے سے جاتے تھے۔ کبھی دیواروں سے کان لگا کر اندر سے مرد کی آواز سننے کی توقع کرتے تھے مگر کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ وہ اطمینان کے لیے دروازہ کھول کر کئی بار اندر گئے وہاں روگی بابا ہمیشہ تنہا نظر آتے تھے۔ وہ آنکھیں بند کئے مراقبے میں رہتے تھے' کون وہاں آتا ہے اور جاتا ہے۔ انہیں اس کی خبر نہ تھی۔ وہ اپنی عبادت میں مصروف رہتے تھے۔

بہرحال مراد وہاں نظر نہ آیا۔

چلے کی تیس دن گزر گئے تمام بھائی تیس راتوں تک جاگ جاگ کر بے زار ہوگئے اور اسے گالیاں دینے لگے کہ کم بخت نے سونا جاگنا' کھانا پینا سب حرام کر دیا ہے۔ نہ وہ آتا ہے اور نہ اس کے ملنے کی خبر ملتی ہے۔ شاداں بھی بددل ہو رہی تھی کہ جسے وہ پروانہ سمجھتی تھی وہ بھونرا بن کر آیا تھا اور رس چوس کر چلا گیا۔

وہ سوچتی تھی اور تکیے میں منہ چھپا کر روتی تھی۔

پھر ایسا ہوا کہ ایک صبح اس کا منجھلا بھائی کسی کام سے جہلم کی طرف گیا اور شام کو اپنے دو ملازموں کے ساتھ زخمی حالت میں واپس آیا۔ اس نے بتایا کہ وہاں سے تقریباً پچاس میل دور مراد سے سامنا ہو گیا تھا۔ مراد سے ان کا زبردست مقابلہ ہوا۔ منجھلا بھائی اور دونوں ملازم بری طرح زخمی ہوئے تھے لیکن ان کا بیان تھا کہ مراد ان سے زیادہ زخمی

ہوا ہے اور بزدلوں کی طرح میدان چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔

اس واقعہ سے تمام بھائیوں کو یقین ہو گیا کہ وہ اس علاقہ سے دور چلا گیا ہے۔ اس پر سات بھائیوں کی وحشت اس قدر طاری ہے کہ وہ بیک وقت ساتوں سے نمٹنے کے لیے بستی کی طرف آنے کی جرات نہیں کرے گا۔ اس علاقے سے دوران میں سے کسی کو تنہا دیکھ کر ہی مقابلے کے لیے للکارے گا۔

پھر وہ راتوں کو اطمینان سے سونے لگے۔ دو چوکیدار تمام رات حویلی کے چاروں طرف چکر لگاتے رہتے تھے اور "ہوشیار' جاگتے رہو۔" کی صدائیں بلند کرتے ہوئے اپنے آقاؤں کو یقین دلاتے تھے کہ وہ بڑی مستعدی سے پہرہ دے رہے ہیں۔

پہرہ مضبوط تھا۔ بھائی مطمئن تھے۔ شاداں اپنے محبوب کی بے وفائی اور سنگ دلی پر آنسو بہا رہی تھی۔ ایسے ہی وقت وہ آگیا۔

آدھی رات گزر چکی تھی۔ روگی بابا سر پر کمبل اوڑھے مراقبے میں بیٹھے تھے۔ کچھ پڑھ رہے تھے یا اونگھ رہے تھے۔ چراغ کی بجھتی ہوئی روشنی میں وہ آہستہ آہستہ چھپتے جا رہے تھے۔ اندھرے کی کالی چادر انہیں اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ چراغ بجھ جاتا اور کٹیا تاریکی میں ڈوب جاتی۔ وہ آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر آگیا۔

اس کے بھاری بھرکم بوٹ کیچڑ میں سنے ہوئے تھے۔ چست پتلون ایک آدھ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ قمیص میلی چیکٹ ہو گئی تھی۔ اس کی اصلی رنگت کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ اس کے شانے سے کارتوس کی پیٹی اور دوسرے شانے سے ایک رائفل لٹک رہی تھی۔ داڑھی اور سر کے بال وحشیوں کی طرح بڑھے ہوئے تھے۔ نتھنے سانسوں کی ہلچل سے پھڑک رہے تھے اور آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔

اس نے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر روگی بابا کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے قدموں کی دھمک سے کٹیا کا فرش دہل رہا تھا۔ اس نے دھیمی سرگوشی میں کہا۔

"بابا۔ میں یہاں پناہ لینے آیا ہوں۔"

بابا کی آنکھیں کھل گئیں۔ چراغ بجھ گیا۔ دونوں کے چہرے تاریکی میں چھپ گئے۔

تب بابا نے ایک طویل سانس چھوڑتے ہوئے۔ "ہاں" کہا۔ وہ ہاں ایسی تھی جیسے

سینے سے آہ نکل رہی ہو۔

"ہاں۔ تم آگئے۔ میں ایک مدت سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ تم آؤ گے۔ تمہارا نام سنتے ہی میں چلے میں بیٹھ گیا تھا۔ صرف دکھاوے کے لیے۔ میں کوئی خاص عمل کرنا نہیں جانتا۔ وظیفہ پڑھنا نہیں جانتا۔ میری بزرگی ایک دکھاوا ہے لیکن میری عبادت میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔"

میں اٹھارہ سال سے سجدے کر رہا ہوں۔ خداوند کریم سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہا ہوں۔ میری گوشہ نشینی صرف اس لیے تھی کہ تم مجھے تلاش نہ کر سکو۔ مراد! میں وہی سلامت بیگ ہوں جو تمہاری معصوم بہن کو اٹھا کر ایڈی کانگ دھرم کے بنگلے پر لے گیا تھا۔"

کھوں...... کھوں...... کھوں...... اندھیرا کھانسنے لگا۔ اندھیرا چکرانے لگا۔ مراد کا سر گھومنے لگا۔ اس نے شانے پر سے رائفل اتاری۔ اس کی غراہٹ تاریکی کے سینے میں خنجر کی طرح اتر رہی تھی۔ اس نے رائفل کی نال کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور اسے شانے سے بلند کیا لیکن پھر حملہ کرتے کرتے رک گیا کیوں کہ دشمن کھانس رہا تھا' کراہ رہا تھا۔ شاید بیمار تھا اور مراد کی مردانگی یہ گوارا نہیں کرتی تھی کہ کمزور اور بیمار دشمن کو کسی ہتھیار سے مارے لیکن اسے مارنا بھی لازمی تھا جس کی تلاش میں وہ اٹھارہ سال سے بھٹک رہا تھا۔ اسے کسی صورت میں معاف نہیں کر سکتا تھا۔

اس نے تاریکی میں رائفل کے کندے سے اسے ٹٹولا پھر اس کے شانے پر اپنا ایک پاؤں رکھ دیا بھاری پاؤں۔ وزنی بوٹ اور کچل ڈالنے کی ضد۔ سلامت بیگ کی کمزور ہڈیاں کڑکڑانے لگیں۔ وہ کراہتے ہوئے بیٹھے ہی بیٹھے فرش پر گر پڑا۔ مراد نے ہولے سے ایک ٹھوکر ماری' وہ چت ہو گیا۔ اب اس کا کیچڑ آلود بوٹ کھانسیوں کے لرزتے ہوئے سینے پر رکھا تھا۔

"آہ۔ مجھے مرنے کا غم نہیں ہے۔ میں تو بہت پہلے تمہارے ہاتھوں سے مرجانا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی بہن کا ڈولا اٹھانے کے لیے تمہاری بہن کا سودا کیا تھا۔ اس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ تم اتنے خونخوار درندے بن جاؤ گے بعد میں احساس ہوا کہ میں نے اپنی بہن کی اور سارے کنبے کی موت کا سامان کیا ہے۔

آہ مگر تم نے مجھ پر احسان کیا۔ تم نے میرے گھر والوں پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ تم صرف مجھے تلاش کر رہے تھے۔ بنگش کے تھانیدار نے میری بہن کو بحفاظت اس کی سسرال پہنچانے کے لیے دو مسلح سپاہی براتیوں کے ساتھ بھیجے تھے۔ وہاں سے سات میل دور میراں بی بی کے چشمے کے قریب تم نے دونوں سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ باراتی میری بہن کی ڈولی چھوڑ کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ تم نے ہوائی فائر کیے اور انہیں للکار کر کہا۔ "رک جاؤ! میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ سلامت بیگ کی بہن' میری بہن ہے۔ یہ ڈولی ان ڈوگرا سپاہیوں کی حفاظت میں نہیں جائے گی جو مسلمان عورتوں کی عزت سے کھیلتے ہیں۔"

یہ کہہ کر تم گھوڑے سے اتر گئے' ڈولی کے قریب آئے اپنے جیب سے مٹھی بھر چاندی کے زیورات نکالے اور میری بہن سے کہا۔ "میری بہن نے اپنی عزت دینے سے پہلے اپنی جان دے دی۔ یہ زیورات نہیں ہیں۔ ایک بھائی کی محنت اور محبت ہے جو اس کی ڈولی میں جانے والے تھے۔ اب تمہاری ڈولی میں جائیں گے۔

تم نے وہ زیورات میری بہن کی گود میں رکھ دیے۔ آگے جا کر ڈولی کو کاندھا دیا۔ چار فرلانگ تک ڈولی اور براتیوں کے ساتھ گئے پھر اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں چلے گئے۔

یہ باتیں جب میں نے سنیں تو شرم سے زمین میں گڑ گیا۔ اس وقت میرے ضمیر نے مجھے کیسے کیسے ملامت کی' میں بیان نہیں کر سکتا۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ تمہارے سامنے چلا جاؤں۔ ایک بے غیرت کی طرح زندہ رہنے سے بہتر تھا کہ تمہارے ہاتھوں مر جاؤں اور تمہارے انتقام لینے کی حسرت پوری کر دوں۔ پھر میرے دل نے کہا کہ تم سے پہلے میں خدا کے حضور توبہ کیوں نہ کروں اپنے گناہوں کی معافی کیوں نہ مانگوں۔

ہاں میں مرنے سے پہلے اپنی عاقبت سنوارنا چاہتا تھا۔ جتنے گناہ کیے تھے ان سے زیادہ نیکیاں کرنا چاہتا تھا اور اپنا بیشتر وقت یاد الٰہی میں گزارنا چاہتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم مجھے کہاں تلاش کرتے پھر رہے ہو۔ ویسے اب میں تم سے دہشت زدہ نہیں تھا۔ صرف تم سے دور رہ کر زیادہ سے زیادہ عبادت اور نیکیاں حاصل کرنے کی مہلت چاہتا تھا۔ اس لیے سیکڑوں میل کا فاصلہ طے کر کے یہاں چلا آیا۔ مجھے کچھ حکیمی نسخے معلوم ہیں کچھ

جڑی بوٹیوں کے متعلق بھی جانتا ہوں۔ میں نے یہاں بیٹھ کر کتنے ہی مریضوں کا علاج کیا ہے۔ پہلے پہل سب ہی میرا نام پوچھتے تھے اور میں خود کو ایک گمنام' خدا کا بندہ کہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا نام یہاں سے اچھل کر تمہارے کانوں تک پہنچ جائے۔ میں روگ جانتا ہوں اور علاج کرتا ہوں۔ اس لیے لوگ مجھے روگی بابا کہتے ہیں۔ شاید اس لیے بھی کہتے ہیں کہ میں دوسروں کا علاج کرتا ہوں اور خود بیمار رہتا ہوں۔"

کوئی نہیں جانتا کہ مجھے کیا بیماری ہے۔ یہ تمہاری معصوم بہن کی بد دعائیں ہیں۔ جو مجھے اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ رہی ہیں۔ اٹھارہ سال کی عبادتوں کے دوران ہر سجدے میں' میں نے کھوٹ محسوس کیا۔ ابھی میں نے کہا تھا کہ میری عبادت میں کھوٹ نہیں ہے مگر اب اعتراف کرتا ہوں کیوں کہ میں خدا کو سجدہ کرتا تھا اور تم سے ڈرتا تھا۔ حالانکہ صرف خدا سے ڈرنا چاہیے۔ عبادت چوروں کی طرح چھپ کر نہیں کی جاتی لیکن گوشہ نشینی اور چلے کاٹنے کے بہانے چھپتا رہا۔ لب پر خدا کا نام اور دل میں تمہاری دہشت۔ آہ..... اٹھارہ سال کی عبادت پانی ہو گئی۔"

مراد نے غرا کر کہا۔

"ہوں۔ تو تم اٹھارہ سال سے گلتے سڑتے' کراہتے' خون تھوکتے اور ہر لمحے میرے انتظار میں مرتے رہے ہو۔ تم مجھ سے چھپتے رہے مگر خدا کے غضب کو اپنی عبادتوں سے بہلا نہ سکے۔ وہ جزا اور سزا کو سمجھنے اور برتنے والا تمہیں ایک مدت سے سزائیں دے رہا ہے۔ میں اب تمہیں کیا سزا دے سکتا ہوں۔ کچھ نہیں......"

اس نے سلامت بیگ کے سینے پر سے پاؤں ہٹا کر جیب سے دیا سلائی نکالی اور تیلی کو روشن کیا۔ اس کی روشنی میں سلامت بیگ ایک لاش کی طرح فرش پر پڑا نظر آیا۔ اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں' پچکے ہوئے رخسار' ابھری ہوئی ہڈیاں اور لانبی سفید داڑھی۔ وہ ایک مقدس بزرگ کا چہرہ تھا۔ تصویر کا دوسرا رخ سامنے آتے ہی مکروہ ہو گیا۔ وہ رحم طلب نظروں سے مراد کو دیکھ رہا تھا۔ مراد نے دوسری تیلی روشن کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ تم خدا سے زیادہ مجھ سے ڈرتے رہے ہو۔ کتنے احمق ہو اگر میں تمہیں مارتا تو ایک ہی وار میں ختم کر دیتا۔ ڈرنا تو اس سے چاہیے جو سزائیں دینے کا سلیقہ جانتا ہے اور ایک مدت سے تمہیں ایک ایک چٹکی موت دے رہا

ہے۔ جاؤ میں نے تمہیں معاف کیا۔ تمہیں خوف و دہشت سے آزاد کیا۔ میں تمہیں نہیں ماروں گا۔"

"آں" اس کا منہ حیرت سے کھل گیا کہ جابر دشمن اسے نہیں مارے گا۔"

اس کے دیدے مسرت سے پھیل گئے کہ برسوں کی اذیت سے نجات مل گئی ہے۔

اسے معافی مل گئی تھی۔ وہ آزاد ہوگیا تھا۔ موت اس سے دور ہوگئی تھی۔ ان مسرتوں کے ہجوم میں اس کا بیمار دل تیزی سے دھڑکنا چاہتا تھا مگر اس کا دھڑکنا اچانک ہی بند ہوگیا۔ مارے خوشی کے اس کا دم نکل گیا تھا۔

"سلامت بیگ، اٹھو اور سجدہ شکر ادا کرو۔"

وہ ساکت پڑا رہا۔

مراد نے تیسری تیلی روشن کی اور اس پر جھک کر اسے ٹٹولنے لگا۔

تیلی جل رہی تھی اور زندگی بجھ گئی تھی۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو برسوں موت کے خوف سے جیتے رہتے ہیں اور زندگی کا مژدہ سنتے ہی مرجاتے ہیں۔ الاؤ کو پھونکو تو آگ بڑھتی ہے۔ تیلی کو پھونکو تو آگ بجھ جاتی ہے۔ پھونکنے کا عمل ایک جیسا ہوتا ہے۔ صرف مقام کا فرق ہوتا ہے۔ مراد اس فرق کو نہ سمجھ سکا۔ اس نے ہمدردی کی اور اس کے تیلی جیسے ڈھانچے کو پھونک کر رکھ دیا۔

رات گزر گئی۔ دوسرا دن بھی گزرنے لگا۔ تیسرا بھائی بستی کے ایک کچے راستے سے گزرتا ہوا حویلی کی طرف جا رہا تھا۔ چوپال کے قریب سے گزرتے ہی شاداں کا نام سن کر ٹھٹک گیا۔ چند نوجوان چوپال میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا۔

"بڑے گھر کی عورتیں ہزار بار منہ کالا کریں پھر بھی ان کے چہرے کی کالک چھپ جاتی ہے شاداں کو دیکھو۔ وہ مراد سے کھیل چکی ہے مگر حویلی کی طرف منہ اٹھا کر سچی بات کہنے کی کسی کو جرات نہیں ہے۔"

اتنا سنتے ہی تیسرا بھائی گرجتا ہوا چوپال میں گیا اور اس نوجوان کا گریبان پکڑ کر کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔ نوجوان اس سے کمزور نہیں تھا۔ لہٰذا دونوں گتھم گتھا ہوگئے۔ دوسرے لوگ بیچ بچاؤ کرنے لگے۔ ذرا سی دیر میں یہ خبر دور دور تک پھیل گئی۔ باقی چھ بھائی دیکھتے ہی دیکھتے اپنے مسلح ملازموں کے ساتھ وہاں پہنچ گئے اور اس نوجوان کو لاتوں گھونسوں سے

مارنے لگے۔ نوجوان مار کھا کر چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

"تم سب مجھے مار سکتے ہو۔ اس لیے کہ میں اکیلا ہوں مگر تم مجھ پر ظلم کر کے سچائی کو نہیں چھپا سکو گے اگر تم بہادر ہو اور سچے ہو تو پہلے میری بات سنو......"

اس کی جرات دیکھ کر دوسرے نوجوان اس کی حمایت میں چیخنے لگے۔ بوڑھوں میں سے ایک نے بڑے بھائی کو مخاطب کیا۔

"چوہدری۔ اس کی بات سن لے۔ تو سچا ہے تو تیری پگڑی کا شملا اونچا ہی رہے گا۔"

بڑے بھائی نے ہاتھ اٹھا کر اپنے بھائیوں کو مار پیٹ سے روک دیا اور کہا۔

"جو آسمان کی طرف منہ اٹھا کر تھوکتا ہے، وہ تھوک اسی کے منہ پر آتا ہے۔ اس پاگل سے کہو کہ ہماری معصوم بہن پر الزام لگا رہا ہے تو اس کا ثبوت بھی پیش کرے اگر یہ الزام بے بنیاد ہوا تو ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

نوجوان نے چوتھے بھائی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

تمہارے اس بھائی نے نازو جیسی غریب لڑکی پر الزام عائد کیا تھا اور تم سب بھائیوں نے بغیر کسی ثبوت کے اس غریب کو بستی سے باہر نکال دیا تھا۔"

"میرا بھائی عینی شاہد ہے۔" بڑے چوہدری نے جواب دیا۔ "اس نے نازو کی بے حیائی کا تماشہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"میں بھی عینی شاہد ہوں۔ نوجوان نے چیخ کر کہا۔ "میں نے بھی تمہاری بہن کی بے حیائی کا تماشا....."

بات پوری ہونے سے پہلے ہی ایک بھائی نے بندوق کے کندے سے اس کے سر پر ضرب لگائی۔ پھر سب ہی اپنی بہن کو بدنام کرنے والے پر خونخوار درندوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔

ان کے ملازمین لوگوں کو ہانک ہانک کر دور بھگانے لگے۔ اچھی خاصی بھگدڑ مچ گئی۔ اور اسی دیر میں ان بھائیوں نے اس نوجوان کا قیمہ بنا کر رکھ دیا۔ پھر وہ چاروں طرف گھوم کر کہنے لگے۔

"پنڈ والو! اچھی طرح سن لو اور سمجھ لو۔ ہمارے خاندان کی کسی بہو بیٹی نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے ہمارے سر جھک جائیں۔ ہم نے شاداں کو پھول کی طرح رکھا ہے

اور کانوں کی طرح اس کی نگرانی کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر شاداں سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو ہم اسے زندہ جلا دیں گے اور ہم بھی بے غیرتوں کی طرح زندہ نہیں رہیں گے کہیں جا کر ڈوب مریں گے۔ ہم نے اپنے آباؤ اجداد سے یہی سیکھا ہے کہ عزت کے لیے جیو اور عزت کے لیے مر جاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ سب حویلی کی طرف چلے گئے۔ نوجوان کی لاش کے قریب اس کے گھر والے رونے ' پیٹنے لگے۔ دوسرے عبرت حاصل کر رہے تھے اور اپنے کانوں کو چھو کر صدق دل سے کہہ رہے تھے کہ شاداں عزت دار لڑکی ہے اور کسی ثبوت کے بغیر کوئی اس کے بھائیوں پر کیچڑ اچھال نہیں سکتا۔"

شاداں...... شام ڈھلے روٹیوں کا چھابہ اور پانی کی مٹکی لے کر حویلی سے نکلتی تو وہ بستی میں ویرانی سی نظر آتی۔ شام کی خاموشی میں کسی گھر سے رونے پیٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ سمجھ گئی کہ اسے بدنام کرنے والے نوجوان کی لاش پر ماتم کیا جا رہا ہے۔ سات بھائیوں کی اکلوتی بہن کو بدنام کرنے والوں کا کیا حشر ہوتا ہے۔ یہ ساری بستی والے دیکھ چکے تھے۔ شاداں کی گردن فخر سے تن گئی۔ اس کی چال میں شہزادیوں کا سا وقار اور تمکنت پیدا ہو گئی۔ اس کی بستی میں جتنے لوگ تھے سب زمین کے کیڑے تھے جو ہر وقت اس کے قدموں تلے روندے جا سکتے تھے۔

چلتے چلتے مراد کا خیال آیا تو اس کے غرور کو ٹھیس پہنچی۔ اب اس کے خیال سے دل پہ چوٹ لگتی تھی۔ کم بخت کھلونا سمجھ کر بلکہ ایک معمولی لڑکی سمجھ کر اس سے کھیل گیا تھا اور پلٹ کر نہیں آیا تھا۔ اب اس کی بڑی توہین اور کیا ہو سکتی تھی کہ وہ اسے ذرہ برابر اہمیت نہیں دے رہا تھا اور اس کے بھائی اس کے لٹیرے سے انتقام لینے میں ناکام رہے تھے۔

اونہہ! بھگوڑا بزدل۔ میرے بھائیوں کے ہتھے چڑھ جائے تو اس کا قیمہ بنا دیں گے۔ بھائی جان ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ وہ میری عزت کا دشمن تھا۔ دشمنی کر کے چلا گیا۔ اب کہیں نظر آ جائے تو میں اپنے بھائیوں کو ضرور بتاؤں گی کہ وہ مجھ سے کہاں ملنا چاہتا ہے......"

اس نے دروازے پر آ کر دستک دی تو پتہ چلا کہ اندر سے بند نہیں ہے۔ اس نے دروازے کو کھولا۔ کٹیا میں رات کا اندھیرا آہستہ آہستہ آنکھیں کھول رہا تھا اور جہاں بابا

بیٹھا کرتے تھے وہاں کوئی سر پر کمبل ڈالے بیٹھا ہوا تھا۔ شاداں نے آگے بڑھ کر کہا۔

"معلوم ہوتا ہے چراغ کا تیل ختم ہو گیا ہے۔ میں ابھی تیل ڈال کر جلاتی ہوں۔"

اس نے پانی کی مٹکی اور روٹیوں کا چھابہ ایک طرف رکھ دیا اور چراغ جلانے کے لیے آگے بڑھی۔ مراد نے کمبل کو ایک طرف پھینک دیا اور اٹھ کر اس کے قریب آیا۔ شاداں کی پشت اس کی جانب تھی۔ وہ اسے اٹھتے ہوئے نہ دیکھ سکی۔ مراد نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچ لیا اور اسے اس طرح سینے سے لگا کر بازوؤں میں جکڑ لیا کہ وہ چیخ بھی نہ سکی۔ اس کی سانسیں رک رہی تھیں۔ گھبراہٹ طاری ہو گئی تھی کہ نہ جانے کون ہے؟ اس کٹیا میں نہ نجانے کون ہے؟ اس کٹیا میں بابا کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہوتا لیکن بابا تو ہڈیوں کا ڈھانچہ ہیں اور یہ گوشت پوست کا پہاڑ ہے۔ اس کی مضبوط گرفت کچھ جانی پہچانی ہے۔ یہ وہی سانسوں کی غراہٹیں ہیں جن کی زد میں آ کر میں تھرا جاتی ہوں۔ آہ! یہ سانسیں میرے چہرے پر جھک رہی ہیں۔ میرے لبوں پر سلگ رہی ہیں۔ ہاں یہ..... انداز اسی کا ہے۔ یہ وہی ہے' یہ وہی ہے....."

"ہائے نامراد۔" اس نے تڑپ کر اپنی گداز بانہیں اس کی گردن میں حمائل کر دیں اور لپٹ لپٹ کر اور مچل مچل کر کہنے لگی۔ "ہائے میں مر جاؤں' تو کہاں چلا گیا تھا۔ بے درد! تیرے سینے میں دل ہی نہیں پتھر ہے' تو تڑپنا نہیں جانتا مگر مجھے تڑپاتا رہتا ہے میں تجھ سے نہیں بولوں گی۔ تو بے وفا ہے' ہرجائی ہے۔ میں تجھے پیار نہیں کروں گی....."

وہ شکایت کر رہی تھی اور گلے لگ رہی تھی۔ اس لیے بولنا نہیں چاہتی تھی اور بول رہی تھی۔ اس سے ناراض تھی اور اسے پیار کیے جا رہی تھی۔ پھر مراد نے کہا۔

"آہستہ بول شاداں' تیری آواز باہر تک جا رہی ہے۔"

تب وہ چونکی۔ اسے ہوش آیا کہ وہ کٹیا میں ہے اور اس کے سامنے اس کے بھائیوں کا دشمن اور اس کے دل کی دھڑکن موجود ہے۔ وہ دوڑتے ہوئے دروازے کے پاس آئی اسے اندر سے بند کیا پھر اسی طرح بھاگتے ہوئے واپس آ کر اپنے محبوب کی آغوش میں سما گئی۔

کتنی راتیں جاگنے اور تڑپنے کے بعد وہ ملا تھا۔ بابا نے ایسی اذیتوں سے چلہ نہیں کاٹا ہو گا جیسے وہ اس کے انتظار میں کاٹ چکی تھی۔ اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

"بابا کہاں ہیں؟"

مراد پیار کے رنگین لمحات میں اسے موت کی خبر نہیں سنانا چاہتا تھا۔ اس نے جواب دیا۔

"وہ یہاں نہیں ہیں۔ یہاں صرف ہم اور تم ہیں۔ ابھی ہم اپنی باتیں کریں گے۔ بابا کی باتیں پھر ہوتی رہیں گی۔"

وہ مان گئی۔ منہ زور جذبات نے منوالیا۔ وہ اپنی باتیں کرنے لگے۔

آنکھوں سے اور سانسوں سے۔ صرف آنکھیں ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔ باقی تمام حواس بڑھ بڑھ کر بول رہے تھے اور ایک دوسرے کو جذبوں کی سماعت سے سن رہے تھے۔

تاریکی میں کبھی چوڑیاں کھنکتی تھیں۔ "مراد! یہ چوڑیاں ہر رات کروٹ کروٹ تجھے پکارتی تھیں آخر تو آہی گیا۔"

اندھیرے میں کبھی کبھی وہ غراتے ہوئے دھیمی سرگوشی میں بولتا تھا۔ "میں جنگلوں اور پہاڑوں میں بھٹکتا ہوں اور پتھروں پر سوتا ہوں تو تیرے جسم کا ملائم بچھونا یاد آتا ہے۔ کسی شکار کو بھون کر کھاتا ہوں تو تیرے جسم کی بوٹی بوٹی میرے دانتوں میں گھلتی ہے۔"

"سچ مراد۔ کیا تو مجھے یاد کرتا ہے۔؟"

"ہاں تو آرام دہ بستر پر یاد کرتی تھی۔ میں خطرات سے الجھ الجھ کر تجھے یاد کرتا تھا۔ تجھ میں کتنا نشہ ہے۔ شاداں میں تجھے بھلانا چاہتا ہوں تب بھی نہیں بھلا سکتا۔ دیکھ لے! اپنی موت کی پروا کیے بغیر تجھ سے ملنے چلا آیا۔"

"ہائے تو کتنا دلیر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تو میرا دیوانہ ہے لیکن مراد ایک بات سے ڈرتی ہوں کہ اس دیوانگی میں کہیں تو مجھے بدنام نہ کردے۔ کیا تو مجھے بدنام کرے گا؟ کیا تو چاہے گا کہ تیری شاداں کی عزت خاک میں مل جائے؟"

مراد نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

میں اکثر یہی سوچتا ہوں کہ تجھے ہمیشہ کے لیے کس طرح اپناؤں۔ میں ایک اشتہاری مجرم ہوں تجھے عزت آبرو سے بیاہنے آؤں گا تو گرفتار ہو جاؤں گا اور تیرے بھائی کبھی تجھے میرے حوالے نہیں کریں گے۔ میں نے بارہا سوچا ہے کہ تجھے جبراً یہاں سے لے جاؤں

مگر کہاں لے جاؤں۔ میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ میں قدم قدم پر خطرات کا سامنا کرتا ہوں۔ تو نازو نعم میں پلی ہے۔ نازک مزاج ہے۔ یہ مصائب برداشت نہیں کر سکے گی۔"

"نہیں مراد میں تجھے اتنا چاہتی ہوں کہ تیرے ساتھ آگ اور خون کے دریاؤں سے گزر سکتی ہوں لیکن میں باپ دادا کے نام پر دھبہ لگا کر یہاں سے نہیں جانا چاہتی۔ میری باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ محبت کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہم اپنے بزرگوں پر کیچڑ اچھالیں اور برسوں کی بنائی ہوئی عزت کو مٹی میں ملادیں۔"

مراد کوئی جواب نہ دے سکا۔ خاموشی سے سوچتا رہا۔

"تو خاموش کیوں ہے؟ بولتا کیوں نہیں؟ کیا تو نہیں چاہتا کہ میں اپنی بستی میں عزت سے رہوں؟"

"چاہتا ہوں۔" اس نے آہستگی سے کہا۔ "میں رات کے اندھیرے میں ایک لٹیرے کی طرح آتا ہوں اور تو بڑی محبت اور مسرت سے اپنا سب کچھ میرے حوالے کر دیتی ہے۔ میں تیری محبت کا صلہ یہی دے سکتا ہوں کہ تجھے دن کے اجالے میں رسوا نہ ہونے دوں۔ تیرے دل کو صدمہ پہنچے گا تو مجھے سب سے زیادہ تکلیف ہوگی۔"

وہ خوشی سے لپٹ کر بولی۔

"تو کتنا اچھا ہے مراد۔ بس میں یہی چاہتی ہوں کہ اپنی جاگیر میں فخر سے گردن اونچی کر کے چلوں۔

میرے بھائی مجھ پر انگلی اٹھانے والوں کو جہنم میں پہنچا دیتے ہیں۔ ہماری وہی عزت ہے جو ہمیشہ سے رہی ہے اگر تو چاہے تو آئندہ بھی ہماری عزت بنی رہے گی۔"

"عشق اور مشک کبھی نہیں چھپتے شاداں۔ اگر ہم اسی طرح ملتے رہے تو ہمارے نہ چاہنے کے باوجود بدنامی پھیل جائے گی۔"

"بدنامی نہیں ہوگی۔ اگر روگی بابا مجھے......" وہ کہتے کہتے رک گئی۔ اسے روگی بابا یاد آگئے اس نے پوچھا۔ "تو نے بتایا نہیں کہ بابا کہاں ہیں؟"

"وہ مر چکے ہیں۔"

"کیا؟" وہ حیرت سے بولی۔ "تو تو نے یہاں چھپنے کے لیے انہیں مار ڈالا ہے۔"

"نہیں۔ میں نے انہیں نہیں مارا ہے۔ ان کے دن پورے ہوگئے تھے۔ وہ مر

گئے۔"

"تیری قسم شاداں۔ میں ڈنکے کی چوٹ پر قتل کرتا ہوں۔ کسی سے نہیں ڈرتا۔ میں تجھ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ تو ہی بتا کیا میں ایک بوڑھے اور کمزور انسان پر ہاتھ اٹھا سکتا ہوں؟"

"وہ قائل ہو کر بولی۔

"ان کے لاش کہاں ہے؟"

"میں نے اسی کٹیا کے کونے میں دفن کر دیا ہے۔"

"اوہ!" وہ بڑے دکھ سے بولی۔ "تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔ وہ بہت بڑے بزرگ تھے۔ میرے محسن تھے انہیں عزت اور احترام سے دفن کرنا چاہیے تھا۔ پنڈ والے کیا کہیں گے۔"

"اگر میں عزت اور احترام کے لیے تمہارے بھائیوں کو بلاتا تو اس وقت میں کہاں ہوتا۔ کیا تم مجھ سے مل سکتی تھیں۔"

"کچھ بھی ہو مراد۔ یہ اچھا نہیں کہ وہ خاموشی سے دفن ہو جائیں۔ یہاں ان کا مزار ہونا چاہیے۔

"تو پھر مزار بنالو۔ میں یہاں سے جاتا ہوں۔ تم اپنے بھائیوں سے کہہ دینا کہ میں یہاں آیا تھا اور بابا کو دفن کر کے چلا گیا۔

"نہیں" وہ مراد سے لپٹ گئی۔ "میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ تم جاؤ گے تو نہ جانے پھر کب ملو گے مگر...... آج چالیس دن پورے ہوگئے ہیں۔ کل سب لوگ بابا سے ملنے آئیں گے۔ تم یہاں کس طرح رہ سکتے ہو؟"

"میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے۔ تم اپنے بھائیوں سے کہنا کہ بابا مزید چالیس دن تک ایک وظیفہ پڑھیں گے۔ اس وظیفہ کی تاثیر یہ ہے کہ چالیسویں دن مراد ہاتھ باندھے خود کو گرفتاری کے لیے پیش کرنے یہاں آجائے گا۔"

شاداں حیرت سے اندھیرے میں گھورنے لگی۔ اسے مراد نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ ا تک ایک دوسرے کو چھو کر' سن کر پہچان رہے تھے۔ شاداں نے کہا۔

"نہ جانے کتنی دیر ہوگئی ہے۔ میں چراغ جلاتی ہوں۔ مجھے اب واپس جانا چاہیے

نہیں تو بھائیوں کو شبہ ہو جائے گا۔"

مراد نے ماچس کی تیلی روشن کی۔ شاداں مٹی کے تیل کی بوتل اٹھا کر چراغ میں ڈالنے لگی۔

لیکن چراغ کو روشن کرنے میں کافی دیر ہوگئی تھی۔ ورنہ روز کا یہی معمول تھا کہ وہ کٹیا میں داخل ہونے کے بعد پہلے چراغ جلاتی تھی۔

حویلی میں بڑا بھائی تھانیدار سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کمرے میں اس کے تین بھائی اور تھے۔ سب ہی اس مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے کہ جس نوجوان کو انہوں نے مارا ہے اسے حادثاتی موت کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔ بڑا بھائی کھڑکی کی جانب رخ کئے بیٹھا تھا۔ کھڑکی کے پار تقریباً سو گز کے فاصلے پر وہ کٹیا تھی۔ جو اندھیرے میں صاف طور پر نظر نہیں آتی تھی لیکن شام کو چراغ جلتے ہی اس کی روشنی بتا دیتی تھی کہ شاداں وہاں پہنچ گئی ہے۔

بڑے بھائی نے بڑی بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے اپنے ایک بھائی سے پوچھا۔

"کیا شاداں آج چراغ جلانے نہیں گئی؟"

"گئی ہے۔ میں نے اسے کٹیا کے دروازے تک جاتے دیکھا ہے۔ میں یہاں حویلی کے دروازے پر تھا جب وہ اندر چلی گئی تو میں یہاں آگیا۔"

"تو پھر کٹیا میں اندھیرا کیوں ہے۔ جاؤ' عورتوں سے پوچھو' وہ واپس آئی ہے یا نہیں۔"

ایک بھائی کمرے سے باہر چلا گیا۔ باقی سب کھڑکی کے پار دیکھنے لگے۔ اسی وقت کٹیا میں روشنی کے آثار نظر آئے۔ چراغ جل رہا تھا لیکن اس کی روشنی خطرے کا سگنل بن گئی تھی۔

بہت دیر ہوگئی تھی لیکن چراغ کے جلانے کے بعد بھی شاداں کو رکنا پڑا کیونکہ مراد صبح سے بھوکا تھا اور اس کی لائی ہوئی روٹیاں کھا رہا تھا۔

روٹیاں کھانے کے بعد اس نے دونوں ہاتھوں سے مٹکی اٹھا کر بلند کی اور پانی کی دھار اپنے حلق میں ڈالنے لگا۔ اس کے بازو اٹھے ہوئے تھے۔ سینہ چٹان کی طرح پھیل گیا تھا۔ شاداں خمار آلود نظروں سے اس فولادی محبوب کو دیکھ رہی تھی۔ اسے چھوڑ کر جانے کو

جی نہیں چاہتا تھا مگر مجبور تھی اگلی ملاقات کے لیے اس وقت بچھڑ جانا ضروری تھا۔

پانی پیتے پیتے اچانک ہی مراد نے مٹکی رکھ دی اور وحشیوں کی طرح دیدے پھیلا کر ادھر اودھر دیوانوں کی طرح دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا؟" شاداں نے [illegible] پوچھا۔

اس نے اس کے منہ [illegible] چپ رہنے کا اشارہ کیا پھر بیٹھے ہی بیٹھے لیٹ گیا اور زمین سے کان لگا کر کچھ [illegible] لگا۔ بہت دھیمی [illegible] سی آوازیں تھیں۔ ان آوازوں کو جنگل کے درندے ہی سن سکتے تھے یا پھر درندہ مراد سن رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ کٹیا کے آگے پیچھے دائیں اور بائیں بہت سے لوگ ہیں۔ جو دبے پاؤں ادھر سے ادھر جا رہے ہیں اور کٹیا کو گھیر رہے ہیں۔

وہ فرش پر لڑھکتا ہوا اپنی رائفل اور کارتوس کی پیٹی کے قریب چلا آیا۔ شاداں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہی تھی۔ اتنا تو سمجھ ہی گئی تھی کہ کوئی خطرہ پیش آگیا ہے۔

پھر باہر سے تھانیدار کی آواز سنائی دی۔

"مراد۔ تو چاروں طرف سے گھیرا جا چکا ہے۔ آج تجھے بھاگنے کا راستہ نہیں ملے گا چپ چاپ ہاتھ اٹھا کر باہر آجا....."

اس کے بعد بڑے بھائی کی آواز سنائی دی۔

"تھانیدار جی اس سے کہو کہ پہلے شاداں کو باہر بھیج دے۔"

"بھیج رہا ہوں۔ لو سنبھالو....." مراد نے دانت پیس کر کہا اور اس طرف فائر کر دیا۔ جہاں سے بڑے بھائی کی آواز آئی تھی۔ "ٹھائیں" کی آواز کے ساتھ ہی بڑے بھائی کی چیخ سنائی دی۔ شاداں چیختی ہوئی مراد سے لپٹ گئی اور گڑگڑا کر کہنے لگی۔

"نہیں مراد۔ تو میرے لیے جھگڑا کرے گا تو میں بدنام ہو جاؤں گی۔ مجھے یہاں سے جانے دے۔" مراد نے اس کے بالوں کو مٹھی سے جکڑ کر کہا۔

"تو یہاں سے جا کر مجھے نہتا کرنا چاہتی ہے۔ میں دشمنوں کی چال کو اچھی طرح سمجھتا ہوں تو جب تک یہاں رہے گی وہ مجھ پر گولیاں نہیں چلائیں گے اگر چلائیں گے تو مجھ سے پہلے اپنی بہن کو نشانہ بنائیں گے۔ میں اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے شاداں کو پیال کے بستر پر گرا دیا اور وہاں سے پلٹ کر چراغ کو گل کر دیا۔ کٹیا میں تاریکی پھیل گئی۔ باہر بھی تاریکی تھی۔ ابھی چاند بھی نہیں نکلا تھا۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں دو ملازم بڑے بھائی کو اٹھا کر وہاں سے دور لے جا رہے تھے۔ تھانیدار نے کہا۔

"انہیں حویلی سے دور لے جاؤ۔"

"نہیں۔" بڑے بھائی نے کراہتے ہوئے کہا۔ "گولی بازو کا گوشت ادھیڑ کر نکل گئی ہے زخم گہرا نہیں ہے۔ جب تک شاداں کٹیا کے باہر نہیں آئے گی میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ آہ ہماری عزت خاک میں ملنے والی ہے۔ اسی عزت کا بھرم رکھنے کے لیے ہم نے آج پنڈ کے ایک نوجوان کو مار ڈالا ہے آج اگر پنڈ والوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ شاداں مراد کے ساتھ اس کٹیا میں ہے تو ہم کسی سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکیں گے۔ تھانیدار جی! فائرنگ کی آواز دور تک گئی ہوگی۔ لوگ فائرنگ کی وجہ معلوم کرنے یہاں آسکتے ہیں۔ آپ میرے بھائیوں اور ملازموں کو لے کر جائیے اور پنڈ والوں کو حکم دیجئے کہ وہ اپنے گھروں سے نہ نکلیں۔ کیوں کہ ہم مراد کو گھیر رہے ہیں۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ پنڈ والے فائرنگ کی زد میں آجائیں۔ اگر کسی نے شاداں کی چیخ سنی ہو تو کہہ دینا کہ وہ حویلی کی ایک ملازمہ کو اٹھا کر لے جا رہا تھا ایک جگہ گھیر لیا گیا ہے آپ ہمیں بدنامی سے بچانے کے لیے جو کچھ کر سکتے ہیں کریں۔ میں آپ کو منہ مانگا انعام دوں گا۔"

تھانیدار اس کے تین بھائیوں اور چند ملازموں کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔ باقی چار بھائی اور دو سپاہیوں نے مل کر کٹیا کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا اور دونوں سپاہی کٹیا کے پیچھے زمین پر لیٹے ہوئے تھے۔ سب کی رائفلیں سیدھی تھیں اور ان کا رخ کٹیا کی جانب تھا۔

پھر ایک بھائی نے درخت کے پیچھے سے شاداں کو مخاطب کیا۔

"شاداں۔ تو جب تک کٹیا میں ہے اس وقت تک ایک آواز نہ نکالنا اگر تیری آواز پنڈ والوں تک پہنچ گئی تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے گے۔"

مراد نے چھت کی طرف منہ اٹھا کر فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

عزت اتنی ہی پیاری ہے تو میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ میں شاداں کو لے کر یہاں

سے جاؤں گا اگر تم لوگ چھپ کر حملہ کرو گے تو میرے ساتھ تمہاری بہن بھی ماری جائے گی اور اگر چپ چاپ مجھے یہاں سے نکل جانے دو گے تو یہ تمہیں صبح سے پہلے واپس مل جائے گی۔"

شاداں نے دیوار کی طرف رخ کر کے کہا۔

"لالہ۔ اس کی بات مان لے۔ یہ زبان کا دھنی ہے۔ مجھے صبح سے پہلے چھوڑ دے گا۔"

"تو بکواس نہ کر۔" بھائی نے ڈانٹ کر کہا۔ "تجھ سے زبان بند رکھنے کے لیے کہا ہے۔ تو خاموش رہ ہم اس سے نمٹ لیں گے۔"

ایک گڑھے میں چھپے ہوئے دو بھائیوں میں سے ایک بھائی دوڑتا ہوا بیل گاڑی کے پیچھے آیا۔ اس نے وہاں چھپے ہوئے بھائی کے کان میں کچھ کہا پھر وہ دونوں نے بیل گاڑی کے اگلے حصے کو پکڑ کر دھکیلتے ہوئے کٹیا کی دیوار سے ٹکرا دیا۔ کٹیا میں ایک زلزلہ سا آگیا۔ بانس کی دیوار لرزتی اور کڑکڑاتی ہوئی اندر کی طرف جھک گئی۔

"ٹھائیں۔ ٹھائیں۔" مراد نے دو فائر کئے پھر چیخ کر کہا۔

"بے وقوفو! تم میرا محاذ توڑ کر شاداں کو نہیں لے جا سکو گے۔ عقل سے کام لو ورنہ میں تمہاری عزت خاک میں ملا دوں گا۔"

شاداں اس کے پیروں سے لپٹ کر بولی۔

"نہیں مراد ایسی بات زبان پر نہ لا۔ تو نے ابھی وعدہ کیا تھا کہ مجھے بدنام نہیں ہونے دے گا۔ تیرا دعویٰ ہے کہ تو زبان کا سچا ہے پھر تو اپنی زبان سے کیوں پھرتا ہے۔ مجھے تماشا کیوں بنا رہا ہے۔ پنڈ کے لوگ ادھر آ گئے تو وہ تیری شاداں کو کیا کہیں گے؟"

مراد۔ ذرا دیر تک چپ رہا پھر بولا۔

میں تجھے بدنام نہیں کر رہا ہوں۔ میں اپنی زبان پر قائم ہوں۔ تیرے بھائی یہاں ہنگامہ کر کے تجھے بدنام کرنا چاہتے ہیں۔"

"ہنگامہ صرف تیرے لیے نہیں میرے لیے بھی ہے۔ میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔ تو تم مردوں کا مقابلہ ہو گا۔ تمہارے درمیان ایک عورت بدنام نہیں ہو گی۔"

"تو خود غرض ہے۔ مجھے چھوڑ کر جانا چاہتی ہے۔"

"خود غرض تو ہے۔ مرد ہو کر ایک عورت کو ڈھال بنا رہا ہے کیا یہی تیری مردانگی ہے؟"

مراد کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ شاداں سمجھتی تھی کہ اس کی بات تھپڑ کی طرح ہو گی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر لپٹ گئی۔

"میں تجھ پر فخر کرتی ہوں کہ میرا مراد دلیر اور گبرو جوان ہے۔ تیرا نام سن کر ڈوگرا شاہی کو پسینہ آ جاتا ہے۔ میرے ساتوں بھائیوں کی آنکھوں سے نیند اڑ جاتی ہے۔ تو زبان سے جو کہتا ہے وہ پورا کر دکھاتا ہے۔ پھر اپنی محبت کو کیوں رسوا کر رہا ہے؟"

شاداں اسے اپنی محبت کا یقین دلا رہی تھی اور اپنی آزادی کے لیے التجائیں کر رہی تھی۔

کٹیا کی تاریکی میں مراد اس کے مچلتے ہوئے بدن کے لمس کو محسوس کر رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ یہ وہی عورت ہے...... اس نے مجھے بہت کچھ دیا ہے اور ان کے بدلے صرف یہ چاہتی ہے کہ میں اس کی عزت کا بھرم رکھوں۔ محبت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اپنی جان حیات کو رسوائیوں سے بچایا جائے۔ مردانگی بھی یہی کہتی ہے کہ عورت کو ڈھال نہ بنایا جائے۔

اسے خاموش پا کر شاداں نے پوچھا۔

"تیری خاموشی کا کیا مطلب ہے؟ کیا تو اپنی شاداں سے سچی محبت نہیں کرتا ہے؟ تو عزت کے معنی نہیں سمجھتا ہے؟ اگر نہیں سمجھتا ہے تو بتا تو نے اپنی بہن کی رسوائیوں سے تلملا کر دھرم دیر کو کیوں مار ڈالا تھا؟ کیا دنیا میں تیری ایک بہن ہی تھی کیا میں کسی کی بہن نہیں ہوں۔ یہ کیسی خود غرضی ہے کہ لوگ صرف اپنی بہنوں کی عزت کا پاس کرتے ہیں اور دوسروں کی بہنوں کو کھلونا بنانے کے لیے محبوبہ کا خوب صورت سا خطاب دیتے ہیں اور محبت میں آزمائش کا وقت آئے تو اسے بدنام ہونے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔"

مراد نے تڑپ کر کہا۔

"بس کر شاداں مجھے الزام نہ دے تو نے تو مرد دیکھے ہی نہیں ہیں جو پیار کی آبرو کے لیے اپنی جان دے دیتے ہیں۔ جا یہاں سے چلی جا۔ میں سلامت بیگ سے اپنی بہن کا انتقام لینے کے لیے جی رہا تھا۔ اب تیری عزت کا بھرم رکھنے کے لیے موت کو گلے لگاؤں

گا۔ چلی جا یہاں سے......"

شاداں کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ مراد اسے جانے کی اجازت دے رہا ہے۔ وہ پھر ایک بار بولی۔

"تو سچ کہہ رہا ہے۔ کیا میں چلی جاؤں؟"

مراد نے شانے سے رائفل لٹکائی اور کہا۔

"ہاں شاداں تو میری محبت ہے' میری عزت ہے اور میری آخری مسرت ہے۔ میں تجھے بدنام نہیں ہونے دوں گا۔"

اس نے دونوں بازوؤں میں اسے اٹھالیا اور دروازے کی طرف جانے لگا۔ شاداں اچانک ہی اس سے لپٹ کر رونے لگی۔"

"تو یہاں سے فرار ہو جائے گا' ناں؟"

"تو میری پروا نہ کر۔"

"کیسے نہ کروں۔ میں اس اعتماد کے ساتھ جا رہی ہوں کہ تو کبھی دشمنوں کے ہاتھ نہیں آتا۔ تو یہاں سے چلا جائے گا اور پھر ایک دن مجھ سے ملنے آئے گا' آئے گا ناں؟"

"ہاں۔ آؤں گا' وہ اندھیرے میں بڑی اداسی سے مسکرا رہا تھا۔

دروازے پر پہنچ کر اس نے اپنے بازوؤں سے اسے اتار دیا۔ وہ پھر اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ آہ! عورت کے پیار کی یہی ادائیں مار دیتی ہیں۔ جاتے جاتے پلٹتی ہے۔ وصال کی آس دلاتی ہے اور جدائی کا روگ لگا جاتی ہے۔

"میں جاؤں۔؟"

"جلدی آئے گا ناں؟"

"جلدی آؤں گا۔"

وہ دروازے کی طرف پلٹ کر بلند آواز سے بولی۔

"ویرے.....! میں آرہی ہوں گولی نہ چلانا۔

تمام لوگ چونکے ہو کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ دروازہ کھل گیا تھا۔ شاداں بھی وہاں کھڑی تھی۔ اس کے پیچھے مراد سائے کی طرح نظر آرہا تھا۔ اگر وہ فوراً ہی ہٹ جاتی تو کوئی بھی اس سائے پر گولی چلا سکتا تھا لیکن مراد نے جب تک دروازے کو اندر سے

بند نہیں کیا۔ وہ وہاں جم کر کھڑی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ ایک بھائی نے گڑھے سے سر ابھار کر کہا۔

"جتنی جلدی ہو سکے حویلی چلی جا۔ اب ہم مراد کو کتے کی موت ماریں گے۔"

"نہیں ویریا۔" وہ دوڑتے ہوئے گڑھے میں پہنچی اور بھائی سے بولی۔ اس نے ہم سب پر احسان کیا ہے۔ مجھے بدنامی سے بچایا۔ تم اسے جانے دو۔"

بکواس نہ کر' چپ چاپ حویلی چلی جا۔"

"نہیں جاؤں گی۔ ایک اکیلے کو گھیر کر مارنا بہادری نہیں۔"

اس کے بھائی نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کیا۔ وہ الٹ کر گر پڑی۔ دوسرے بھائی نے کٹیا کی طرف فائر کر دیا۔

"نہیں۔" وہ چیختے ہوئے کٹیا کی طرف جانے کے لیے اٹھی مگر پاس بیٹھے ہوئے بھائی نے پکڑ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا

" کمینی چیختی ہے۔ پنڈ والوں کو اپنی عزت کا تماشہ دکھانا چاہتی ہے۔ میں تجھے زندہ دفن کر دوں گا۔"

وہ محض دھمکیاں دے رہا تھا۔ اس وقت محاذ چھوڑ کر اسے حویلی تک پہنچانے نہیں جا سکتا تھا اس لیے اس کے منہ پر مضبوطی سے ہاتھ جمائے بیٹھا تھا۔

پھر چاروں طرف سے گولیاں چلنے لگیں۔ تمام گولیاں کٹیا کے اندر جا رہی تھیں لیکن مراد کی آواز نہیں آرہی تھی۔ اسی وقت دو بھائی تھانیدار کے ساتھ واپس آگئے تھے۔ انہیں بتا دیا گیا تھا کہ شاداں بخیریت کٹیا سے واپس آگئی ہے۔ تھانیدار نے مراد کو للکارتے ہوئے کہا۔

اوئے نا مرادے۔ سیدھی طرح باہر آجا۔ ورنہ اسی کٹیا میں تیری قبر بنے گی......"

مراد کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ سب پریشان ہو کر سوچنے لگے کسی میں اتنی جرات نہیں تھی کہ وہ دروازے تک جاتا۔ کیا پتہ کب اس کی طرف سے فائرنگ شروع ہو جاتی۔ تھانیدار کچھ سوچ کر اپنے دو سپاہیوں کی طرف گیا۔ تھوڑی دیر بعد سب نے یہ دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں کپڑے کا گولہ مشعل کی طرح جل رہا تھا' اس نے چیخ کر کہا۔

"سانپ بل سے باہر نہ آئے تو آگ جلا کر اسے باہر نکلنے پر مجبور کرتے ہیں۔ چل اب باہر آجا......"

یہ کہہ کر اس نے آگ کا گولا گھاس پھوس کی چھت پر پھینک دیا۔ سوکھی گھاس پر آگ کے شعلے لہرا لہرا کر پھیلتے چلے گئے اور بانس کی کھپچیوں سے بنی ہوئی دیواروں کو اپنی لپیٹ میں لینے لگے۔

شاداں اپنے بھائی کی مضبوط گرفت میں تلملانے لگی۔ اس کے منہ پر اتنی سختی سے ہاتھ جما ہوا تھا کہ وہ چیخ بھی نہیں سکتی تھی لیکن وہ دل ہی دل میں چیخ رہی تھی۔

"مراد۔ باہر آجا' مراد تو خاموش کیوں ہے؟ تو باہر کیوں نہیں آتا؟" شعلے بلند سے بلند تر ہو رہے تھے۔ کٹیا کے چاروں طرف آگ اتنی تیزی سے بھڑک رہی تھی کہ نہ کوئی اندر جا سکتا تھا اور نہ وہ باہر آسکتا تھا۔

تھانیدار دوڑتا ہوا بڑے بھائی کے پاس آیا اور پریشانی سے بولا۔

"چوہدری صاحب۔ وہ پاگل ہو گیا ہے۔ باہر نہیں آرہا ہے۔"

"اچھا ہے۔ اسے جل جانے دیجئے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" تھانیدار نے کہا۔ میرے انعام کی رقم کا کیا ہوگا؟ مجھے دس ہزار روپے کیسے ملیں گے؟ "میں کیسے ثابت کروں گا کہ وہ جلی ہوئی لاش مراد علی بنگش کی ہے۔"

بڑے بھائی نے اپنے زخمی بازو پر ہاتھ رکھ کر کراہتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کو دس ہزار روپے دوں گا۔ آپ اپنی زبان بند رکھیں۔ اس کا جل جانا ہی بہتر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کم بخت نے روگی بابا کو ہلاک کر کے ان کی لاش کہیں چھپا دی ہے۔ اب وہ جل جائے گا تو پنڈ والے یہی سمجھیں گے کہ روگی بابا جل گئے ہیں۔ ہم بھی یہی کہیں گے کہ مراد کٹیا میں آگ لگا کر فرار ہو گیا ہے۔ ہم نے آگ بجھانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ آپ جانتے ہیں کہ روگی بابا کے بے شمار عقیدت مند ہیں۔ انہیں فریب میں رکھنے کے لیے کہانی گھڑنی پڑے گی۔ ورنہ ہمیشہ پنڈ والے یہ سوچ کر ہم سے نفرت کریں گے کہ ہم نے کٹیا میں آگ لگا کر بابا کو زندہ جلا دیا ہے۔ خس کم جہاں پاک۔ ہم ہمیشہ کے لیے بدنامی سے بچ گئے۔ سرکاری طور پر مراد کی تلاش جاری رہے گی۔ مگر اب

سکون سے سویا کریں گے۔"

آگ بھڑک رہی تھی۔ شعلے بلند ہو رہے تھے اور دھواں آسمان کو چھونے جا رہا تھا۔

شاداں کے ہاتھ پر ایک مضبوط ہاتھ کا پہرہ تھا وہ وحشت سے دیدے پھیلائے جلتی ہوئی کٹیا کو دیکھ رہی تھی۔ اس جلتی ہوئی کٹیا سے ایک دن مراد نے اسے نکالا تھا اور آج اسی کٹیا کی آگ میں محبت کی کہانی کو انجام تک پہنچا رہا تھا۔ آگ...... ایک لالچ کی آگ ہوتی ہے وہ آگ تھانیدار نے انعام کے لالچ میں لگائی تھی۔

ایک غیرت کی آگ ہوتی ہے۔ سات بھائیوں نے غیرت کے نام پر وہ آگ لگائی تھی اور انتقام کے نام پر دل کی آگ بجھا رہے تھے۔ ایک محبت کی آگ ہوتی ہے جس میں پروانہ جلتا ہے۔ وہ خاموشی سے جلنے اور مرنے والا پروانہ نہیں تھا۔ اس کے ہاتھوں میں رائفل تھی۔ نشانہ سچا تھا۔ کارتوس اتنے تھے کہ وہ گھنٹوں مقابلہ پر ڈٹا رہتا یا تو ہمیشہ کی طرح دشمنوں کو مار کر نکل جاتا یا بہادری سے لڑتے لڑتے مرجاتا مگر لڑنے کی آرزو مرگئی تھی۔ وہ کس کے لیے لڑتا؟ وہاں سے صحیح سلامت نکل جاتا تو پھر کسی دن محبت کی آگ اسے کھینچ کر لاتی۔

یہی ہوتا ہے جہاں پیار کی شمع جلتی ہے۔ وہاں پروانہ آتا ہے۔ شمع آنسو بہاتی ہے۔ "ہائے میں بدنام ہو جاؤں گی۔" اور پروانہ فیصلہ کرتا ہے کہ بار بار آکر بدنامیوں کے اندیشے پیدا کرے یا ایک ہی بار جل کر شمع کی آبرو رکھ لے؟ وہ تمام رسوائیوں کو سمیٹ کر ایک ہی بار جل گیا۔

شاداں کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے ٹپکنے لگے۔

"نی شاداں۔! تم نے وہ مرد دیکھے ہی نہیں جو پیار کی آبرو کے لیے اپنی جان دیتے ہیں۔"

پروانہ جل رہا تھا شمع جلا رہی تھی اور موم کے آنسو رو رہی تھی۔

○☆○

غیرت مند

مشہور ماہرِ نفسیات ولفی کہتا ہے۔
"احساس برتری کے پیچھے احساس کمتری پوشیدہ رہتا ہے۔
یہ کہانی انکشاف کرتی ہے۔
"غیرت مندی کے پیچھے بے غیرتی کی بھرمار ہوتی ہے۔"
کیا آپ جانتے ہیں کہ جھوٹ بولنے کا سلیقہ ہو تو وہ سچ بن جاتا ہے۔
بے غیرتی کا فن آتا ہو تو وہ غیرت بن جاتی ہے۔
آپ نہیں مانتے تو اس کہانی کو پڑھ کر مان لیں گے۔

غیرت مند

میرا میر خان کی صاحب زادی افشاں کی سالگرہ تھی۔ افشاں بھی دو برس کی تھی۔ وہ اپنے ننھے ہاتھوں سے اپنے جنم دن کا کیک نہیں کاٹ سکتی تھی۔ اس کی امی نے خود اپنے ہاتھوں سے کیک کاٹ کر اور خود کھا کر اپنی آدھی سالگرہ منالی۔ اتنی سی بچی کیا جانے کہ عمر کیا ہوتی ہے۔ یہ عمر دولت سے کیسے بڑھ جاتی ہے اور غربت سے کیسے گھٹنے لگتی ہے۔ دولت مند گھرانوں میں بس یونہی کھانے پینے اور خوشیاں منانے کے بہانے ڈھونڈ لیے جاتے ہیں اور میرا میر خان کے پاس تو اتنی دولت تھی...... اتنی دولت کہ دودھ سے کلیاں کرتے تھے۔

جب وہ فخر سے سر اٹھا کر چلتے تو انہیں آسمان نظر آتا تھا یا سامنے کے لوگ نظر آتے تھے۔ انہوں نے زمین کبھی نہیں دیکھی تھی کہ چلتے وقت کسے کچلتے جا رہے ہیں۔ اب انسان ہمیشہ سر جھکا کر تو نہیں چلتا۔ کتنے کیڑے مکوڑے اور چیونٹیاں قدموں تلے آکر کچلی جاتی ہیں' یہ حساب آج تک کسی نے نہیں کیا۔

ان کی عالیشان کوٹھی کے باہر ایک چیونٹی خیرات مانگنے کھڑی ہوئی تھی۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں اس کی جوانی میلی میلی سی نظر آرہی تھی۔ اس کی گود میں بھی دو برس کی ایک ننھی سی بچی تھی۔ میرا میر خان اپنے مہمانوں کے درمیان ہنسنے بولنے میں مگن تھے۔ ان

کے ایک ملازم نے انہیں ایک طرف بلا کر کچھ کہا تو ان کے چہرے سے ساری خوشیاں مکھیوں کی طرح اڑ گئیں۔ انہوں نے چور نظروں سے اپنی بیگم کی جانب دیکھا۔

بیگم ہنس ہنس کر اپنی سہیلیوں سے باتیں کر رہی تھیں۔ ننھی افشاں ہاتھوں ہاتھ لی جا رہی تھی۔ وہاں اتنی ساری خوشیاں تھیں کہ خوشیوں کے ہجوم میں بیگم نے تھوڑی دیر کے لیے اپنے میاں کو بھلا دیا تھا۔ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر باہر آ گئے۔

باہر کوٹھی کی دیواروں سے لٹکتے ہوئے قمقمے جلتے بجھتے جا رہے تھے۔ جب وہ نوجوان چپراسی کے سامنے پہنچے تو بالکل ہی بجھ کر رہ گئے۔ انہوں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"زرینہ تم...... تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

"زرینہ نے اپنی گود کی بچی کو ان کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی آپ کی بچی ہے۔ آپ ایک بچی کی سالگرہ منا رہے ہیں' کیا دوسری کے لیے دل میں کوئی خوشی پیدا نہیں ہوتی ہے؟"

"بکواس مت کرو۔" انہوں نے دبی دبی سرگوشی میں بڑی سختی سے کہا۔ "کیا تم مجھے بدنام کرنے آئی ہو؟ پتہ نہیں کس کا گناہ میرے سر تھوپ رہی ہو۔"

"خدا کے لیے ایسا نہ کہیں۔ خود کو بچانے کے لیے اپنی بچی کو بدنام نہ کریں کہ یہ کسی اور کا گناہ ہے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب تک میں اس کوٹھی میں کام کرتی رہی۔ آپ اپنی بیگم سے چھپ چھپ کر میرے پاس آتے رہے۔ ان دنوں آپ کی کوٹھی میں آپ کا کوئی مرد رشتہ دار نہیں تھا۔ اتنی بڑی کوٹھی میں صرف آپ ہی میری تنہائی کے شریک رہے۔ اس بات کی بیگم صاحبہ گواہ ہیں۔ ایک دن انہوں نے اپنی آنکھوں سے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ اور مجھے دھکے دے کر یہاں سے نکال دیا تھا۔"

وہ کہہ رہی تھی۔ اس کے اداس چہرے پر قمقموں کا ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ پائیں باغ کی تنہائی میں میرا میر خان مجرم بنے اس کی باتیں خاموشی سے سن رہے تھے۔ اس وقت اپنی عزت اور اپنی خاندانی شرافت کو بحال رکھنے کا سوال پیدا ہو گیا تھا۔ جوانی میں کون غلطیاں نہیں کرتا۔ ان سے بھی ایک غلطی ہوئی تھی۔ غلطی کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ غلطی کو گلے لگایا جائے۔ عزت آبرو سے زندہ رہنے کے لیے آئندہ ایسی

حماقت سے دور بھاگنا لازمی ہو جاتا ہے۔ موجودہ حالات کا تقاضا یہ تھا کہ فی الحال نرمی سے کام لیں۔ ڈانٹ ڈپٹ یا رعب جمانے سے یہ بات کوٹھی میں آئے ہوئے مہمانوں تک پہنچ سکتی تھی۔ وہ اسے ٹالنے کی کوئی مناسب تدبیر سوچ رہے تھے۔ زرینہ کہتی جا رہی تھی۔

"جب میری ماں کو پتہ چلا کہ میں ماں بننے والی ہوں تو وہ غیرت مند یہ صدمہ برداشت نہ کر سکی۔ انسان عزت اور غیرت کے لیے زندہ رہتا ہے یہ نہ ہو تو وہ مر جائے۔ وہ بھی مر گئی مگر میں بدنامی اٹھا رہی ہوں۔ آپ کا نام زبان پر نہیں لاتی ہوں۔ جو آپ کی طرح عزت دار ہیں وہ یہی کہیں گے کہ میں آسمان پر تھوک رہی ہوں۔ میں تو کسی طرح جی لوں گی مگر یہ سوچ کر کانپ جاتی ہوں کہ یہ میری اور آپ کی بیٹی بھی آپ کے نام کے بغیر بدنام ہوتی رہے گی۔ اسی لیے آپ سے التجا کرنے آئی ہوں کہ آپ کم از کم اس معصوم کی عزت کا تحفظ کریں۔"

میرا میر خان نے جواب دینے سے پہلے کوٹھی کی جانب دیکھا۔ کہیں کوئی آ تو نہیں رہا ہے! اتنی سردی میں کسی کے باہر آنے کی توقع نہیں تھی۔ انہوں نے قدرے مطمئن ہو کر کہا۔

"نہ جانے یہ کس کی بچی ہے۔ تم اسے مجھ سے منسوب کر رہی ہو۔ میں عزت دار آدمی ہوں۔ تم سے جھگڑا نہیں کروں گا۔ تم مطلب کی بات کہو اور تم کیا کہو گی۔ تمہاری باتوں سے میں سمجھ گیا ہوں کہ اب ساری عمر سزا کے طور پر مجھے جرمانہ ادا کرتے رہنا ہو گا۔ دیکھو' میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میں پہلی اور آخری بات کہہ دیتا ہوں کہ اس بچی کے لیے میں ہر ماہ پانچ سو روپے دیا کروں گا۔ جب یہ بڑی ہو جائے گی تو ہزار روپے دیا کروں گا۔ تم اسے لے کر دور کسی محلے میں چلی جاؤ۔"

"آپ کے پیسوں پر آپ کی بیٹی کا حق ہے۔ اسے زندہ رکھنے کے لیے آپ کی مدد کی ضرورت ہے مگر باپ کے نام کی کمی کیسے پوری ہو گی؟"

"یہ ناممکن سی بات نہیں ہے۔ کوئی پوچھے تو کہہ دینا اس کا باپ مر چکا ہے۔"

"آں؟" زرینہ کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بچی کے زندہ باپ کو دیکھ رہی تھی۔ جو مردے کی طرح بول رہا تھا۔ جوانی کی پہلی ہی ٹھوکر سمجھا

رہی تھی کہ ایسے بچوں کے پیدا ہونے سے پہلے ہی ان کے باپ مرجاتے ہیں۔ نہیں باپ نہیں مرتے' بچوں کے لیے ان کے نام مرجاتے ہیں۔ وہ انکار میں سرہلاتے ہوئے بولی۔

"اس بچی کے دشمن مریں' اس کا باپ نہیں مرے گا۔ آپ کے زبانی مرجانے سے وہ خون تو نہیں مرے گا جو اس کی رگوں میں دوڑ رہا ہے۔"

"دیکھو بحث نہ کرو۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ کسی سے شادی کرلو۔ اس بچی کو ایک باپ کا نام مل جائے گا۔"

یہ کہہ کر انہوں نے شیروانی کی اندرونی جیب سے دو ہزار روپے نکال کر دیتے ہوئے کہا۔

"یہ دو ہزار روپے ہیں۔ اگلے ماہ سے پانچ سو ملا کریں گے۔" جب یہ سکول جانے لگے گی میں ہزار روپے ماہوار دیا کروں گا۔ جاؤ دفع ہو جاؤ۔"

انہوں نے بچی کی گود میں دو ہزار روپے رکھے پھر مزید کوئی بات سنے بغیر کوٹھی میں چلے گئے۔ اب ان کے چہرے پر پہلی جیسی رونق نہیں تھی۔ مہمانوں کے درمیان ان کا دل گھبرانے لگا تھا۔ ایسی بات نہیں تھی کہ باہر خیرات مانگنے والے خون کے لیے ان کا دل تڑپ رہا تھا۔ اپنا خون تو اس محفل میں بھی تھا۔ ریشم کی گھیردار فراک پہنے ہوئے وہ بالکل گڑیا جیسی لگ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی دل مچل گیا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر اسے گود میں لیا اور بے تحاشا چومنے لگے۔ اسے خون کی کشش کہتے ہیں۔ خون آپ ہی چومنے پر مجبور کردیتا ہے۔

جب مہمان رخصت ہوگئے تو وہ اپنی بیگم سے سردرد کا بہانہ کر کے بستر پر آگئے۔ خواب گاہ کی تمام روشنیاں بجھا دیں تاکہ بیگم آئیں تو اندھیرے میں ان کی پریشانیوں کو نہ پڑھ سکیں۔ پریشانی یہ تھی کی دو کوڑی کی عورت انہیں بلیک میل کرنے آئی تھی۔ ایسی عورتوں کا کیا اعتبار پتہ نہیں کہاں کہاں جا کر منہ کالا کرتی ہیں مگر سارا الزام کسی دولت مند کے سر لادیتی ہیں تاکہ ساری زندگی ان کی روزی روٹی چلتی رہے۔ ایک شریف آدمی ایسوں کے منہ نہیں لگ سکتا۔ انہوں نے ایک گہری سانس لے کر سوچا۔

خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے بے انتہا دولت دی ہے۔ اپنی عزت کی خاطر ہر ماہ دو چار ہزار روپے پھینک دینے سے میرے خزانے میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ اپنی غلطی پر

پردہ ڈالنے کے لیے ہر ماہ جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔ کوئی بات نہیں اب وہ مجھ سے دور رہے گی۔ کبھی اس طرف نہیں آئے گی۔ میں اپنے ایک رازدار ملازم کے ہاتھوں پابندی سے اس کے حصے کی رقم پہنچا دیا کروں گا۔ لعنت ہے اس پر۔"

وہ لعنت بھیج کر ذرا مطمئن ہوگئے۔ اسی وقت بیگم نے آکر سوئچ آن کردیا۔

"آپ اندھیرے میں کیوں پڑے ہیں۔ دیکھئے تو آپ کی بیٹی ابھی تک جاگ رہی ہے۔ اللہ جانے کتنوں کی نظر لگی ہوگی۔ سب ہی کی گود میں ہنستی کھیلتی رہی ہے۔ میں نے تو اسے نظر کا ٹیکہ لگا دیا ہے۔

وہ ممتا کے جوش میں بولتی جارہی تھیں وہ بیٹی کو گود میں لے کر جبرا ہنسنے بولنے لگے۔ اپنی گود میں پھول ہو تو دوسروں کی گود کا پھول کانٹا ہی نظر آتا ہے۔ پتہ نہیں وہ کانٹا چبھونے والی زرینہ کہاں سے آمری تھی۔ اتنی خوشیوں کے بیچ اس کی میلی سی گود میں میلی سی بچی چبھ رہی تھی۔

سات سال گزر گئے۔ بیگم نو سال کی افشاں کو لے کر اسکول میں داخلے کے لیے گئیں تو وہاں بڑے فخر سے اس کے باپ کا نام میرا میر خان لکھوایا۔ اس دنیا میں صرف نام چلتا ہے کام میں کچھ خرابی ہو تو وہ بڑے جتن سے چھپا دی جاتی ہے۔

کام میں کچھ خرابی ہوگئی تھی۔ اس لیے زرینہ نے اپنی بیٹی کا داخلہ کراتے وقت بڑی اداسی سے سر جھکا کر اسی میرا میر خان کا نام لکھوایا تھا لیکن نام کے آخر میں "مرحوم" کا اضافہ کردیا تھا۔ ایک ہی شخص کا نام ایک جگہ زندہ و تابندہ اور دوسری جگہ مردہ تھا۔ ایک جگہ وہ بیٹی کو چومتا تھا۔ اس کے مستقبل کی فکر کرتا تھا۔ دوسری طرف دور ہی سے خیرات کے طور پر پیسہ پھینک دیتا تھا۔ اس کے ہاں سات برس کے عرصے میں دو بیٹوں کا اضافہ ہوگیا تھا مگر دوسری طرف زرینہ ویران ہوگئی تھی۔

اس نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ عمر کے پہلے ہی جھونکے میں اس نے ایک مرد کے پیچھے ہزاروں مردوں کے چہرے دیکھ لیے تھے۔ عورت جب صبر کرنے پر آتی ہے تو تمام ارمانوں اور آرزوؤں کو کچل کر رکھ دیتی ہے۔ زرینہ کو سمجھنے کے لیے عورت کی سماجی زندگی کو سمجھنا ضروری ہے کہ کس لیے وہ مرد کے سائے میں زندگی گزارتی ہے۔ صرف اپنے تحفظ کے لیے وہ کسی مضبوط سہارے کی اس لیے وفادار رہتی ہے کہ اس کے سائے

ہیں، فکر معاش سے نجات ملتی ہے۔ مرد کی کمائی اسے روٹی کپڑا اور مکان دیتی ہے۔ یہ تینوں چیزیں اسے اپنی بیٹی آمنہ سے مل گئی تھیں۔ اور آمنہ کو اس کے مردہ باپ سے مل گئی تھیں۔ بالواسطہ یا بلاواسطہ زرینہ کو ایک مرد کی کمائی کا سہارا تھا۔ اس لیے اس نے کسی دوسرے مرد کا منہ نہیں دیکھا۔

میرا میر خان اس کے شادی نہ کرنے کے فیصلے پر جھنجلا رہے تھے۔ ان کے راز دار ملازم سے زرینہ کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ انہوں نے اپنے ملازم کو سمجھا دیا تھا کہ وہ ہمدردی کے جذبے سے مجبور ہو کر ایک غریب عورت اور اس کی بیٹی کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ ایک معمولی ملازم کے سامنے وہ یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ اپنی غلطی کی سزا بھگت رہے ہیں مگر وہ دل ہی دل میں جھنجلا کر کہتے تھے۔

"میں سب سمجھتا ہوں۔ وہ اس لیے شادی نہیں کرتی کہ ایک مرد کا سہارا مل جائے گا تو میری طرف سے پیسے نہیں ملیں گے۔ ہر ماہ ایک ہزار روپے کمانے والے مرد کا ملنا بہت مشکل ہے۔ عورت ہے تو کیا ہوا کاروبار کا ڈھنگ جانتی ہے۔ کچھ عرصے بعد اس کی بیٹی آمنہ جوان ہو جائے گی تو وہ اور زیادہ رقم مانگنے لگے گی۔ اس کی شادی بیاہ کے لیے اور اس کے جہیز کے لیے مجھ سے جتنی دولت کھنچ سکتی ہے کھینچتی رہے گی۔ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بیٹی کی شادی بھی نہ کرے اور مجھ سے ہر ماہ معقول رقم حاصل کرنے کے لیے اسے اپنے راستے پر چلاتی رہے۔"

وہ زرینہ کے خلاف جتنی باتیں سوچ سکتے تھے، سوچتے رہے۔ اپنے بارے میں ان کی رائے صرف یہی تھی کہ ان کو ایک بھول کی سزا ساری عمر نہیں ملنی چاہیے۔ انسان جوانی میں کیا نہیں کرتا۔ ان کے بزرگ بھی کوٹھوں پر جایا کرتے تھے مگر کوٹھوں پر جانے میں بھی ایک شان ہوتی۔ شہر میں دھوم مچ جاتی تھی کہ فلاں صاحب نے سب سے مہنگی طوائف کو سب سے مہنگے داموں خریدا ہے۔ یہ چرچا سن کر لوگ حیران ہوتے تھے مگر قدر دان بھی ہوتے تھے۔ ان پر کیچڑ اچھالنے کے بجائے ان کی حسن ذوق کو سمجھتے تھے۔ حسن نظر کی داد دیتے تھے کہ کیسے حسن کا انتخاب کیا ہے۔ مگر آج کل تو ڈوم چمار بھی کوٹھوں پر جانے لگے ہیں۔ اب وہ عزت نہیں رہی۔

عیاشی اس حد تک کرنی چاہیے کہ عزت پر حرف نہ آئے۔ انہوں نے زرینہ سے

پہلے کتنی ہی عورتوں اور لڑکیوں سے سمندر کے جھاگ والا عشق کیا تھا...... ملک کے کتنے ہی صوبوں، دیہاتوں اور شہروں تک ان کے خون کے چھینٹے بکھرے۔ بھلا ایسے میں خون کا حساب کہاں رکھا جا سکتا ہے۔ وہی ایک کم بخت زرینہ خون کا حساب لے کر آئی تھی مگر وہ تنہا خوب صورت سی عورت ان کا کیا بگاڑ سکتی تھی۔

اگر سرکاری طور پر ہر مرد کے ساتھ ایک ایسا میٹر لگا دیا جاتا کہ خون کے ایک ایک قطرے کا حساب ملتا رہے تو مردم شماری کے دوران یہ بات سامنے آجاتی کہ ایک ایک مرد کی کتنی اولادیں کتنی دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ خون کی اپنی کشش ہوتی۔ میٹر کے ذریعے صحیح پہچان ہو سکتی ہے کہ انسانوں کی بھیڑ میں ہم جن لاوارث بچوں کے قریب سے گزر گئے ہیں، دراصل وہ ہمارے ہی خون کے چھینٹے ہیں۔

ہمیں اپنے پیچھے بہنے والی غلاظت نظر نہیں آتی، سامنے کی صفائی اور پاکیزگی بھلا دیتی ہے۔ میرا میر خان اپنے سامنے اجلی اجلی نکھری سی افشاں کو دیکھ کر خوش ہوتے رہتے تھے۔ افشاں کے بعد جو دو بیٹے تھے، وہ بھی رفتہ رفتہ عمر کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ ایک باپ کے فرض کو سمجھتے ہوئے وہ اولاد کو سمجھاتے تھے۔

"میرے بچو! اگر انسان کی زندگی میں عزت نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔ آج کل دولت جو سب سے مہنگی چیز سب سے سستے داموں خریدتی ہے، وہ عزت ہے۔ لہٰذا دولت کو حاصل کرنے اور اسے بچا کر رکھنے کے طور طریقے سیکھو۔ دوسری بات یہ ہے کہ اپنی ماں اور بہنوں کو اپنی غیرت سمجھو، خاندان کی عزت، عظمت اور شہرت اسی طرح قائم رہتی ہے کہ پہلے ہم دولت کی حفاظت کریں اور اس دولت سے عزت کی دیوار اٹھاتے رہیں۔"

ایک ہی ملک میں اور ایک ہی شہر میں عزت کے متعلق مختلف نظریات ہوتے ہیں۔ دوسرے علاقے میں زرینہ بھی اپنی بیٹی آمنہ کو عزت کی اہمیت سمجھاتی تھی مگر اس کی نصیحتوں میں دولت کا ذکر نہیں آتا تھا۔ کھانے کے لیے اونچی حویلیوں میں چینی کے برتن اور جھگیوں میں تام چینی کے برتن استعمال ہوتے ہیں۔ تہذیب کے ایسے ہی برتن میں عزت کو اپنے طور پر لقمے کی طرح چبایا جاتا ہے۔'

جب اس نے آمنہ کو جنم دیا تھا تو اپنے محلے میں اس کی کوئی عزت نہیں رہی تھی۔ وہ

بدنام ہو کر دور ایک اجنبی محلے میں آ گئی تھی۔ وہاں یہ بات بن گئی تھی کہ آمنہ کا باپ مر چکا ہے۔ اس بے چارے کا نام میرا میر خان تھا۔ زرینہ محلے کی عورتوں سے کہا کرتی تھی کہ مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ اب آمنہ کے ایک چچا بحرین سے اس کے لیے پیسے بھیجا کرتے ہیں۔

یہاں عزت کو برقرار رکھنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیا جاتا تھا۔ کیوں کہ بدنامی کی کھیاں اڑانے کے لیے وہاں دولت کا سہارا نہیں تھا۔ آمنہ بھی جوان ہو کر یہی سمجھتی رہی کہ وہ بچپن میں ہی یتیم ہو گئی تھی۔ زرینہ اپنی بیٹی کو بھی یہ نہ بتا سکی کہ وہ جوانی میں کبھی ٹھوکر کھا چکی ہے اور اس انتظار میں اس نے شادی نہیں کی ہے کہ ٹھوکر مارنے والے کو کبھی تو اس کی محبت اور وفا کا یقین آئے گا مگر جو صاحب حیثیت ہوتے ہیں' وہ اپنی ہی حیثیت کی کسی عورت کی وفا کو سمجھتے ہیں۔ جو عورتیں کچرے کی طرح جھاڑ دے کر پھینک دی جاتی ہیں۔ ان کی طرف دیکھنے کی انہیں فرصت نہیں ملتی۔

مگر وہ باتیں ایسی تھیں جو اس کی امید بندھاتی رہتی تھیں۔ انسان تہذیب کی ابتدا سے یہ کہتا آیا ہے کہ اپنا لہو ضرور پکارے گا۔ یہ بات بھی سنتے سنتے کان پک گئے کہ وفا رنگ لاتی ہے۔ اب اس دنیا سے گزرنے والے جھوٹ بول کر تو نہیں گئے ہوں گے۔ موجودہ دور میں ان سچائیوں کو پرکھنے کے لیے زرینہ جی رہی تھی۔

○☆○

آمنہ اسکول سے نکل کر کالج میں داخلہ لینے والی تھی۔ اس نے داخلے کا فارم پُر کرنے کے بعد اپنی ماں سے کہا وہ اس کے ساتھ کالج تک چلے۔ مگر زرینہ پچھلی تمام رات بخار میں پھنکتی رہی تھی۔ اس لیے بیٹی کے ساتھ نہیں جا سکی۔ اسی وقت میرا میر خان کا ملازم پندرہ سو روپے لے کر آ گیا۔ جب سے آمنہ جوان ہوئی تھی پندرہ سو آنے لگے تھے۔ زرینہ نے اس سے پیسے لینے کے بعد کہا۔

"دینو بابا۔ تم آمنہ کو رکشا دلا دو۔ یہ کالج میں داخلے کے لیے جا رہی ہے۔"

کالج گلبرگ کے علاقے میں تھا۔ میرا میر خان کی کوٹھی بھی گلبرگ میں تھی۔ دینو بھی اس کے ساتھ رکشے میں بیٹھ گیا تاکہ کوٹھی تک بس میں نہ جانا پڑے۔ رکشے میں بیٹھی ہوئی آمنہ کالج کے فارم پر نظرثانی کر رہی تھی کہ کہیں کوئی غلطی نہ ہو گئی ہو۔ فارم

اردو میں پُر کیا گیا تھا۔ دینو اردو میں فلمی گانوں کی کتابیں پڑھ لیا کرتا تھا اس کی نظر فارم پر گئی تو وہاں پر اس نے آمنہ کے باپ کا نام میرا میر خان پڑھا اس کا شبہ یقین میں بدل گیا۔ وہ نادان تو نہیں تھا۔ بیس برس سے بلاناغہ میرا میر خان کے ہاتھوں سے پیسے لیتا تھا اور زرینہ کے ہاتھوں تک پہنچاتا تھا۔ کوئی دولت مند آدمی اتنی بڑی رقم یوں ہی نہیں دیتا۔ دال میں کچھ کالا تھا اور وہ کالا دھبا کالج کے فارم پر نظر آنے کے بعد سمجھ میں آ گیا تھا۔

کالج کے گیٹ پر جب رکشا پہنچا تو افشاں کار ڈرائیو کرتی ہوئی کالج کے احاطے میں داخل ہو چکی تھی۔ آمنہ رکشے کا کرایہ ادا کر کے جانے لگی۔ دینو چپ چاپ کھڑا ان دونوں لڑکیوں کو دیکھتا رہا۔ بہت سے رشتے اور چہرے پہچانے جا رہے تھے۔ جب وہ اپنے گھر میں پہنچا تو اس کا پیٹ پھول رہا تھا۔ اس کی بیوی نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"کہاں سے آ رہے ہو؟"

دینو نے اپنے پیٹ کو دباتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہ پوچھو' بڑے عجیب تماشے دیکھ کر آ رہا ہوں۔"

اس کی بیوی نے چڑ کر کہا۔

"تمہاری تو پرانی عادت ہے۔ راستے میں جہاں مداری کا تماشہ ہوتا ہے' دیکھنے کھڑے ہو جاتے ہو۔"

"اری یہ راستے کے مداریوں کا تماشا نہیں ہے۔ یہ دولت مند مداریوں کا تماشا ہے یہ جو ہمارے صاحب ہیں نا۔ نہیں کچھ نہیں' جانے دو۔"

"کیا جانے دوں۔ آدھی بات منہ میں' آدھی پیٹ میں رکھتا ہے۔ سچ سچ بتا کیا بات ہے؟"

عورت بھلا ادھوری بات سن کر چین سے بیٹھتی ہے۔ وہ سر ہو گئی۔ دینو نے کہا۔

"دیکھ میں اپنے صاحب کا نمک کھاتا ہوں۔ میں ان کا کوئی راز تجھے نہیں بتا سکتا۔ عورت کے پیٹ میں بات نہیں رہتی ہے۔"

"ارے تیرا میرا پیٹ کیا الگ ہے؟ چل جلدی سے بتا نہیں تو میرا مرا منہ دیکھے گا۔"

وہ بڑھاپے میں اپنی بیوی کا مرا منہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا' بڑے رازدارانہ انداز میں

کہنے لگا۔

"وہ جو زرینہ ہے نا' جس کے پاس میں ہر ماہ پیسے پہنچایا کرتا ہوں۔ دراصل وہ صاحب کی داشتہ ہے۔ آمنہ صاحب کی بیٹی ہے۔ یہ بات مجھے آج ہی معلوم ہوئی ہے۔"

"ارے میں تو پہلے ہی سمجھ گئی تھی پر عزت بھی کیا چیز ہے ہم صاحب کی عزت رکھیں گے تو ہماری عزت بھی رہے گی۔ اسی لیے میں منہ سے کچھ نہیں بولتی تھی۔"

"اب بھی کچھ نہ بولنا۔ بس یہ سمجھ لے کہ تو کچھ بھی نہیں جانتی ہے۔"

یہ کیسے ممکن ہے' جن کے سینے میں معلومات کا خزانہ ہوتا ہے۔ وہ اس خزانے کو مفت لٹاتے ہیں۔

دینو کی بیوی کو خیال آیا کہ اس کی ایک بہن جو زرینہ کے محلے میں رہتی ہے۔ اس کی خیریت کئی دنوں سے معلوم نہیں کی ہے۔ ایک گھنٹے بعد ہی وہ بہن کی خیریت پوچھنے چلی گئی۔

ایک گھنٹے بعد افشاں اپنی کوٹھی میں واپس آئی تو اس نے اپنے ڈیڈی کو بڑی گرما گرم خبریں سنائیں پہلی خبر تو یہ تھی کہ اس کالج میں بڑی مشکل سے داخلہ ملتا ہے۔ لڑکیاں بڑے اونچے اونچے لوگوں کی سفارشیں لے کر آئی تھیں لیکن جب افشاں نے بتایا کہ وہ میرا میر خان صنعت کار کی بیٹی ہے تو کالج کی پرنسپل اس سے مرعوب ہو گئی۔

میرا میر خان اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے فخریہ انداز میں مسکراتے ہوئے بیٹی کی باتیں سن رہے تھے۔ بیٹی نے چہک کر کہا۔

"ڈیڈی' ایک اور مزے کی بات ہے۔ ایک اور لڑکی بھی اپنے باپ کا نام میرا میر خان بتا رہی تھی۔"

میرا میر خان کے منہ پر ایک پتھر آ کر لگا مونچھوں کے سائے میں مسکراہٹ دب کر رہ گئی۔ بیٹی نے باپ کی بجھتی ہوئی مسکراہٹ کو محسوس نہیں کیا وہ روانی میں بولتی جا رہی تھی۔

"مگر اس کا باپ مر چکا ہے۔ اگر زندہ ہوتا تب بھی آپ کی طرح اتنا بڑا آدمی نہ ہوتا کہ لوگ نام سنتے ہی مرعوب ہو جاتے۔ کیوں ٹھیک ہے نا ڈیڈی؟"

"آں..... ہاں....." وہ بیٹی کے سوال سے الجھ گیا۔ "افشاں' تم ایسی لڑکیوں کو گفتگو

کا موضوع نہ بنایا کرو' جو ایک معیاری کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے قابل نہیں ہوتی ہیں۔ میں نے تمہیں اس کالج میں پڑھنے کا مشورہ اسی لیے دیا تھا کہ اس میں کم حیثیت والوں کی گنجائش نہیں رہتی۔ کند ہم جنس باہم جنس پرواز کبوتر با کبوتر' باز با باز۔ کبوتر کی حیثیت نہیں دیکھتے۔ اپنی حیثیت نہیں دیکھتے۔ اپنی حیثیت سے اونچا نام رکھ لیتے ہیں۔ اس کے باپ کو میرے ہی ڈیڈی کا نام ملا تھا۔ اونہہ......"

میرا میر خان کا نام دوسری بیٹی کے پاس پہنچ کر صرف "اونہہ" بن گیا تھا۔ افشاں نے اس انداز میں اونہہ کہا تھا جیسے ایک غریب بیٹی کے باپ کے نام پر تھوک رہی ہو۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ تھوک کہاں پہنچ رہا ہے۔ میرا میر خان نے چہرے کو رومال سے پونچھتے ہوئے کہا۔

"بیٹی کوئی دوسری بات کرو۔"

"دوسری بات کیا کروں۔ جب نچلے طبقے کے لوگ اونچے طبقے کی طرف آنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں تو بار بار ہم سے سامنا ہوتا ہے۔ جب میں کالج سے باہر آئی تو ایک نوجوان نے اپنی کار لا کر میری کار کے سامنے کھڑی کر دی۔ کیا بتاؤں ڈیڈی کہ کیسی کھٹیچر سی کار تھی۔ اس کے باپ دادا کے زمانے کا ماڈل ہوگا۔ میری ائر کنڈیشنڈ مرسیڈیز کے سامنے بالکل ٹوٹی پھوٹی جھگی کی طرح نظر آتی تھی۔ اس پر وہ ایسے اترا رہا تھا جیسے کوئی رئیس زادہ ہو۔ کالج کے احاطے میں بڑا ہیرو بنا پھر رہا تھا۔ میں نے اپنی کار میں بیٹھ کر ہارن دیا کہ وہ سامنے سے اپنی کار ہٹا لے مگر وہ دور کھڑا انجان بنا رہا پھر بڑا مزہ آیا۔"

بیٹی کی شوخیاں دیکھ کر باپ نے دلچسپی لی۔

"اچھا! کیسے مزا آیا' میں بھی تو سنوں۔"

"مجھے پھر غصہ آ گیا۔ میں نے سوچا کہ اسے اس کی حیثیت کا احساس دلانا چاہیے میں نے فوراً ہی کار اسٹارٹ کی اور اس کی کار سے ٹکرا دی۔ ہائے کیا بتاؤں ڈیڈی' میری کار کو تو بہت کم نقصان پہنچا۔ مگر اس کی گاڑی کا اگلا حصہ پچک گیا۔ وہ پرانی جھگی کی طرح اکھڑ کر دور چلی گئی۔ وہ دوڑتا ہوا میرے پاس آیا اور غصے میں کہنے لگا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟ تم نے میری گاڑی کو برباد کر دیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "وہ آباد کب تھی۔ ایک تو کھٹارہ چلاتے ہو۔ دوسرے پارکنگ کا

طریقہ بھی نہیں جانتے۔ میں کتنی دیر سے ہارن دے رہی ہوں مگر تم دور کھڑے سنتے رہے۔ اب کیوں بھاگے آئے ہو۔"

اسی نے میری کار کو مکہ مارتے ہوئے کہا "میں ہرجانہ وصول کرنے آیا ہوں۔"

میں نے اپنا پرس کھول کر سو سو کے دو نوٹ نکالے اور بھیک کی طرح اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ لو۔ اگر کار کی مرمت کے بعد پیسے بچ جائیں تو اپنی دوسری ضرورتیں پوری کر لینا اور کم پڑ جائیں تو اس پتے پر آجانا' میرے ڈیڈی آئے ہوئے سوالی کو مایوس نہیں کرتے۔ میں نے اسے اپنی کوٹھی کا پتہ بتایا پھر کار اسٹارٹ کر کے تیزی سے ڈرائیو کرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ وہ حیران سا میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔ کیوں ڈیڈی' اسے اپنی حیثیت کا پتہ چل گیا ہو گا نا؟"

"یو آر اے بریلینٹ بے بی! دوسروں کو خیرات دے کر ہی انہیں یہ سمجھایا جاتا ہے کہ خیرات ہمیشہ اوپر سے آتی ہے اور نیچے والوں کی طرف جاتی ہے اگر وہ سمجھدار ہو گا تو اب کبھی بلندی کی طرف سر اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔"

افشاں کی ممی اپنے کمرے سے نکل کر ان کی باتیں سن رہی تھیں۔ انہوں نے چڑ کر کہا۔

"آپ بیٹی کو یہ سمجھا رہے ہیں۔ یہ نہیں سمجھاتے کہ آج کل کے لڑکوں کے منہ نہ لگے۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے اگر وہ بدمعاشی پر اتر آتا تو......؟"

"تو میں اسے حوالات میں بھجوا دیتا۔ اسے کالج سے نکلوا دیتا۔ جب ہمارا سکہ کھوٹا نہیں تو پھر ہم دنیا والوں سے کیوں ڈریں؟"

افشاں کھرے سکے کی طرح چمکتی دمکتی اور وہاں سے اٹھ کر بل کھاتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس سکے میں ذرا سا کھوٹ پیدا ہو گیا۔ باپ کو جو کہانی سنائی تھی اس میں ذرا سی تبدیلی آگئی۔ وہ فوم کے بستر پر گرتے ہی اس نوجوان کے متعلق سوچنے لگی۔

"وہاٹ اے ڈیشنگ پرسنلٹی! وہ میرے ساتھ کتنا جچ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کالج میں میرے لیے ہی بھیجا گیا ہے۔ کسی بھونرے کی سی سیاہ بڑی بڑی روشن آنکھیں تھیں۔ وہ

نگاہیں کتنی دیر تک میرے حواس پر منڈلاتی رہی تھیں۔ چہرے پر مردانگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ پہلے تو میں نے ہارن دے کر اسے مخاطب کرنا چاہا مگر وہ دور کھڑا اس لڑکی سے باتیں کرتا رہا جس کا نام آمنہ تھا۔ جس کا باپ میرے ڈیڈی کا ہم نام تھا۔ ایسا خوبرو جوان کیسی دبلی پتلی لڑکی میں دلچسپی لے رہا تھا۔ خدا نے حسن دیا ہے مگر اچھا ذوق نہیں دیا۔ ڈیڈی کے سامنے میں یہ بات نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ مجھے نظرانداز کر رہا تھا۔ میں یہ انسلٹ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ جب اس نے توجہ نہیں دی تو مجبوراً مجھے اپنی گاڑی اس کی گاڑی سے ٹکرانا پڑی۔ میرا کیا بگڑا میں تو کل ہی نئی کار خرید لوں گی۔"

خریدنے کی بات آئی تو وہ کچھ مرجھا گئی۔ کیوں کہ وہ خرم کو نہیں خرید سکتی تھی۔ اس نوجوان کا نام خرم تھا۔ پھر بھی اس نے اپنے طور پر کوشش کی تھی۔ گاڑی کی مرمت کے بہانے اس نے اپنے پرس سے بڑے بڑے نوٹ نکال کر دیے تھے۔ اور اس پر اپنی امارت کا رعب جمایا تھا کہ مزید رقم کی ضرورت ہو تو وہ دوسرے دن کالج آکر اس سے لے سکتا ہے۔ اس نے بڑی بے نیازی سے کہا تھا۔

"میں تم سے بھیک نہیں لے رہا ہوں۔ تم نے میری گاڑی کو نقصان پہنچایا ہے۔ یہ نقصان تمہارے ہی پرس سے پورا ہو گا۔ اس لیے میں یہ روپے لئے جا رہا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ آمنہ کی طرف چلا گیا۔ مغرور کہیں کا۔ وہ غصے سے ہونٹ چبانے لگی۔ غصہ اس مغرور پر نہیں آرہا تھا۔ مرد ذرا مغرور ہو تو اچھا ہی لگتا ہے۔ غصہ تو اس لڑکی پر آرہا تھا جسے کالج میں داخلہ نہیں ملا تھا لیکن خرم کے دل میں داخلہ مل گیا تھا۔ کوئی اپنی حیثیت کی لڑکی بازی لے جانا چاہتی تو اس کے ساتھ سرمایہ داری کی جنگ میں مزہ آتا۔ خرم کے لیے بڑی بڑی بولیاں دی جاتیں اور بلاشبہ وہ جیت جاتی۔ مگر نجانے کیا دیکھ کر اس لڑکی کی طرف جھک رہا تھا۔ وہ خود کو تسلیاں دینے لگی کہ شاید اس سے معمولی جان پہچان ہو گی۔ آج تو پہلا دن تھا کل سے دیکھا جائے گا۔ اب تو آمنہ دوبارہ نہیں آئے گی۔ اس کی حیثیت ہی کیا ہے کہ اسے داخلہ ملے گا۔

اس نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ ہاں کل دیکھا جائے گا۔

دینو کی بیوی اپنی بہن سے ملنے گئی تھی وہاں پہنچ کر اپنے گھر کی باتیں کرتی رہی۔ اسے دوسروں کے ذکر سے کیا لینا تھا مگر باتوں ہی باتوں میں اس کی بہن نے زرینہ کا ذکر چھیڑ دیا

کہ وہ بڑی لگن سے اپنی بیٹی کو پڑھا رہی ہے۔ بیٹی سے ایسی محبت ہے کہ اس کی خاطر اس نے دوسری شادی نہیں کی۔

"یہ لو جسے بڑے بڑے دولت مند مل جائیں بھلا وہ شادی کر کے ایک ہی مرد سے کیوں چپکی رہے گی۔"

دینو کی بیوی کی زبان بے اختیار چل پڑی تھی۔ وہ زرینہ کی دشمن نہیں تھی مگر زبان کو کیا کہا جائے وہ خود بخود چل پڑتی ہے۔ اس کی بہن کا تجسس بڑھ گیا۔ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"اے آپا۔ کیا تم زرینہ کو الزام دے رہی ہو؟"

"نہیں، میں کسی کو الزام دینا نہیں چاہتی۔ بس ایسے ہی میرے منہ سے بات نکل گئی۔"

جب بات منہ سے نکل ہی گئی ہے تو اسے نہ چھپاؤ تمہیں میری قسم، نہیں بتاؤں گی تو میرا مرا منہ دیکھو گی۔"

وہ اپنی بہن کا مرا منہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اس لیے مجبوراً سب کچھ بتانا پڑا۔ بعد میں یہ قسم دلا دی کہ ان کے صاحب میرا میر خان کا نام زبان پر نہ آئے چھوٹے لوگوں کی کیا عزت ہوتی ہے۔ بڑے صاحب کی عزت جائے گی تو ہم بھی روزی روٹی سے جائیں گے۔

دینو کی بیوی قسمیں دے کر چلی گئی مگر اس کی بہن کے پیٹ سے بھوک اڑ گئی۔ جب تک پیٹ سے وہ بات نہ نکلتی اس وقت تک وہاں روٹی نہیں سما سکتی تھی مگر اس نے اپنی آپا کے سامنے قسم کھالی تھی کہ کسی کے سامنے کچھ نہیں کہے گی۔ لہٰذا وہ چولھے کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اور پیٹ ہلکا کرنے کے لیے دیوار کے سامنے بڑبڑانے لگی۔ بڑبڑانے کے بعد ادھر کا پیٹ ہلکا ہو گیا۔ لیکن دیوار کے دوسری طرف پڑوسن کے پیٹ میں کھد بد ہونے لگی۔ شاید ایسے ہی وقت کے لیے کہا جاتا ہے کہ دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں۔

بیس برس سے جو بات چھپی ہوئی تھی اسے اچانک ہی پر لگ گئے۔ وہ آہستہ آہستہ ایک گھر سے دوسرے گھر اڑتی چلی گئی۔ سب نے ایک دوسرے سے یہی کہا کہ وہ دوسرے سے کچھ نہ کہیں اور وعدوں اور قسموں کے مطابق سب ہی نے کسی سے کچھ

نہیں کہا۔ غبارے کے کسی بھی حصے میں ایک ننھا سا سوراخ ہو جائے تو ہوا خود بخود نکلتی چلی جاتی ہے۔

شام کو آمنہ اپنے محلے میں واپس آئی تو بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ محلے کی گلیوں سے گزرتے وقت اس کی خوشیاں ماند پڑ گئیں۔ وہاں کے لوگ کچھ بدلے بدلے سے نظر آ رہے تھے۔ ایک بچے نے اسے دیکھ کر کہا۔

"باجی سلام"

اس کی ماں نے بچے کو دروازے کے اندر گھسیٹتے ہوئے کہا۔

"چل بڑا آیا باجی کا بچہ۔ ایسوں کو سلام نہیں کیا جاتا۔"

اس سے پہلے کہ آمنہ کچھ سمجھتی۔ اس گھر کا دروازہ ایک جھٹکے سے بند ہو گیا۔ بالکل طمانچہ مارنے کے انداز میں دروازہ بند ہو گیا تھا۔ آمنہ کو اس عورت کی حرکت بہت بری لگی۔ وہ کچھ پوچھنے کے بجائے آگے بڑھ گئی۔ دور جا کر ایک مکان کے سامنے وہ ٹھٹک گئی۔ وہاں ایک عورت اپنے شوہر سے کہہ رہی تھی۔

"جانو کے ابا ذرا خرم کے پاس جا کر یہ خط پڑھوا لو۔"

آمنہ نے آگے بڑھ کر کہا۔

"ماسی، تمہارے بیٹے کے پاس سے آنے والا خط تو میں پڑھا کرتی ہوں۔ لاؤ میں پڑھ کر سنا دیتی ہوں۔"

ماسی نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

"تم دور ہی رہو۔ میرے گھر میں ایک جوان بیٹی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ تمہارا سایہ اس پر پڑے۔"

"ماسی، یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟"

وہ چند لمحوں تک حیران اور پریشان سی ماسی کو تکتی رہی۔ تمام محلے کے مرد عورتیں اور بچے ہمیشہ اس کی عزت کرتے تھے۔ زندگی میں پہلی بار کوئی حقارت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ یہ بے عزتی برداشت نہ کر سکی وہاں سے پلٹ کر تیزی سے چلتی ہوئی اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ گئی۔ گھر میں اندھیرا تھا۔ اس نے سرِشام کبھی اپنے گھر میں اندھیرا نہیں دیکھا تھا۔ مغرب کی اذان کے ساتھ ہی بتی جلا دی جاتی تھی۔ اس نے گھبرا کر ماں کو آواز

دی۔ دوسرے کمرے سے اس کی مردہ سی آواز سنائی دی۔

"میں یہاں ہوں' آجاؤ۔"

اس نے اندھیرے میں سوئچ بورڈ ٹٹولتے ہوئے ایک سوئچ آن کیا پھر دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد وہ دوسرے کمرے میں ماں کے پاس آئی۔

"بیٹی روشنی نہ کرنا میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔"

"امی محلے والوں کو کیا ہو گیا ہے کوئی سیدھے منہ بات نہیں کر رہا ہے۔ ماسی نے مجھے ایسی بات کہی ہے جو گالی کے برابر ہے۔"

نیم تاریکی میں زرینہ کی کمزور سی آواز سنائی دی۔

"ہاں بیٹی' جس گالی کو میں برسوں سے چھپائے ہوئے تھی پتہ نہیں وہ کس کے منہ سے نکل کر محلے والوں کی زبان تک پھیل گئی ہے۔"

آمنہ اس کے قریب آکر بستر پر بیٹھ گئی۔

"امی آپ اس طرح الجھی ہوئی باتیں نہ کریں میں بری طرح الجھ رہی ہوں۔ آپ مجھے صاف صاف بتائیں کیا بات ہے؟"

چند لمحوں تک ماں بیٹی کے درمیان زہر آلود خاموشی چھائی رہی۔ نیم تاریکی میں وہ یوں مٹی مٹی سی نظر آرہی تھی۔ جیسے حالات اب انہیں مٹانے پل تل گئے ہوں۔ پھر زرینہ ندامت سے ہچکچاتے ہوئے اس کے سامنے اپنے ماضی کے ورق الٹنے لگی۔ آمنہ سن رہی تھی اور سمجھ رہی تھی کہ اس کا باپ جو مردہ تھا' اب زندہ ہو گیا ہے۔ ان سے دور وہ زندہ رہ کر عزت کی زندگی گزار رہا ہے۔ اور اس کی وہی عزت یہاں مٹی میں مل گئی ہے۔ مگر میرا میر خان پر اس کا اثر نہیں ہو سکتا اس لیے کہ اس محلے کے غریب لوگ صرف اپنے ہی جیسے غریب لوگوں کی بے عزتی کرنا جانتے تھے۔ اسی لیے رسوائیاں اور بدنامیاں صرف چھوٹے لوگوں میں سنائی دیتی ہیں۔ بدنامی کے پر اتنے کمزور ہوتے ہیں کہ وہ کسی میرا میر خان کی بلندی تک پرواز نہیں کر سکتے۔ زرینہ نے تھکے ہوئے انداز میں ایک گہری سانس لی پھر بیٹی سے کہا۔

"تجھے جنم دینے کے بعد اسی لیے میں نے دوسری شادی نہیں کی۔ کسی مرد کو اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیا۔ دنیا والے میری شرافت کو سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ مگر بیٹی جوان ہو گی

تو میری پچھلی تمام زندگی کو پڑھ کر یہ سمجھ لے گی کہ اس کی ماں کوئی ویشیا عورت نہیں تھی۔ میرا میر خان کے بعد جذبات میں اندھی ہو کر میں نے کسی کو موقع نہیں دیا کہ وہ مجھے بدنام کر سکے۔ میں اس محلے سے کبھی باہر نہیں گئی۔ اس گھر میں دینو بابا کے سوا کسی مرد نے قدم نہیں رکھا۔ اسی طرح میں نے خود کو سزا بھی دی اور اپنی وفا کو بھی آزمایا کہ شاید تیرا باپ میری مستقل مزاجی دیکھ کر کبھی پگھل جائے۔ مگر اونچی نسل کا موم اونچی عورتوں کی حرارت سے پگھلتا ہے۔ میں تیرے لیے تیرے باپ کو واپس نہ لا سکی۔ میں ہار گئی ہوں میری بچی......"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی...... اس سے لپٹ گئی۔ پھر وہ بھی روتے ہوئے کہنے لگی۔

"آپ روتی کیوں ہیں امی۔ آنسو پونچھ لیجئے۔ آپ کے ہوتے ہوئے میں ایک باپ کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کروں گی۔ میرے ابو بہت خراب ہیں نا؟"

یہ کہتے ہی وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ لڑکیاں باپ پر جان دیتی ہیں۔ پھر ایسا باپ جو دوبارہ جی اٹھا ہو۔ اس کے لیے اس کا دل کیسے مچل رہا ہو گا۔ جذبات زبان پر نہیں آئے تو اس کی آنکھ سے آنسو بن کر بہہ نکلے۔ دونوں ماں بیٹی دیر تک روتی رہیں۔ دیر تک ایک دوسرے کے آنسو پونچھنے کے لیے اتنی بڑی دنیا میں کوئی تیسرا تھا' مگر نہیں تھا۔

رونے کے دوران آمنہ کا ذہن دور دور تک بھٹک رہا تھا۔ ان کا ذہن افشاں کی طرف بھی گیا۔ وہ اچانک ہی ماں کے سینے سے الگ ہو کر بولی۔

"امی۔ آج ہمارے کالج میں ایک رئیس زادی بہت بڑی کار میں بیٹھ کر آئی تھی۔ اتفاق سے اس کے باپ کا نام بھی میرا میر خان تھا۔"

زرینہ کی آنکھیں تر تھیں مگر حلق خشک تھا۔ اس نے اٹکتے اٹکتے پوچھا۔

"کیا اس کا نام افشاں ہے؟"

"آں۔" آمنہ نے چونک کر پوچھا۔ "کیا آپ اس لڑکی کو جانتی ہیں۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ اس لڑکی کا نام افشاں ہے؟"

"مجھے معلوم ہے۔ وہ تیری سوتیلی بہن ہے۔ تیرے باپ کی عزت دار بیٹی ہے۔"

یہ سنتے ہی آمنہ رونے لگی۔ زرینہ نے پوچھا۔

"اب کیوں رو رہی ہے؟"

"امی اس لڑکی نے ابو کا نام لیا تو اسے فوراً داخلہ مل گیا۔ یہ کیسی دنیا ہے امی۔ اس نام سے مجھے داخلہ نہیں ملا۔"

"بس یہ ایسی ہی دنیا ہے بیٹی۔ یہاں لوگوں کو جب بھی موقع ملتا ہے۔ اپنی شہرت کو' اپنی عزت کو اور اپنے نام کو شرافت کے ترازو میں تولتے وقت وہ ڈنڈی مار دیتے ہیں۔ جب تیری بات آئی ہے تو' تول کے اس شریفانہ نظام میں ڈنڈی مار دی گئی۔ اب تو یہ زندگی بھر کا رونا ہے۔ تو اپنی بات کر کیا تجھے داخلہ نہیں ملا؟"

"ہاں امی۔ وہاں بڑی بڑی لڑکیاں بڑے بڑے لوگوں کی سفارشیں لے کر آئی تھیں میں مایوس ہو کر واپس آنے لگی تو خرم نے مجھے روک کر داخلے کے متعلق پوچھا۔"

"کون خرم؟"

"وہی جو ہمارے محلے میں رہتا ہے۔ ہماری گلی کے آخری سرے پر موٹروں کی مرمت کا جو چھوٹا سا کارخانہ ہے' وہ کارخانہ بھی چلاتا ہے اور وہاں تھرڈ ائیر میں پڑھتا بھی ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اسٹوڈنٹ یونین کا صدر بھی ہے۔ اپنی یونین کے سہارے وہ میری سفارش کرے گا اور مجھے داخلہ دلائے گا۔ اس نے میرے تمام کاغذات لے لیے ہیں....."

"خرم بہت اچھا لڑکا ہے۔ مگر ایک نوجوان لڑکے سے تجھے نہیں ملنا چاہیے۔"

"وہاں تو لڑکے لڑکیاں ایک ساتھ پڑھتے ہیں۔ میں اس سے نہیں ملوں گی۔ تب بھی وہ ملتا رہے گا۔ کالج میں اس کی بہت شہرت ہے امی۔ پروفیسر اور پرنسپل وغیرہ سبھی اس کی عزت کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے ذریعے مجھے داخلہ مل جائے گا۔"

زرینہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"یہ..... یہ جو نوجوان ہوتے ہیں یہ اسی طرح کام آکر دوستی بڑھاتے ہیں۔ ایک بار میری ماں ہسپتال میں سخت بیمار تھی اسے دو بوتل خون کی ضرورت تھی۔ میرے پاس پیسے نہیں تھے۔ تیرے باپ نے پہلی بار میری مدد کی اور مجھے متاثر کیا۔ پھر وہ کیسی میٹھی میٹھی باتیں کرتے رہے۔ یہ میں نہیں بتا سکتی صرف ایک سوال کرتی ہوں۔ تو میری غلطی کو نہیں دہرائے گی نا؟"

"نہیں امی کبھی نہیں....."

اس نے جھک کر ماں کے سینے پر سر رکھ دیا۔ دوسرے لفظوں میں اپنے چہرے کی بدلتی ہوئی رنگت کو ماں سے چھپا لیا۔ خرم نے تو پہلی ہی ملاقات میں دل جیت لیا تھا۔ زبان سے انکار کرنے کے بعد دل سے کیسے انکار کر سکتی تھی کہ وہ اس نوجوان سے متاثر نہیں ہوئی۔

آمنہ کو اس کالج میں داخلہ مل گیا۔ اس کے لیے وہ خرم کی احسان مند تھی۔ وہ تھرڈ ائیر کا طالب علم تھا۔ یہ فرسٹ ائیر میں افشاں کے ساتھ کلاس میں بیٹھتی تھی اور افشاں کو روز روز نئے ہیئر اسٹائل اور نئے لباس میں دیکھتی تھی۔ خرم سے پہلے ٹکراؤ میں اس کی مرسیڈیز کار کا اگلا حصہ ذرا سا خراب ہو گیا تھا۔ جس کی با آسانی مرمت کی جا سکتی تھی لیکن اس کار کو ریجیکٹ کر دیا تھا۔ اس کی جگہ ایک نئی کیڈیلاک خرید لی تھی۔

آمنہ کو کالج جانے کے لیے اکثر بس میں بھی جگہ نہیں ملتی تھی۔ محلے کے باہر ایک بس اسٹاپ پر خرم اپنی کھٹارہ لیے کھڑا رہتا تھا۔ پہلی مرتبہ آمنہ کو بس اسٹاپ پر تنہا دیکھ کر اس نے قریب آکر کہا۔

"میری گاڑی ٹھیک ہو گئی ہے حالانکہ افشاں نے زبردست ٹکر ماری تھی۔ یہ مغرور لڑکیاں سمجھتی ہیں کہ ان کی بڑی بڑی کاروں کی زد میں آکر ہم اپاہج بن جائیں گے۔ مگر دیکھ لو یہ زیادہ تیز دوڑ تو نہیں سکتی مگر ہمیں کالج تک پہنچا سکتی ہے۔ آؤ میرے ساتھ چلو۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

"آپ میرے محسن ہیں۔ میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دینا چاہتی مگر مجھے ڈر لگتا ہے کہ لوگ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔"

جو لوگوں سے ڈر کر زندہ رہتے ہیں وہ اسی طرح غریب محلوں میں زندگی گزارتے ہیں۔ مجھے دیکھو کس طرح حالات سے جنگ کر رہا ہوں۔ موٹروں کی مرمت کا ایک کارخانہ کھول رکھا ہے' کالج میں بھی پڑھتا ہوں۔ اسی طرح محنت کرتے کرتے ایک ایسی خوش گوار زندگی بنانا چاہتا ہوں جس میں انسان کی تھوڑی تھوڑی سی ہر خوشی آتی جاتی رہے اور ہماری چھوٹی چھوٹی سی آرزوؤں کی تکمیل کرتی رہے۔ جب تک ہم اپنے حالات

سے جنگ نہیں کریں گے ہمیں کچھ نہیں ملے گا۔ تم میرے ساتھ چلو۔ میں تم سے ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

آمنہ کا دل چپکے چپکے دھڑکنے لگا۔ وہ دل دھڑکنوں کی زبان میں اس پوچھنے لگا۔ کیا تو ایسی ہے کہ کوئی تجھ سے ضروری باتیں کرنے کے لیے ایسا موقع تلاش کرے؟ ایک مرد کی زبان سے ایسی باتیں سن کر کسی قدر اپنی اہمیت کا احساس ہوجاتا ہے کل سے محلے والے اس کی اہمیت گرا رہے تھے۔ اب تھوڑی اہمیت کہیں سے مل رہی تھی تو وہ کیسے انکار کر سکتی تھی۔ اپنی قدر آپ سمجھنے کے لیے وہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

خرم نے گاڑی اسٹارٹ کی تو وہ گاڑی پہلے بھیانک انداز میں چیختی ہوئی آگے پیچھے ڈگمگائی۔ آمنہ کی طرح آگے بڑھنے سے ہچکچاتی رہی۔ پھر دائیں بائیں ڈولتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ خرم نے کہا۔

"یہ گاڑی ہماری اور تمہاری زندگی کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ اپنے بڑوں سے ٹکرا کر پچک جاتی ہے۔ بڑے بڑے لوگ ہماری خوب صورتی برداشت نہیں کر سکتے۔ اسی لیے ایک ہی ٹکر میں بد صورت بنا دیتے ہیں۔ پھر اس بد صورتی کو چھپانے کے لیے اپنے پرس سے روپے نکال کر دیتے ہیں۔ کل سے محلے میں یہ بات پھیل گئی ہے کہ تمہیں بھی چھپانے کے لیے کوئی ہر ماہ پیسے دیا کرتا ہے۔ یہ جو میری کھٹارہ ہے نا یہ ہماری ندگی کی عکاس ہے۔

کوئی آمنہ کے دل کو مٹھی میں لے کر مسلنے لگا۔ اس کی آرزو تھی کہ اس کی زندگی کی کڑوی حقیقت خرم تک نہ پہنچے۔ ساری دنیا میں وہی تو ایک اچھا لگا تھا۔ اس کی ایک نظر میں تو وہ اچھی بن کر رہتی۔ پتہ نہیں وہ اس کی زندگی کے موڑ پر کیسے پہنچ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

دیکھو آمنہ میں نے تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھنے کے لیے یہ بات نہیں چھیڑی تھی۔ میں تو تمہیں یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ حالات کا مقابلہ کرو۔ بدنامی سے ڈر جاؤ گی تو سر اٹھا کر جینے کے انداز بھول جاؤ گی۔ کل رات میں نے تمہاری خاطر محلے کے کتنے لوگوں سے جھگڑا کیا ہے۔"

وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ کیا کوئی ایسا بھی ہے کہ اس کی خاطر دنیا والوں سے لڑ

سکے۔ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آنکھوں کے سامنے وہ یقین اور بے یقینی کے درمیان منڈلایا ہوا سا نظر آرہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"محلے کے لوگ تمہیں اور تمہاری ماں کو وہاں سے نکالنے کی بات کر رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ پہلے وہ اس آدمی کو اس دنیا سے نکالیں جس نے آمنہ اور اس کی ماں کو بدنام ہونے کے لیے یہاں چھوڑ دیا ہے۔ مگر تم سب کے ہاتھ اس کے گریبان تک نہیں پہنچ سکتے۔ تم اس کا محاسبہ کرنے کے لیے اوپر چڑھو گے تو ہانپ جاؤ گے۔ جب ہم ایک کھلونا توڑنے والے کو الزام نہیں دے سکتے تو کھلونے پر الزام رکھتے ہیں کہ وہ ہی کمزور ہے۔ اس دولت مند کو مجرم کہنے کے لیے ایک غریب عورت کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ جو ٹوٹ پھوٹ کر یہاں آئی ہے۔ اسے اور زیادہ توڑنا کہاں کا انصاف ہے۔"

آمنہ سر جھکائے سن رہی تھی۔ اس کی باتوں سے دل کھنچا جا رہا تھا۔ کیا اس دنیا میں انسانی حقوق کا تحفظ کرنے والے انسان بستے ہیں۔ ہاں ضرور خرم ایسا انسان نظر آرہا تھا۔ اونچا پورا سا قد فولادی بازو آہنی ڈھال کی طرح مضبوط سینہ۔ وہ آمنہ کو پیچھے رکھ کر بدنامی کے سارے تیر اپنے سینے پر کھا سکتا تھا۔

"آمنہ باتوں سے سمجھاؤ تو یہ دنیا نہیں سمجھتی کتنے ہی خوب صورت فقرے تراشتے رہو یہ غبی دماغ والے پڑھ کر یا سن کر بھول جاتے ہیں۔ یہ ہمارے جیسے لوگ اپنے دکھوں کو بھلانے کے لیے کسی دوسرے کے دکھوں پر کیچڑ اچھالتے ہیں اور ایسی ہی تفریحات میں اپنی زندگی گزار دیتے ہیں۔ میں نے انہیں سمجھایا تو وہ مجھ سے الجھ پڑے۔ جب دو نوجوان میرے ہاتھوں بری طرح پٹ گئے تو میری بات اس طرح سمجھ میں آگئی جیسے استاد کے سامنے بچے مار کھا کر زندگی کا ابتدائی سبق سمجھ لیتے ہیں اور پڑھ لیتے ہیں۔ گھر کی سیاست ہو یا باہر کی سیاست' ہر جگہ ہمارے لوگوں کو جوتے کھا کر سمجھنے کی عادت ہوگئی ہے۔ جب وہ لوگ ذرا ٹھنڈے پڑ گئے تو میں نے ان سے ایک بات کہی۔"

آمنہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ جب کوئی اپنے ہی دل کی اور اپنے تحفظ کی باتیں کرے تو ساری توجہ اور دلچسپیاں کہنے والے کے طرف سمٹ آتی ہیں۔

"میں نے محلے والوں سے کہا کہ جب میں اس محلے میں آیا تو اس وقت پانچ برس کا تھا۔ اس گیراج کے ایک بوڑھے نے پناہ دی۔ اس وقت سے آج تک کسی نے مجھ سے یہ

نہیں پوچھا کہ میرے ماں باپ کون تھے۔ میرا کوئی باپ تھا یا نہیں؟ اب تو میں چھ فٹ کا جوان ہوں۔ کس کے منہ میں اتنے دانت ہیں کہ وہ میرے باپ کے بارے میں سوال کرے۔ اگر کوئی سوال کرے گا تو میں اس کی گردن ناپ کر کہوں گا کہ جاؤ تم ہی اپنے باپوں کو تلاش کرو۔ جو ہمارے پیدا ہونے سے پہلے ہی اخلاقی موت مرجاتے ہیں۔"

آمنہ پہلی بار اسے بڑی اپنائیت سے دیکھنے لگی۔ خرم کی باتیں اس کے اپنے مزاج اور اپنے حالات کے مطابق تھیں۔ اس لیے وہ اپنی ہی دنیا کا کوئی لگ رہا تھا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"کیا آپ...... آپ واقعی اپنے والدین کو نہیں جانتے؟"

"بالکل نہیں۔ میں کس خاندان سے تعلق رکھتا ہوں؟ میری پیدائش کے ذمہ دار کون لوگ ہیں؟ میں ان شریف مجرموں کو نہیں جانتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مجرم نہ ہوں۔ میرے بچپن میں میرے والدین مرگئے ہوں گے۔ میرے رشتے داروں نے لاوارث سمجھ کر مجھے نکال دیا ہو۔ میں اپنے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ ایک کہاوت ہے کہ جس کا باپ زندہ ہو لوگ اسے حرامی نہیں کہتے' اور آمنہ تمہارا باپ زندہ ہے۔ انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ کوئی تمہیں ناجائز اولاد نہ کہے اگر یہ دنیا ایسا کہتی ہے تو سب سے پہلے تمہارے باپ کا محاسبہ کرنا چاہیے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم احساس کمتری میں مبتلا نہ رہو۔ خود کو تنہا نہ سمجھو میں تمہارے لیے آخری سانس تک لڑوں گا۔"

آمنہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ آنسو بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ بہت زیادہ خوشی ملے تب بھی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ ایسے وقت جب کہ اس کے چاروں طرف اندھیرا پھیل گیا تھا اور اس اندھیرے میں بدنامی کے جگنو اڑ رہے تھے تو وہ ایک روشنی کی کرن بن کر سامنے آگیا تھا۔ بے اختیار اس کے جی میں آیا کہ وہ اس کرن کے اجلے اجلے قدموں پر اپنا سر رکھ دے مگر سجدہ شکر صرف خدا کے لیے ہوتا ہے۔ انسان کو شکریہ کے طور پر ایک دوسرے کو گلے لگنا چاہیۓ۔ گلے لگنے کے تصور سے ہی اس نے شرما کر سر کو جھکا لیا۔

جب وہ کلاس میں پہنچی تو اسے افشاں کے پیچھے بیٹھنے کو جگہ ملی۔ سب ہی لڑکیوں نے اپنی اپنی نشستیں مخصوص کرلی تھیں۔ وہ دیر سے آئی تھی۔ اس دنیا میں بھی افشاں کے

[illegible] آئی تھی اس لیے پیچھے رہ جاتی تھی۔ جب وہ لیکچر سننے کے دوران پرفیسر کی جانب دیکھتی [illegible]سے افشاں کی پشت نظر آتی۔ افشاں کا دل پڑھنے میں نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اپنے پاس [illegible]کی سے باتیں کرتی جا رہی تھی۔ ایک بار اس نے اپنے گلے سے سونے کی زنجیر اتار کر پھر اس کا لاکٹ کھول کر اپنی سہیلی کو دکھایا۔ اس لاکٹ میں ایک چھوٹی سی تصویر تھی۔

"یہ میرے ڈیڈی ہیں۔"

آمنہ نے افشاں کی یہ بات واضح طور سے سنی۔ باپ کا ذکر آیا تو اس کا دل بے اختیار مچل گیا۔ وہ اپنے باپ کی صورت دیکھنے کے لیے اپنی میز پر آگے کی طرف جھک گئی۔ اس لاکٹ میں ایک بہت ہی پروقار شخص نظر آیا۔ اس کے چہرے پر شرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ایسا شریف اور عزت دار شخص ایک بیٹی کا باپ بننے کے بعد اسے نہیں بھول سکتا تھا۔ اگر کسی مجبوری کی وجہ سے بھول گیا تھا تو وہ اس کی گود میں سر رکھ کر اسے بھولا ہوا رشتہ یاد دلا سکتی تھی۔

لاکٹ بند ہوگیا تو باپ کے لئے جذبات کا بہاؤ بھی رک گیا۔ اسے تلخیاں یاد آئیں [illegible]بھی اس کی امی اسے گود میں لے کر اس کے باپ کے دروازے پر گئی تھیں۔ اگر اس [illegible]یں پدرانہ شفقت ہوتی تو وہ اسی وقت اسے گود میں لے لیتا۔ بیس برس کی مدت میں کبھی ایک بار تو ضرور آکر دیکھتا۔ مگر اس شخص نے اپنی اونچی سوسائٹی کے اجلے خالص دودھ سے مکھی کی طرح اسے نکال کر پھینک دیا تھا۔

وہ اپنی جگہ جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ باپ بے حس اور بے رحم ہے اس کے دل میں ایک عجیب سی بے چینی پیدا ہوگئی تھی۔ ان باؤلی لڑکیوں کو کوئی رشتہ اپنی محبت دے یا نہ دے مگر یہ اپنے رشتے کی محبت لٹانے کے لیے دیوانی ہو جاتی ہیں۔ دل کہہ رہا تھا کہ باپ نہیں ملتا ہے تو اس کی تصویر ہی مل جائے تو اپنی ماں سے بھی [illegible] تصویر کو چھپا کر رکھے گی مگر یہ سب خیال ہی خیال تھا۔ بھلا اتنے بڑے آدمی کی تصویر [illegible] کہاں سے مل سکتی تھی۔

کلاس ختم ہونے کے بعد وہ باہر آئی تو باپ کی تصویر اس کے دماغ میں جھانک رہی تھی۔ اس نے افشاں کو اپنے سامنے سے گزرتے وقت دیکھا۔ چلتے وقت افشاں کے سینے

پر وہ لاکٹ یا باپ کی وہ تصویر اپنی بیٹی کے دل کی دھڑکنوں کو سن رہی تھی۔ آمنہ نے اپنے خالی سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ ایک تصویر کے بغیر اسے اپنے دل کی دھڑکنیں خالی خالی سی لگ رہی تھیں۔ افشاں اس کے جذبات سے بے خبر کالج کے برآمدے میں ٹہلتی ہوئی اس طرف آگئی جہاں خرم کھڑا ہوا تھا۔

"ہیلو خرم! تمہاری گاڑی ٹھیک ہو گئی؟"

"جی ہاں۔ آپ کے پیسوں سے اور میری محنت سے وہ پھر رینگنے کے قابل ہو گئی ہے۔"

"تم گاڑی بدل کیوں نہیں لیتے؟ میری گاڑی پر ہلکی سی خراش بھی آجائے تو میں اسے بدل دیتی ہوں۔ وہ دیکھو میں نے نئی کیڈیلاک خریدی ہے۔"

خرم نے دور کھڑی ہوئی کیڈیلاک کو دیکھا۔ پھر افشاں کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہارے ڈیڈی بہت دولت مند ہیں۔ وہ بھی ہلکی سی خراش پسند نہیں کرتے ہوں گے۔"

بالکل پسند نہیں کرتے۔ ہم باپ بیٹی کا نیچر ایک ہے۔ گھر کی کسی چیز میں ذرا سا نقص پیدا ہو جائے تو اسے بدل دیتے ہیں۔"

خرم نے اپنے فقرے کو نہایت اطمینان سے چباتے ہوئے کہا۔

"مس افشاں۔ اس دنیا کی بھیڑ میں تمہیں بھی نہ جانے کتنی جگہ ٹکر لگے گی۔ اگر تم پر خراش پڑ جائے تو کیا تمہارے ڈیڈی تمہاری جگہ دوسری بیٹی لے آئیں گے؟"

"وہاٹ نان سنس۔ کیسی بے تکی باتیں کر رہے ہو۔"

"میری باتیں تمہیں بے تکی نظر آتی ہیں اور تمہاری باتیں مجھے مضحکہ خیز لگتی ہیں۔ جہاں غریبی اور امیری کا تضاد ہوتا ہے وہاں ایک دوسرے کی باتیں سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔ تم یہ بات گرہ میں باندھ لو تم اپنی دولت اور غرور سے مجھے متاثر نہیں کر سکتیں۔"

وہ بڑی بے رخی سے جانے لگا۔ افشاں اس کے پیچھے چلتے ہوئے کہنے لگی۔

"ذرا ٹھہرو۔ تم تو ناراض ہو گئے۔ اگر میں مغرور ہوں، اگر مجھ میں کوئی خامی ہے تو تمہیں پیار سے سمجھانا چاہیے۔"

"پیار؟" وہ چلتے چلتے رک گیا۔ پلٹ کر اس کے چہرے کو گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔ جہاں تک اس کے حسن کا تعلق تھا۔ وہ پیار کے قابل تھی مگر وہ تو آمنہ کے باطنی حسن کو پسند کرنے لگا تھا۔ اس نے سرہلا کر کہا۔

"ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔ سنا ہے پیار سے پتھر بھی پگھل جاتے ہیں۔ اگر تم پیار کی زبان کو سمجھو گی تو میں اسی زبان میں تمہیں سمجھاؤں گا۔"

"پرامس!" خرم نے اس سے ہاتھ ملا کر وعدہ کر لیا۔

"اگلے سنڈے کو میں نے پکنک کا پروگرام بنایا ہے۔ پیار کے ناطے تم مجھے کمپنی دو گے، رائٹ؟"

"میں ابھی وعدہ نہیں کرتا۔ اگر میرے کارخانے میں زیادہ کام نہ ہوا تو آجاؤں گا۔"

"اچھا تم کسی کارخانے میں مزدوری کرتے ہو؟ مگر حلیے سے مزدور نظر نہیں آتے۔"

"یہاں ایک اسٹوڈنٹ نظر آتا ہوں۔ کارخانے میں آکر دیکھو گی تو ایک مزدور نظر آؤں گا۔ ویسے میرا اپنا ورکشاپ ہے۔ میں کاروں کی مرمت کرتا ہوں۔"

"او ہو! تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ اب میں اپنی کوٹھی اور مل کی تمام گاڑیاں تمہارے ہی کارخانے میں بھیجا کروں گی۔"

"تھینکس۔ تم تو میرے لیے بہت اچھی گاہک ثابت ہو رہی ہو۔ اب تو مجھے پکنک کی دعوت قبول کرنا ہی ہوگی۔ کام حاصل کرنے کے لیے بڑے لوگوں کی بڑی خوشامدیں کرنا پڑتی ہیں۔"

وہ اس کی بات سن کر ہنسنے لگی۔ دوپہر کو کالج کی چھٹی ہوئی تو اس نے آمنہ کو خرم کی گاڑی میں بیٹھ کر جاتے دیکھا۔ اس کے تیور بدل گئے کہ وہ بجھی بجھی سی لڑکی پہلے ہی دن سے اس کے اور خرم کے درمیان کیوں آگئی۔ اسے بھی ایک زبردست ٹکر مارنا ہوگی۔

آمنہ خرم کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھی ادھر سے ادھر ڈگمگا رہی تھی۔ وہ کھٹارہ ایسی تھی کہ دائیں بائیں ڈگمگا کر آمنہ کو بار بار اس کی جگہ سے کھسکا کر خرم کے نزدیک پہنچا دیتی تھی۔ خرم نے پوچھا۔

"کیا بات ہے تم بہت خاموش ہو؟ ایک خاموش مجسمے کی طرح زندگی گزارنا مجھے پسند نہیں۔ زندگی میں جتنی سانسیں ملتی ہیں، انہیں شکریہ کے طور پر ہنستے بولتے قبول کرنا

چاہیے۔ کیا تم کو مجھ پر بھروسہ نہیں ہے کہ میں تمہارا ساتھ دے سکوں۔"
وہ سر جھکا کر بولی۔
"مجھے سب سے زیادہ آپ پر بھروسہ ہے۔ آج آپ نے مجھے بہت سی خوشیاں دی ہیں۔ میرے دل میں اعتماد کا رشتہ قائم کیا ہے۔"
"تو پھر ہنس ہنس کر باتیں کرو' اتنی خاموش کیوں ہو؟"
"وہ...... وہ دراصل میں اپنے ابو کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ بیٹی کے رشتے کو بھلا سکتے ہیں۔ میں باپ کے رشتے کو نہیں بھلا سکتی۔ آج میں نے کالج میں جب سے ان کی تصویر دیکھی ہے۔ تب سے میرا دل اس تصویر کو سینے سے لگانے کے لیے رو رہا ہے۔"
خرم نے حیرانی سے پوچھا۔
"کالج میں تم نے اپنے ابو کی تصویر کہاں سے دیکھی؟"
"افشاں کے گلے میں جو لاکٹ ہے اس میں میرے ابو کی تصویر ہے۔"
"کیا مطلب؟" گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ "افشاں کے لاکٹ میں آمنہ کے باپ کی تصویر؟"
خرم حیرانی سے اس کا منہ تکنے لگا۔ آمنہ کے چہرے پر کرب لہریں لے رہا تھا۔
افشاں کے ڈیڈی میرے ابو ہیں۔ مگر میں انہیں ابو نہیں کہہ سکتی۔"
خرم چند لمحوں تک شدید حیرانی سے اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔
بیس برس کے بعد کل میں نے ابو کا ذکر سنا کہ وہ زندہ ہیں۔ امی نے بتایا کہ میرے ساتھ پڑھنے والی افشاں میرے ابو کی بیٹی ہے۔ آج پہلی بار میں نے اس لاکٹ میں ابو کا چہرہ دیکھا ہے۔ یہ کیسی ناانصافی ہے کہ وہ ابو کے پاس رہتی ہے اور میں ان کی تصویر کو ایک بار بھی سینے سے نہیں لگا سکتی۔ میرا جی چاہا تھا کہ میں افشاں سے وہ تصویر مانگ لوں۔ مگر یہ سوچ کر چپ ہو گئی کہ وہ مجھے باپ کی محبت میں حصے دار نہیں بنائے گی۔"
خرم چپ چاپ اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس کی حیرانی اب دور ہو چکی تھی اور اب وہ دو بیٹیوں کے درمیان ایک باپ کی ناانصافیوں کو کھلی کتاب کی طرح پڑھ رہا تھا۔
"آمنہ یہ عجیب اتفاق ہے کہ بیس برس تک جس باپ نے چھپنے کی کوشش کی۔ وہ آج اپنی لاڈلی بیٹی کے لاکٹ سے کھل کر سامنے آ گیا۔ تم کہو تو میں تمہارے ابو سے مل کر

ان کا محاسبہ کروں۔"
"نہیں خرم! جب وہ میری امی کی فریاد سے نہ پگھل سکے۔ جب ان کے دل میں ایک لمحے کے لیے بھی میری یاد نہیں آئی تو ان سے کچھ کہنا فضول ہے۔ رشتوں کی محبتیں خیرات کے طور پر نہیں مانگی جاتیں۔ میری وجہ سے اگر وہ بدنام ہوتے ہیں تو میں بدنامی بن کر ان کے سامنے کبھی نہیں جاؤں گی۔ اب تو صرف اتنی سی خواہش ہے کہ ابو کی ایک تصویر کہیں سے مل جائے۔ میں سونے کا لاکٹ نہیں بنا سکتی مگر پیتل کے لاکٹ میں تو انہیں اپنے دل کے قریب رکھ سکتی ہوں"
میں تمہارے لیے پیتل کا لاکٹ خرید کر لا سکتا ہوں۔ افشاں مجھ سے بہت زیادہ فری ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں وہ تصویر اس سے مانگ لوں گا۔ مگر کیا کہہ کر مانگوں گا؟ وہ ہزار قسم کے سوالات کرے گی۔"
"پھر وہ تصویر کب ملے گی؟" آمنہ نے مایوسی سے پوچھا۔
"دیکھو جب تک میرے ساتھ ہو کسی قسم کی مایوسی کو دل میں جگہ نہ دو۔ محبت میں لوگ آسمان سے تارے توڑ لانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ کیا میں ایک لاکٹ سے تصویر توڑ کر نہیں لا سکوں گا۔ تم اطمینان رکھو۔ تمہارے ابو کی تصویر تمہارے سینے سے ضرور لگے گی۔"
یہ کہہ کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ وہ پھر زندگی کی گاڑی میں ڈگمگاتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔

○☆○

میرا میر خان کے ڈرائنگ روم میں کچھ بڑے بڑے خاندانی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ عزت اور غیرت کے موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ ایک بہت بڑے مل اونر کی بیٹی اپنے ایک معمولی ڈرائیور کے عشق میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اس کے ماں باپ نے بہتیرا سمجھایا کہ اپنی حیثیت کے لوگوں سے محبت کی جاتی ہے۔ وہ ایک معمولی ڈرائیور کو اپنا داماد بنا کر اپنی سوسائٹی میں بدنام ہونا کبھی پسند نہیں کریں گے۔ مگر لڑکی جذبات میں اندھی ہو گئی تھی۔ ایک رات وہ اپنے ڈرائیور کے ساتھ فرار ہونا چاہتی تھی۔ عین وقت پر باپ نے دیکھ لیا۔ پھر غیرت کے جوش میں آ کر اپنی بیٹی کو ریوالور سے شوٹ کر دیا اور سزا پانے کے لیے

جیل میں پہنچ گیا۔

"واہ واہ اسے کہتے ہیں غیرت۔" ایک صاحب نے تعریفی انداز میں سر دھنتے ہوئے کہا۔

"عزت ہے تو سب کچھ ہے۔" میرا میر خان بڑھ بڑھ کر بول رہے تھے۔ "جو اولاد عزت کی دشمن بن جائے۔ اس کا مرجانا ہی بہتر ہوتا ہے۔ کیوں کہ اپنی عزت اور ناموس کے لیے ہی اولاد کی پرورش کی جاتی ہے۔ یہ چھوٹے لوگ تو ہمیشہ ہی اس فکر میں رہتے ہیں کہ کسی طرح ہماری عزت اور ہمارا خاندانی وقار خاک میں مل جائے۔ میں نے تو اپنی بیٹی کو وہ تعلیم دی ہے کہ وہ اپنے سے چھوٹے لوگوں کو منہ لگانا پسند نہیں کرتی۔"

افشاں کی ممی اپنے کمرے سے ان کی باتیں سن رہی تھیں اور دل ہی دل میں گھبرا رہی تھی کہ افشاں کے باپ کو اپنی بیٹی کی حقیقت معلوم ہوگی تو وہ اپنی عزت کی خاطر اپنی جان دے دیں گے۔ یا بیٹی کی جان لے لیں گے۔

وہ ایک صوفے پر آ کر بیٹھ گئیں اور افشاں کے متعلق سوچنے لگیں کہ وہ اپنی کار کی طرح اس چار سال کے عرصے میں کتنے عاشق بدل چکی ہے۔ ہر بار ماں نے اس کے عشق کو اس کے باپ سے چھپایا بیٹی کو سمجھایا کہ وہ اپنی حیثیت کا لڑکا پسند کرے مگر بیٹی کے خیالات کچھ اور تھے۔ وہ کہتی تھی۔

"ممی آپ نہیں جانتیں۔ آپ کا زمانہ اور تھا اور ہمارا زمانہ اور ہے۔ میں کم حیثیت والے سے اس لیے شادی کرنا چاہتی ہوں کہ وہ میرے ذاتی معاملات میں مداخلت نہیں کرے گا۔ میری ذاتی تفریحات میں سائے کی طرح میرے پیچھے نہیں لگا رہے گا۔ اچھا کمانے والے مرد حاکم بن جاتے ہیں بیوی کی دولت پر پلنے والے محکوم بن کر رہتے ہیں۔ میں شادی کے بعد پنجرے میں بند ہو کر رہنا نہیں چاہتی۔"

بیٹی کے خیالات سن کر اس کی ممی نے اس کے ڈیڈی سے ایک لڑکے کی سفارش کی جو ان کی ہی مل میں مینیجر تھا۔ اپنے ہی مل کے ملازم کو داماد بنانے کی بات آئی تو میرا میر خان غصے میں آپے سے باہر ہو گئے۔ شیر کی طرح گرجتے ہوئے کہہ دیا کہ وہ بیٹی کو زہر دے کر مار ڈالیں گے۔ اس نوجوان مینیجر کو شوٹ کر دیں گے خود پھانسی کی تختہ پر چڑھ جائیں گے اور غیرت مندی کی ایک یادگار مثال چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ کیوں کہ انسان مرجاتا

ہے مگر عزت کبھی نہیں مرتی۔ وہ عزت ہمیشہ اس کے نام کو زندہ رکھتی ہے۔

ان کی باتیں سن کر پھر ماں بیٹی کو حوصلہ نہیں ہوا کہ کسی کم حیثیت والے کو اپنے خاندان میں جگہ دینے کا تصور بھی کر سکیں۔ افشاں نے اپنی اس غلطی سے توبہ کر لی تھی۔ اس لیے میرا میر خان نے اسے معاف کر دیا۔ لیکن مینیجر کو اپنی مل سے نکال دیا۔ وہ اپنے باپ سے چھپ چھپ کر نت نئے بوائے فرینڈ بناتی تھی، اس کا حساب عزت کے کھاتے میں نہیں آیا۔ زرینہ کے ساتھ ہونے والی غلطی کا حساب بھی سماج کے کسی رجسٹر میں درج نہیں ہوا۔ جو غلطیاں چوری چھپے ہوتی ہیں وہ غلطیاں نہیں کہلاتیں۔

مگر خرم کے معاملے میں افشاں کچھ سنجیدہ ہی ہو گئی۔ سنجیدہ اس لیے بھی تھی کہ آمنہ جیسی ایک غریب لڑکی اس کے عشق کو چیلنج کر رہی تھی۔ اس سلسلے میں ناکام ہونے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ خرم ہاتھ سے نکل جاتا۔ خرم جیسے کتنے ہی نوجوان اس کے آگے پیچھے گھومتے رہتے تھے۔ ضد یہ تھی کہ وہ آمنہ کو چوٹ دے گی۔ اس کے لیے اس نے سوچ رکھا تھا کہ کسی اچھے موقع پر وہ اپنے ڈیڈی کے سامنے خرم کا تذکرہ کرے گی اور انہیں اپنی پسند کی طرف مائل کرے گی۔

○☆○

اتوار کی صبح طلبہ اور طالبات کا قافلہ پکنک کے لیے کلری جھیل کے آزادانہ ماحول میں پہنچا تو وہ خرم کی آنکھوں میں بار بار جھانک رہی تھی اور خرم بار بار اس کے لاکٹ کو دیکھ رہا تھا کہ وہ وہاں سے تصویر کس طرح حاصل کرے۔ افشاں نے ہلکا سا ناشتہ کرنے کے بعد خرم سے کہا۔

"چلو کہیں دور چلیں۔ اس بھیڑ میں اپنی کوئی بات نہیں ہو سکتی۔"

وہ دونوں پکنک پارٹی سے دور ہو کر درختوں کے جھنڈ سے گزرنے لگے۔ افشاں کہنے لگی۔

"خرم میں دولت کی بات کرتی ہوں تو تم اسے میرا غرور سمجھتے ہو۔ مگر کیا تمہارے دل میں یہ خواہش نہیں ہوتی ہے تم بھی دولت مند بن جاؤ۔"

"یہ خواہش ہر انسان کے دل میں ہوتی ہے۔ ہماری اس دنیا میں دولت کے بغیر انسان کی کوئی عزت نہیں ہے۔"

"گڈ۔ میں بھی تمہیں یہی سمجھانا چاہتی تھی۔ اگر ہم جیون ساتھی بن جائیں تو میرے ڈیڈی کی آدھی دولت تمہارے قدموں میں آجائے گی۔ ابھی تم ایک معمولی سا موٹر ورکشاپ کھول کر بیٹھے ہو۔ اگر میرے لائف پارٹنر بنو گے تو نئی کاروں کے سب سے بڑے ڈیلر بن جاؤ گے یا اس سے بھی بڑا کاروبار کر سکو گے۔ میری طرف سے تمہیں سرمایہ ملے گا تو دیکھتے ہی دیکھتے تمہارا نام ملک کے چند بڑے سرمایہ داروں کی فہرست میں آجائے گا۔"

خرم دل ہی دل میں مسکرانے لگا۔ وہ اپنے حسن وشباب کے ساتھ ساتھ اپنے باپ کا سرمایہ بھی لے کر آرہی تھی۔ اتنی زبردست پیش کش کو بھلا کون جوان ٹھکرا سکتا ہے۔ مگراس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس دنیا میں دولت کے بغیر عزت نہیں ملتی اور اگر دولت ہونے والی بیوی کے ہاتھوں سے ملے تو رہی سہی عزت بھی مٹی میں مل جاتی ہے۔ وہ عمر بھر کے لیے اسے اپنا احسان مند بنانا چاہتی تھی۔ خرم فوراً ہی انکار کر سکتا تھا۔ اس کی نظروں میں آمنہ کی خوشی سب سے اہم تھی۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

"ڈارلنگ تم اپنی محبت کو میرے لیے رحمت بنا رہی ہو۔ مجھ سے زیادہ خوش نصیب اور کون ہوگا تمہیں پانے کے بعد مجھے سارے جہاں کی دولت مل گئی ہے مگر تمہارے ڈیڈی راضی نہیں ہوں گے۔"

"میں ڈیڈی کو بہت جلد منالوں گی۔"

"مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ میری غریبی کا مذاق نہ اڑائیں۔"

"اور اگر وہ تمہارا مذاق اڑائیں گے تو میں اسے اپنی توہین سمجھوں گی۔ میں تمہارے لیے وہ گھر چھوڑ دوں گی۔ تمام رشتوں کو توڑ دوں گی۔ اگر باپ اپنی بیٹی کی خوشیوں کا دشمن بن سکتا ہے تو بیٹی بھی باپ کے رشتے سے منہ موڑ سکتی ہے۔"

"اوہ ہنی۔ تم کتنی گریٹ ہو۔" خرم نے اسے...... ذرا قریب کیا تو وہ اور زیادہ قریب آگئی...... خرم اس سے وہ تصویر حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے یہ محبت کا ناٹک کھیل رہا تھا مگراس وقت کڑی آزمائش میں مبتلا ہوگیا۔ اس نے خود کو جلدی سے چھڑاتے ہوئے پوچھا۔

"یہ لاکٹ کیسا ہے؟"

افشاں کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گئی تھی۔ اس نے قدرے بے زاری سے کہا۔

"اس وقت تمہیں یہ لاکٹ کیوں یاد آگیا؟ یہ سونے کا ہے اور اس میں میرے ڈیڈی کی تصویر ہے۔"

یہ کہہ کر وہ پھر قریب آگئی۔ خرم نے کہا۔

"ٹھہرو افشاں...... مجھے تو یوں لگا جیسے ہمارے درمیان ایک انجانی سی دیوار کھڑی ہوگئی ہو۔ اب پتہ چلا کہ ہماری دھڑکنوں کے درمیان تمہارے یہ ڈیڈی آگئے ہیں نوجوانوں کی تنہائی میں بوڑھوں کو نہیں آنا چاہیے۔ اسے پیچھے کرلو۔"

اس نے اپنی گردن کے محور پر لاکٹ کے چین کو گھمایا اور اپنے ڈیڈی کی تصویر کو پشت کی طرف دھکیل دیا۔ پھر خرم کی سانسوں کے قریب آگئی۔ خرم کے دونوں ہاتھ اسے گھیرے ہوئے اس کی پشت پر آگئے۔ پشت پر لاکٹ جھول رہا تھا۔ اس کی گردن سے افشاں جھول رہی تھی۔ لاکٹ کے دونوں پٹ کھل رہے تھے۔

وہ خرم کو آمنہ سے چرا رہی تھی۔ خرم نے لاکٹ سے اس کے باپ کی تصویر چرالی۔

واپسی میں افشاں کے دل ودماغ پر نشہ سا چھایا ہوا تھا۔ خرم بری طرح الجھا ہوا تھا۔ اسے افشاں کے اتنے قریب نہیں جانا چاہیے تھا مگر وہ دل کو سمجھا رہا تھا کہ سیدھی انگلی سے گھی کبھی نہیں نکلتا۔ جو کچھ ہوا وہ تصویر حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا۔ شہر پہنچ کر افشاں یہ وعدہ کرتی ہوئی رخصت ہوگئی کہ وہ بہت جلد اس شادی کے لیے اپنے ڈیڈی کو راضی کرلے گی۔ دوسرے دن کالج جاتے وقت آمنہ اس کی گاڑی میں آکر بیٹھ گئی۔ اس نے آمنہ کو ایک پیتل کا لاکٹ پیش کرتے ہوئے کہا۔

"یہ میں اپنی حیثیت کے مطابق پیش کر رہا ہوں۔ تمہارے ابو اب تک سونے کے گھر میں رہتے تھے۔ اب اس پیتل کے مکان میں رہیں گے۔ اسے کھول کر دیکھ لو۔"

آمنہ نے اسے کھول کر دیکھا۔ باپ کی تصویر دیکھتے ہی خوشی سے کھل گئی۔ اس نے فرط عقیدت سے خرم کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"یہ...... یہ میرے ابو کی تصویر ہے۔ اسے دیکھ کر بھی یقین نہیں آرہا ہے کہ میرے ابو مجھے مل گئے ہیں۔"

خرم نے اسے بڑی ہمدردی سے دیکھا۔ اس لڑکی نے باپ کی تصویر پا کر سارے جہاں کی دولت پالی تھی۔ اس نے چین کو گلے میں پہن کر سینے پر پہنچنے والے لاکٹ کو ایک ہاتھ سے تھام کر دل کی دھڑکنوں پر رکھ لیا۔ گاڑی جب آگے بڑھی تو اس نے پوچھا۔

"یہ تصویر آپ کو کہاں سے ملی؟"

"چوری کی ہے۔ جب مانگنے سے اپنا حق نہ ملے تو چھین لینا چاہیے۔"

آپ نے یہ تصویر کیسے چھین لی؟ کیا افشاں نے کچھ نہیں کہا؟"

"افشاں تو بہت کچھ کہتی ہے مجھے دولت کا لالچ دے کر مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اگر اس وقت میں اپنے فیصلے سے انکار کرتا تو وہ مجھ سے دور ہو جاتی۔ اگر وہ مجھ سے دور ہو جاتی تو میں یہ تصویر حاصل نہ کر سکتا۔ اسے چرانے کے لیے مجبوراً اسے گلے لگانا پڑا۔"

آمنہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے چشم تصور سے دیکھا کہ خرم افشاں کو گلے لگا رہا ہے۔ وہ باپ کی ایک تصویر پا کر اپنے محبوب کو کھو رہی تھی۔ اسے سر جھکائے دیکھ کر خرم نے پوچھا۔

"کیا ناراض ہو گئیں؟"

"میں ناراض ہونے والی کون ہوتی ہوں۔"

"یہ گفتگو کا انداز بتا رہا ہے کہ تم واقعی ناراض ہو۔ ناراض ہونے کے بجائے مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ اگر میرے دل میں بے ایمانی ہوتی تو میں کسی کو گلے لگانے والی بات تمہارے سامنے نہ کہتا۔ میں نے تمہاری خواہش پوری کرنے کے لیے ایسا کیا تھا۔ مجھ پر اعتماد کرو۔ میرے دل و دماغ میں صرف تم ہی تم سمائی ہوئی ہو۔ افشاں جیسی دولت مند لڑکیاں تمہاری جگہ نہیں لے سکتیں۔"

وہ سر جھکا کر دھیمی آواز میں بولی۔

"کچھ بھی ہو، تصویر مجھے مہنگی پڑی ہے۔ ابو کے ساتھ میرا جذباتی رشتہ ہے۔ مگر اتنی بڑی دنیا میں صرف آپ ہی میرا اور نہ ٹوٹنے والا سہارا ہیں۔ میں آپ کو کسی بھی لڑکی کے قریب دیکھوں گی تو خاموشی سے ٹوٹ جاؤں گی۔"

خرم نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں ٹوٹنے نہیں دوں گا۔ مرد کی زبان ایک ہوتی ہے۔ اس کی چاہت ایک ہوتی ہے۔ اس کی پسندیدہ ہستی ایک ہوتی ہے۔ اس ہستی کو یہ سمجھنا چاہیے کہ زندگی کے طویل سفر میں بہت سی غلط فہمیاں اور شکایتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر تمہارا اعتماد نہیں ڈگمگائے گا تو میرے قدم بھی کبھی نہیں ڈگمگائیں گے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب افشاں کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔"

آمنہ کے ذہن سے غبار دھل گیا۔ اعتماد کی بات آئی تو یہ بات سمجھ میں آئی کہ خرم نے اس کی خاطر ہی یہ سب کچھ کیا ہے۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے اسے دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیے۔

وہ کلاس میں پہنچی تو دستور کے مطابق افشاں کے پیچھے بیٹھی لیکچر سنتی رہی۔ باپ کی تصویر سینے سے لگی ہوئی تھی۔ پڑھنے میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ دماغ میں یہ بات پک رہی تھی کہ آج وہ بہت اونچی ہو گئی ہے۔ اس کا باپ اس کے پاس ہے۔ وہ ساری دنیا کو فخر سے یہ دکھا سکتی ہے کہ اس کے پاس بھی اس کے ابو کی تصویر رہتی ہے۔ بس اسی جذبے کے تحت اس سے ایک حماقت ہو گئی۔ اس کے دل نے مجبور کیا تو اس نے لاکٹ کھول کر اپنے پاس بیٹھی ہوئی لڑکی کو اپنی ابو کی تصویر دکھا دی۔ ایک لڑکی نے دیکھا تو دوسری لڑکی بھی آ گئی۔ وہ دوسری لڑکی افشاں کے لاکٹ میں وہی تصویر دیکھ چکی تھی۔ اس کی زبان سے یہ بات ساری لڑکیوں میں پھیل گئی کہ آمنہ کا باپ صرف افشاں کے ڈیڈی کا ہم نام نہیں بلکہ ہم شکل بھی ہے اور یہ بڑی عجیب سی بات ہے۔ افشاں نے سنا تو تنک کر کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ پتہ نہیں وہ لڑکی میرے ڈیڈی کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہے پہلے تو ان کا نام چرایا۔ اب ان کی صورت بھی چراتی ہے۔"

"کہیں اس نے ڈیڈی کی تصویر ہی نہ چرالی ہو۔" اس کی سہیلی نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ "تم ذرا اپنا لاکٹ کھول کر دیکھ لو۔"

افشاں نے لاکٹ کھول کر دیکھا تو تصویر غائب تھی۔ وہ غصے سے کانپتی ہوئی بولی۔

"چور کہیں کی۔ پہلے باپ کا نام چرایا اور اب تصویر چرالی۔ کیسی کمینی ہے۔ دوسرے کے باپ کو اپنا باپ کہتی ہے۔"

وہ غصے سے تنتناتی ہوئی آمنہ کو تلاش کرنے لگی۔ آمنہ کالج کے باغیچے میں ایک

بینچ پر تنہا بیٹھی ہوئی لاکٹ کو کھول کر اپنے ابو کو دیکھ رہی تھی۔ افشاں کو قریب آتے دیکھ کر سہم گئی۔ لاکٹ کو جلدی سے بند کر کے اپنی مٹھی میں بھینچ لیا تاکہ کوئی اس کے باپ کو اس سے نہ چھین سکے۔ افشاں نے آتے ہی کہا۔

"تمہاری کمزور مٹھی میں چوری کا مال نہیں چھپ سکے گا۔ لاؤ میرے ڈیڈی کی تصویر واپس کر دو۔"

"نہیں یہ میرے ابو کی تصویر ہے۔"

"تم سیدھی طرح نہیں مانو گی۔ میں پرنسپل سے جا کر شکایت کرتی ہوں۔ ان کے سامنے تو تمہارا باپ بھی تصویر واپس کر دے گا۔"

وہ غصے سے پلٹ کر جانے لگی تو آمنہ نے جلدی سے اٹھ کر کہا۔

"ٹھہرو افشاں۔ اگر تم پرنسپل سے شکایت کرو گی تو ہم دونوں کی لڑائی میں ایک باپ کی بدنامی ہوگی' تم اسے تسلیم کرو یا نہ کرو مگر یہ حقیقت نہیں بدلے گی کہ ہم دونوں ایک ہی باپ کی بیٹیاں ہیں۔ اگر تمہیں ابو کی عزت عزیز ہے تو ابھی کالج میں بات نہ بڑھاؤ پہلے ابو سے تصدیق کر لو۔"

افشاں حیرت سے دیدے پھیلائے اس کا منہ تک رہی تھی۔ وہ کسی حد تک نرم پڑ گئی تھی مگر اس نے عادت کے مطابق سخت لہجے میں کہا۔

"تم کس رشتے سے میری بہن بن رہی ہو؟ کیا میرے ڈیڈی نے تمہاری ماں سے چوری چھپے شادی کی ہے؟"

آمنہ شروع سے لے کر اب تک کی داستان اسے سنانے لگی۔ افشاں خاموشی سے سنتی رہی۔ اور دل ہی دل میں سوچتی رہی کہ ڈیڈی کی ایک کمزوری ہاتھ آگئی ہے۔ وہ اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر خرم سے شادی کرنے کی ضد کر سکتی ہے۔ اس نے آمنہ کو دیکھ کر نفرت سے کہا۔

"تمہاری ماں میرے ڈیڈی کے نکاح میں نہیں آئی تھی۔ ایسی عورتیں پیسے والوں کے پاس آتی جاتی رہتی ہیں۔ میرے ڈیڈی کی بیٹی بننے کے لیے تمہاری کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے۔ وہ تصویر مجھے واپس کر دو۔"

آمنہ نے لاکٹ کو پھر سے مٹھی میں جکڑ لیا۔

"نہیں! ابو تمہارے پاس ہیں' تصویر میرے پاس رہے گی۔ اگر تم بات بڑھانا چاہتی ہو تو بڑھاؤ مگر میں تصویر واپس نہیں کروں گی۔"

"تم نے میرے ڈیڈی کو بدنام کرنے کے لیے اچھی صورت نکالی ہے۔ مگر یاد رکھو' ان کی تصویر گلے سے لگا کر نہ تو ان کی بیٹی بن سکو گی اور نہ انہیں بدنام کر سکو گی۔ یہ گلے پڑنے والی بات ہے۔"

وہ تنتناتی ہوئی وہاں سے چلی آئی۔ اس نے تصویر واپس لینے کی ضد نہیں کی۔ اسے تو اس بات کی خوشی تھی کہ باپ کو اپنے فیصلے کے سامنے جھکانے کے لیے بہت اچھا موقع ہاتھ آیا ہے۔ وہ کالج سے سیدھی گھر چلی آئی۔ میرا میر خان اپنی لائبریری میں بیٹھے ایک کتاب پڑھ رہے تھے۔ بیٹی کو دیکھتے ہی انہوں نے پوچھا۔

"آج اتنی جلدی کالج سے کیسے چلی آئیں؟"

"مجھے آپ سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔ اس لیے جلدی آگئی ہوں۔ میں نے آپ سے خرم کا ذکر کیا تھا' آپ کو یاد ہے نا؟"

"میری یادداشت بہت اچھی ہے بے بی۔ تم شاید اس نوجوان طالب علم کی بات کر رہی ہو۔ جس کی گاڑی کو ٹکر مار کر تم نے پچکا دیا تھا۔"

"جی ہاں وہی خرم۔ وہ بہت ہی اسمارٹ اور ہینڈسم ہے۔ ڈیڈی ٹو بی ویری فرینک۔ میں اسے پسند کرتی ہوں اور اسے لائف پارٹنر بنانا چاہتی ہوں۔"

میرا میر کے تیور بدل گئے۔ انہوں نے بیٹی کو گھورتے ہوئے کہا۔

"تمہاری پسند اتنی گھٹیا کیوں ہے؟ تم نے پستی میں رینگنے والے کیڑوں سے ہمیشہ نفرت کی ہے۔ آج تمہارے دماغ میں اس پستی کا ایک کیڑا کیوں کلبلا رہا ہے؟"

"ڈیڈی! انسانوں کے درمیان صرف اپنے مفاد کی خاطر بلندیاں اور پستیاں بنائی جاتی ہیں۔ جب خرم مجھ سے منسوب ہو جائیں گے تو وہ خود بہ خود پستی سے اٹھ کر بلندی پر آجائیں گے۔"

"بکواس مت کرو۔" وہ غصے سے کانپنے لگے "خدا نے جسے جو حیثیت دی ہے وہ اسی حیثیت میں جئے گا اور مرے گا۔ کیا تم اسے میرے خاندان میں لا کر ایک گندی مچھلی کی طرح سارے تالاب کو گندہ کرنا چاہتی ہو' مجھے اپنی سوسائٹی میں بدنام کرنا چاہتی ہو' جن

کے سامنے میں ناک اونچی کرتا ہوں کیا ان کے سامنے سر جھکا کر چلوں گا؟ نہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گا خود مرجاؤں گا مگر اپنے آباواجداد کی بنائی ہوئی عزت پر حرف نہیں آنے دوں گا۔ لہٰذا یہ خیال دل سے نکال دو کہ ایک جھگی میں رہنے والا اس محل میں آکر میرا داماد بنے گا۔"

"وقت کے مطابق انسان کی جگہ بدلتی رہتی ہے ڈیڈی۔ اس سونے کے لاکٹ کو دیکھیے۔ کل تک آپ اس میں رہتے تھے مگر آج خالی ہے۔"

اس نے لاکٹ کھول کر دکھایا۔ انہوں نے خالی لاکٹ کو دیکھ کر پوچھا۔

میری تصویر کہاں ہے؟"

"وقت کے مطابق جگہ بدل گئی ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ جھگی کا آدمی کوٹھی میں نہیں آسکتا مگر آپ سونے کے لاکٹ سے نکل کر پیتل کے لاکٹ میں پہنچ گئے ہیں۔ اور وہ پیتل کا لاکٹ آمنہ کے گلے میں ہے۔"

"کون آمنہ؟" انہوں نے گھبرا کر کہا۔

"آمنہ۔ آپ کی اور زرینہ کی بیٹی۔ آپ کی یادداشت بہت اچھی ہے۔ لہٰذا آپ یہ نہ پوچھیں کہ میں کس زرینہ کی بات کررہی ہوں۔"

میرامیر خان اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے یوں نظر آنے لگے تھے جیسے ٹکر مارنے والی بیٹی نے انہیں بھی پچکا کر رکھ دیا ہو۔

تت..... تمہیں یہ باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟

"ڈیڈی ہم جو اپنی کوٹھی سے کوڑا کرکٹ کا ڈھیر نکال کر کچرا محلوں میں پھینکتے ہیں' وہاں کی غلاظت سے کوئی نہ کوئی کیڑا رینگتا ہوا ہم تک پہنچ جاتا ہے۔ بیس سال بعد آمنہ رینگتی ہوئی میرے لاکٹ تک پہنچ گئی تو مجھے سب کچھ معلوم ہوگیا۔ ڈیڈی میں آپ سے کوئی نئی بات کہنے نہیں آئی ہوں۔ آپ غریب زرینہ کی طرف گئے تھے۔ میں خرم کی طرف بڑھ رہی ہوں۔ ایک ذہین بیٹی کی طرح آپ کے نقش قدم پر چل رہی ہوں۔ زرینہ آپ کے لیے اس وقت ایک خوشی تھی۔ خرم میری خوشی ہے۔ اگر آپ نے میری خوشی پوری نہیں کی تو میں یہی کہوں گی کہ آپ ایک باپ کے رشتے سے فریب دے رہے ہیں جس طرح اپنی ایک بیٹی آمنہ کو فریب دیتے آرہے ہیں۔"

اس بار میرامیر خان کا لہجہ نرم ہوگیا۔

"افشاں' باپ کی کمزوری کو سامنے رکھ کر اپنی یہ ناجائز ضد پوری کروانا اچھی بات نہیں ہے۔"

"یہ ناجائز ضد نہیں ہے۔ یہ میری اپنی پسند ہے۔ اگر آپ اس پسند سے انکار کریں گے تو میں یہاں سے نکل کر خرم کے چھوٹے سے محلے میں پہنچ جاؤں گی۔ سنا ہے کہ آمنہ بھی وہیں رہتی ہے۔ اچھا ہے کہ اب آپ کی دونوں بیٹیاں وہیں رہیں گی۔"

وہ دھمکی دے کر جانے لگی۔ باپ نے اسے آواز دی۔

"رک جاؤ مجھے ذرا سوچنے دو۔"

وہ دروا[illegible] پر رک کر باپ کی صورت دیکھنے لگی۔ باپ اپنی بیٹی کی صورت دیکھ کر سوچنے لگا کہ ایسے موقع پر کس طرح اپنی عزت اور خاندانی وقار کا تحفظ کرنا چاہیے۔ جلد ہی ایک ترکیب سمجھ میں آگئی۔ انہوں نے بڑی نرمی سے کہا۔

"میں خرم سے ملنا چاہتا ہوں۔ اسے میرے پاس بھیج دو۔ آج ہی تمہارے مستقبل کا فیصلہ سنادوں گا۔"

افشاں نے خوش ہو کر کہا۔

"اوہ آپ سچ مچ میرے ڈیڈی ہیں۔ میں ابھی خرم کو بلا کر لاتی ہوں۔"

وہ خوشی سے لہراتی بل کھاتی لائبریری سے باہر آگئی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ اپنی کار ڈرائیو کرتی ہوئی خرم کے ورکشاپ میں پہنچ گئی۔ خرم کالج سے آکر ورکشاپ میں کام کے حساب کی جانچ پڑتال کررہا تھا' افشاں نے کار سے سر نکال کر کہا۔

"خرم ادھر آؤ۔ میں تمہیں بہت بڑی خوش خبری سنانے آئی ہوں۔"

خرم کار کے پاس آیا۔ وہ کھڑکی پر جھک کر اس سے کہنا چاہتا تھا کہ اس کی کسی خوشخبری سے اسے دلچسپی نہیں ہے۔ مگر اس سے پہلے ہی افشاں نے چہک کر کہا۔

"آج میں نے ڈیڈی کو بلیک میل کیا ہے۔"

"وہ کیسے؟" اچانک ہی خرم کی دلچسپی بڑھ گئی۔

"وہ جو آمنہ تمہارے ساتھ کالج آتی جاتی ہے۔ وہ میرے ڈیڈی کی ناجائز اولاد ہے۔ میں نے ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا کہ جب وہ آمنہ کی غریب ماں سے

رشتہ جوڑ سکتے ہیں تو میں خرم کو اپنا جیون ساتھی کیوں نہیں بنا سکتی؟ میں نے دھمکی دی کہ اگر وہ انکار کریں گے تو میں وہ کوٹھی چھوڑ کر خرم کے جھونپڑے میں چلی جاؤں گی۔ اس طرح ان کی دوسری بیٹی بھی غریبوں کے محلے میں پہنچ جائے گی۔ بس وہ دھمکی میں آ گئے۔ اب وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ چلو، لوہا گرم ہو تو اسی وقت اس پر چوٹ لگانی چاہیے"

خرم اس کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔ افشاں کی اس بات نے اسے قائل کر دیا تھا کہ ایسے ہی وقت میرا میر خان کا محاسبہ کیا جا سکتا ہے۔ جب وہ اپنی ایک بیٹی کو اس محلے میں آنے سے روک سکتے ہیں تو دوسری بیٹی کو اس محلے سے نکال کر اپنے سینے سے کیوں نہیں لگا سکتے؟

ہر شخص اپنے طور پر سوچتا ہے۔ میرا میر خان بھی اپنی لائبریری میں بیٹھے اپنے طور پر سوچ رہے تھے کہ کس صورت سے عزت بچائی جا سکتی ہے۔ پہلی صورت تو یہ تھی کہ اولاد کو نصیحت کے ذریعے غلطی سے روکا جائے مگر نصیحت کا وقت گزر چکا تھا۔ بیٹی باپ کی کمزوری کو سامنے رکھ کر اپنی ضد منوا رہی تھی۔ دوسری صورت یہ تھی کہ اپنی عزت کی خاطر جیسے غریبوں کے جذبات کو دولت سے خریدا جا سکتا ہے۔ وہ پیسے لے کر افشاں کا پیچھا چھوڑ دے۔ اس طرح افشاں کو بھی اس نوجوان کی اوقات کا پتہ چل جائے گا۔ اگر اس پر بھی ناکامی ہوئی تو تیسری صورت یہ ہے کہ بیٹی کا گلا گھونٹ کر یا خود زہر کھا کر عزت کی خاطر مر جائیں۔

وہ لائبریری سے اٹھ کر بیڈ روم میں گئے۔ آئرن سیف کھول کر بڑے بڑے نوٹوں کی گڈیاں نکالیں پھر انہیں لے کر لائبریری میں واپس آ گئے۔ ایک گھنٹے کے بعد افشاں، خرم کو لے کر ڈرائنگ روم میں آئی۔ وہاں خرم کو بیٹھنے کے لیے کہہ کر باپ کو آ کر اطلاع دی۔

"ڈیڈی وہ آ گئے ہیں۔"

"اسے یہاں بھیج دو اور تم اپنی امی کے پاس جاؤ۔ میں اس سے تنہائی میں باتیں کروں گا۔"

افشاں کے جانے کے بعد وہ تھوڑی دیر تک انتظار کرتے رہے پھر لائبریری کا دروازہ کھولا تو ایک نوجوان نظر آیا۔ انہوں نے اسے سر سے پیر تک دیکھا جیسے کسی کو خریدنے سے پہلے اسے نظروں سے ٹھونک رہے ہوں پھر انہوں نے خریدار کے سے لہجے

میں پوچھا۔

"تمہارا نام خرم ہے؟"

"جی ہاں۔" خرم آہستہ آہستہ چلتا ہوا میز کی قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا کرتے ہو؟"

"پڑھتا ہوں اور اپنے ہی ایک موٹر ورکشاپ میں مزدوری بھی کرتا ہوں۔"

"کیا تم میری بیٹی سے شادی کرنا چاہتے ہو؟"

"کس بیٹی سے؟ بیٹی کا نمبر بتائیے۔"

خرم کے اس غیر متوقع حملے سے وہ گھبرا گئے چند لمحوں تک لاجواب ہو کر اسے دیکھتے رہے پھر انہوں نے جلدی سے کہا۔

"بے کار باتیں نہ کرو۔ میری ایک ہی بیٹی ہے۔ افشاں۔"

"جی نہیں۔ آپ کی دو بیٹیاں ہیں۔ افشاں اور آمنہ۔"

وہ دانت پیس کر اسے دیکھنے لگے۔ دونوں بیٹیوں کے دونوں نام ان کے خالی دماغ کے گنبد میں گونج رہے تھے پھر انہوں نے اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"چلو دو ہی سہی۔ تم کسے پسند کرتے ہو؟"

"میری پسند سے کیا ہوتا ہے بڑے صاحب؟ میں چھوٹا آدمی ہوں۔ اگر میں افشاں سے شادی کرنا چاہوں گا تو آپ مجھے اتنے اونچے مقام تک پہنچنے نہیں دیں گے۔ اگر آمنہ سے شادی کرنا چاہوں گا تو لوگ مجھ پر انگلیاں اٹھائیں گے۔ جس بیٹی کا باپ زندہ ہو کر مردہ کہلائے۔ وہ بیٹی بھی زندہ رہ کر مردے کی طرح زندگی گزارتی ہے۔ اور آپ باپ بن کر اسے اپنے دروازے سے ڈولی میں بٹھائیں تو میں آپ کی اسی بیٹی سے شادی کروں گا۔"

"میں اسے اپنی بیٹی تسلیم نہیں کرتا۔ اس لیے فضول باتیں نہ کرو۔ تمہاری باتوں سے پتہ چل گیا ہے کہ تم آمنہ کو پسند کرتے ہو۔ تمہاری یہ پسند مجھے بہت سی الجھنوں سے نجات دلائے گی اگر تم آمنہ سے شادی کرو گے تو میں تمہاری ہر طرح مدد کروں گا۔ آمنہ کو منہ مانگا جہیز دوں گا۔ تمہیں بھی کاروبار کے لیے پچاس ہزار روپے نقد ملیں گے۔"

پھر بھی وہ عزت سے دلہن نہیں بنے گی۔ یہ سب کچھ آپ خود کو چھپانے کے لیے کر رہے ہیں جب تک آپ باپ بن کر اس بدنصیب دلہن کے سر پر ہاتھ رکھنے نہیں آئیں گے۔ اس وقت تک اس کی ڈولی عزت سے نہیں اٹھے گی۔"

"تمہیں اس کی عزت کا اتنا ہی خیال ہے تو مجھ پر کیچڑ اچھالنے کے بجائے اسے خاموشی سے کیوں نہیں اپنا لیتے۔ اگر ایک باپ کے بغیر اس محلے میں اس کی بدنامی ہوتی ہے تو اسے دوسرے محلے میں لے جاؤ یا دوسرے شہر لے جا کر شریک حیات بنا لو۔"

اگر میں اسے نکاح سے پہلے کسی دوسرے شہر لے جاؤں گا تو وہ اور زیادہ بدنام ہو جائے گی۔ دنیا جانے یا نہ جانے مگر یہ حقیقت نہیں بدلے گی کہ میرامیر خان کی ایک بیٹی ایک نوجوان کے ساتھ محلے سے بھاگ گئی ہے۔"

دنیا والوں کے علم میں آنے سے ہی عزت پر حرف آتا ہے اور غیرت کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ وہ نکاح کے بغیر تمہارے ساتھ کہیں چلی جائے گی تو کوئی مجھ پر انگلی نہیں اٹھائے گا۔"

انہوں نے میز پر نوٹوں کی گڈیاں نکالیں' پھر انہیں خرم کے سامنے میز پر پھینکتے ہوئے کہا۔

"یہ پچاس ہزار روپے ہیں۔ جتنی جلدی ہو سکے تم آمنہ کو اس شہر سے دور لے جاؤ مزید رقم کی ضرورت ہو تو مجھ سے فون پر رابطہ قائم کرو مگر یہ بات یاد رکھنا کہ میں مزید پچاس ہزار سے زیادہ نہیں دے سکوں گا۔"

خرم نوٹوں کی گڈیوں کو گہری سنجیدگی سے دیکھ رہا تھا پھر اس نے سر اٹھا کر پوچھا۔

"بڑے صاحب! آپ ایک تیر سے کتنے شکار کھیلتے ہیں؟ ان روپوں سے آپ افشاں کو شکست دے رہے ہیں۔ دوسری طرف یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ مجھ جیسے عاشق مزاج نوجوان چند نوٹوں سے خرید لئے جا سکتے ہیں۔ مجھے افشاں کی پروا نہیں ہے کہ وہ میرے متعلق کیا رائے قائم کرے گی۔ مجھے صرف آمنہ کی فکر ہے۔ میری عقل کہتی ہے کہ جب اس کا باپ زندہ ہے تو پھر وہ عزت اور آبرو سے دلہن بن کر اپنے باپ کی سرپرستی میں اس گھر سے نکل کر میرے گھر آئے۔ میں اسے شریک حیات بنانے کے لیے ایک پیسہ بھی معاوضے کے طور پر نہیں لوں گا۔ میں آمنہ کے لیے صرف نیک نامی چاہتا ہوں اور یہ

آپ پیسوں کے بغیر بھی دے سکتے ہیں۔"

وہ نوٹوں کی ایک ایک گڈی اٹھا کر واپس ان کی طرف پھینکنے لگا۔ میرامیر خان غصے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"تم بے وقوف ہو' پڑھے لکھے جاہل ہو۔"

بے وقوف اور جاہل آپ ہیں۔ میں نے آپ جیسا باپ کہیں دیکھا نہ سنا ہوگا جو اپنی بیٹی کو بھگا کر لے جانے کا مشورہ دیتا ہے۔ میں آمنہ کو ان پیسوں کے بغیر اپناؤں گا۔ میں تو صرف یہ دیکھنے آیا تھا کہ آپ اپنی جھوٹی عزت کو قائم رکھنے کے لیے کس حد تک بے غیرت بن سکتے ہیں۔"

"چلے جاؤ یہاں سے۔ گیٹ آؤٹ۔" وہ غصے سے تھر تھر کانپتے ہوئے چیخنے لگے۔

خرم تیزی سے چلتا ہوا لائبریری سے باہر آگیا۔ افشاں دوسرے کمرے کے دروازے سے لگی بہت دیر تک ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اس نے آمنہ کو شکست دینے کے لیے خرم کو وہاں بلایا تھا اور خرم نے وہاں پہنچ کر پینترا بدل دیا۔ صاف طور سے کہہ دیا کہ وہ ایک شریف زادی کو چھوڑ کر ایک بدنام لڑکی کو شریک حیات بنانا چاہتا ہے۔ اس کی ایسی توہین کبھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ غصے اور صدمے سے کٹی جا رہی تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کسے کچا چبا جائے۔ خرم تو پھر بھی غیر تھا مگر اپنے ہی باپ نے تاجر بن کر کاروباری انداز اختیار کیا تھا۔ اس کے ڈیڈی پچاس ہزار روپے کا چارہ پھینک کر اسے بدنام بیٹی کے قریب اور عزت دار بیٹی سے دور کر رہے تھے۔ کیا ان بوڑھے لوگوں کو اپنی جھوٹی غیرت اور شان و شوکت اتنی عزیز ہوتی ہے کہ وہ اولاد کی خوشیاں برباد کر دیتے ہیں۔ ایسی غلیظ غیرت کو گلے لگائے رکھنے کے لیے اپنی ہی بیٹی کو بھگا کر لے جانے کا مشورہ دیتے ہیں۔

پھر بیٹیاں غیرت کا مفہوم کیا سمجھیں گی؟ اگر میں بھی کسی کے ساتھ فرار ہو جاؤں تو ڈیڈی کے لئے کیا فرق پڑے گا۔ افشاں کے دماغ میں بغاوت کی آندھیاں چلنے لگیں۔ مل کا وہ نوجوان منیجر جو اس کی خاطر ملازمت سے نکال دیا گیا تھا۔ آج بھی اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے کہا تھا۔

"افشاں اگر تم مجھ سے سچی محبت کرتی ہو تو میرے پاس چلی آؤ۔ ہم چپ چاپ

کورٹ میرج کرلیں گے بعد میں تمہارے ڈیڈی کو پتہ چلے گا تو وہ کچھ دنوں تک غصے سے تلملائیں گے۔ اپنے اونچے خاندان کے غرور میں کچھ عرصے تک انگاروں پر لوٹتے رہیں گے مگر ایک بیٹی سے ساری عمر نفرت نہیں کرسکیں گے۔ خون کے رشتے اتنی آسانی سے نہیں ٹوٹ جاتے۔ تمہاری ممی کے رونے پیٹنے سے اور دوسرے رشتہ داروں کے سمجھانے سے وہ ایک دن مجبور ہو کر تمہیں گلے لگالیں گے۔ اور مجھے بھی اپنا داماد تسلیم کرلیں گے۔"

افشاں کے دماغ میں اپنے اس محبوب کی باتیں گونج رہی تھیں۔ وہ واقعی اسے دل وجان سے چاہتا تھا۔ خرم کی طرح فریبی اور دغا باز نہیں تھا۔ اب افشاں کو اپنے محبوب کی باتوں کا وزن معلوم ہو رہا تھا۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی اپنے بیڈ روم میں آئی۔ دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد ایک خالی سوٹ کیس نکالا۔ پھر اپنی الماری کھول کر اس میں زیورات کے سیٹ اور نقد روپے نکال کر سوٹ کیس میں رکھ لیے۔ اس کے بعد اس نے اپنے کپڑے اور ضرورت کی دوسری چیزیں رکھیں پھر سوٹ کیس کو بند کرنے کے بعد اپنی میز کے قریب آکر کرسی پر بیٹھ گئی اور اپنے سامنے پیڈ اور قلم رکھ کر سوچنے لگی۔

○☆○

میرامیر خان کو ایسے زلزلے کے جھٹکے لگ رہے تھے کہ انہیں اپنی کوٹھی کی در و دیوار ہلتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ اس رات انہیں نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ اپنی خواب گاہ میں ادھر سے ادھر ٹہل رہے تھے۔ بیگم ان کے سامنے صوفے پر بیٹھی ہوئی انہیں چرکے لگا رہی تھیں۔

"جوانی کا گناہ بڑھاپے میں پلتا پھولتا ہے۔ آپ رنگ رلیاں مناتے تھے میں آپ کو روکتی رہتی تھی۔ اس کم بخت زرینہ کو میں نے ہی یہاں سے نکالا تھا مگر پتہ نہیں بیس برس کے بعد وہ ہمیں بدنام کرنے کہاں سے آگئی ہے۔"

میرامیر خان نے جھنجلا کر کہا۔

"تم نے زرینہ کو اس کوٹھی سے نکالا تھا' اس دنیا سے تو نہیں نکالا تھا۔ وہ تو ایک بیٹی کی ماں بنتے ہی میرے پیچھے پڑ گئی تھی۔ میں ہر ماہ اسے پیسے دے کر اس کا منہ بند کردیا کرتا

تھا مگر تمہاری بیٹی اس خرم کو یہاں لے آئی تاکہ وہ مجھے بے غیرت کہے اور ذلیل کرے۔"

"مگر اب کیا ہوگا؟ اس نے پچاس ہزار روپے کی رشوت نہیں لی ہے۔ اب وہ یہاں سے جاکر ہمیں بدنام کرے گا۔"

"اس کا باپ بھی مجھے بدنام نہیں کرسکتا۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ آمنہ میری بیٹی ہے۔ اگر خرم کے بھڑکانے پر زرینہ مجھے بدنام کرے گی تو یہ آسمان پر تھوکنے والی بات ہوگی۔ میں ایسے ذلیل لوگوں کی پروا نہیں کرتا۔ مجھے اس بات کا اطمینان ہے کہ میں نے افشاں کو ٹھوکر کھانے سے بچالیا ہے۔ اس نادان لڑکی نے مجھے دھمکی دی تھی کہ وہ خرم کے پاس چلی جائے گی۔ اچھا ہوا کہ اس لڑکے نے اسے خود ہی اسے اپنانے سے انکار کردیا۔ اب اس لڑکی کو عقل آگئی ہوگی۔"

بیگم نے بھی اطمینان کی سانس لے کر کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ اگر وہ گھر سے چلی جاتی تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔"

"تم کسی کو منہ دکھانے کی بات کرتی ہو بیگم' میں خود اپنی صورت دیکھنا پسند نہ کرتا۔ ایسی ذلت برداشت کرنے سے پہلے ہی مرجاتا۔"

"آپ منحوس بات زبان سے نہ نکالیں۔ اب دانش مندی یہی ہے کہ جلد از جلد افشاں کی شادی کردی جائے۔"

"ہوں۔" انہوں نے طویل "ہوں" کے بعد کہا۔ "یہ لڑکی ہمارے ناموس اور عزت کے لیے بڑا خطرہ بن گئی ہے۔ اب نہ جانے خرم کی باتوں کا اس پر کیا رد عمل ہوا ہے۔ رات کے دو بجے ہیں۔ وہ ضدی لڑکی ابھی تک جاگ رہی ہوگی۔ تم جاکر اسے تسلیاں دو۔ اسے سمجھاؤ کہ ہم تو اس کی پسند کو ناپسند نہیں کر رہے ہیں اس کا پسندیدہ نوجوان ہی دغاباز نکلا۔"

بیگم اٹھ کر خواب گاہ سے باہر چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی تنہائی میں خرم کی باتیں نشتر بن کر چبھنے لگیں۔ اس نے بڑی زہریلی بات کہی تھی کہ وہ خود اپنی بیٹی کو بھگانے کا مشورہ دے کر بے غیرت ہونے کا ثبوت دے رہے ہیں۔ وہ ٹہلتے ہوئے ایک قد آدم آئینے

کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔ آئینے میں وہ کہیں سے بے غیرت نظر نہیں آرہے تھے۔
اسی وقت بیگم ہانپتی کانپتی کمرے میں واپس آئیں اور ہانپتے ہوئے ایک خط میرامیر خان کی طرف بڑھایا اور کہا۔

"غضب ہوگیا۔ افشاں کہیں چلی گئی ہے۔"

میرامیر خان نے فوراً ہی اس خط کو جھپٹ لیا۔ خط الٹ کر ان کے ہاتھ میں آیا تھا۔ وہ اسے سیدھا کر کے پڑھنے لگے۔ افشاں نے لکھا تھا۔

"ڈیڈی......! خرم کے فریب نے مجھے یہ سمجھا دیا ہے کہ مجھے دل وجان سے چاہنے والا صرف وہی نوجوان ہے جسے آپ نے مل سے نکال دیا ہے۔ میں اسی کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں۔ آپ نے خرم کو ایک بیٹی بھگا لے جانے کا مشورہ دے کر میرے لیے فرار کا راستہ کھول دیا ہے۔ میں آج تک یہ سوچ کر ڈرتی تھی کہ میرے غلط قدم اٹھانے سے آپ اپنی بدنامی پسند نہیں کریں گے۔ اپنی جان پر کھیل جائیں گے مگر آج آپ کی باتیں سن کر عقل آگئی کہ کوئی بیٹی کو بھگا لے جائے تو آپ کے عزت کے ماتھے پر شکن نہیں آئے گی۔ میں جانتی ہوں کہ میرا محبوب کہاں رہتا ہے مگر آپ نہیں جانتے۔ لہٰذا آپ مجھے تلاش کرنے کی ناکام کوشش نہ کریں۔ کل یا پرسوں کے اخبار میں آپ کو پتہ چل جائے گا کہ میں شادی کر چکی ہوں۔ شادی کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔ اس لیے اخباروں میں یہ خبر ضرور شائع ہوگی۔ آپ دو چار روز تک بلاناغہ اخبار پڑھتے رہیں۔" آپ کے مشورے پر چلنے والی آپ کی عزت دار بیٹی۔ افشاں۔

وہ خط میرامیر خان کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چھوٹ کر فرش پر آگیا۔ وہ اپنا سر تھام کر آگے پیچھے ڈگمگانے لگے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ بیگم نے انہیں سہارا دینے کے لیے ہاتھ لگایا تو وہ انہیں پرے دھکیل کر چیخنے لگے۔

"چلی جاؤ یہاں سے۔ تم بھی یہاں سے عزت کا جنازہ اٹھا کر چلی جاؤ۔ میں اسے کہاں تلاش کروں۔ وہ کہاں ملے گی۔ ملے گی بھی تو کسی غلاظت میں ملے گی۔ کسی کی گندی آغوش میں میری عزت کی دھجیاں اڑا رہی ہوگی۔ نہیں میں یہ کبھی برداشت نہیں کروں گا۔ میں دنیا والوں کے طعنے نہیں سنوں گا کہ میری بیٹی نے کس طرح میری عزت کا جنازہ نکالا ہے۔" وہ چیختے ہوئے اپنے آئرن سیف کی طرف جانے لگے۔ خواب گاہ کے

باہر کوٹھی کے ملازم حیرانی سے کھڑے ہوئے ان کی چیخ و پکار سن رہے تھے۔ ان کے دونوں بیٹے بھی اپنے کمروں سے نکل کر آرہے تھے۔ اسی وقت بیگم چیختی ہوئی خواب گاہ سے باہر نکلیں۔

"ارے کوئی انہیں روکے۔ انہوں نے ریوالور نکال لیا ہے۔"

اس سے پہلے کہ ان کے بیٹے اور ملازم ان کی بات پوری طرح سمجھتے' خواب گاہ کے اندر "ٹھائیں" کی آواز گونجی۔ اور رات کے سناٹے میں دور تک پھیلتی چلی گئی۔

○☆○

دوسری شام خرم آمنہ کے گھر آکر بیٹھا ہوا تھا اور اس کی ماں سے آمنہ کا رشتہ مانگ رہا تھا۔ وہ دروازے کے پیچھے کھڑی مسکراتی ہوئی اپنے محبوب کی باتیں سن رہی تھی۔ اس وقت ڈیٹو سر جھکائے کمرے میں آیا۔ اس نے بتایا کہ پچھلی رات افشاں گھر سے بھاگ گئی ہے۔ میرامیر خان یہ بات برداشت نہ کرسکے انہوں نے بے عزتی کی زندگی گزارنے کے بجائے موت کو گلے لگالیا ہے۔ یہ سن کر زرینہ کی آنکھوں میں صرف آنسو آئے مگر دروازے کے پیچھے کھڑی ہوئی بیٹی کا کلیجا پھٹ گیا۔ وہ چیخ چیخ کر اپنے ابو کو یاد کر کے رونے لگی۔ خرم نے تھوڑی دیر تک اسے رونے دیا تاکہ آنسو کی ذریعے باپ کی موت کا صدمہ کچھ ہلکا پڑ جائے پھر وہ دروازے کے قریب آکر بولا۔

"آمنہ صبر کرو۔ کوئی باپ یہ بدنامی برداشت نہیں کرسکتا کہ اس کی بیٹی گھر سے بھاگ جائے یا کوئی بھگا کر لے جائے۔ تمہارے ابو نے اس لیے جان دی ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ غیرت مند تھے۔ آمنہ صبر کرو۔"

○☆○

زندہ خودکشی

کبھی حالات کے کسی ظالم موڑ پر
ایسی خودکشی بھی عمل میں آتی ہے۔
جس کے نتیجہ میں آدمی اپنے وجود کے سب سے
قیمتی حصے کو مار کر زندہ رہتا ہے۔
اس کہانی کا عنوان جس قدر فکر انگیز ہے
انجام اسی قدر چونکا دینے والا ہے۔

زندہ خودکشی

شادی کی تقریب تھی اور اس خوشی میں ورائٹی پروگرام پیش کیا جا رہا تھا۔ ناچ گانا بھی تھا، لطیفہ گوئی بھی چٹکلے بھی چھوڑے جا رہے تھے لیکن ورائٹی پروگرام کی ایک خرابی یہ ہے کہ ہر شخص کو اس پروگرام کا ہر آئیٹم پسند نہیں آتا کیوں کہ ہر شخص دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ جو بات دوسرے کو پسند آئے، اس بات کو وہ بھی پسند کرے۔ یہی وجہ ہے کہ جب شہر کی سب سے مشہور طوائف نے مجرا شروع کیا تو بوڑھوں کے چہرے خوشی سے کھل گئے۔ ایک بزرگ نے واہ واہ کرتے ہوئے فرمایا۔

”وہ بھی کیا زمانہ تھا۔ طوائفوں کے کوٹھے تہذیب کا گہوارہ سمجھے جاتے تھے۔ شاہ زادے اور نواب زادے ان کے ہاں نشست و برخاست کے آداب سیکھنے جاتے تھے....“

درست ہے، جاتے ہوں گے۔ لیکن آج کل کے شریف زادے مجرا شروع ہوتے ہی ہوٹنگ کرنے لگے۔ انہیں یہ پرانی روش کیسے پسند آتی؟ کیونکہ موجودہ دور کے مزاج کے مطابق اب طوائفوں کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ خود اپنی گرل فرینڈز کے ساتھ رقص کر سکتے تھے۔ اسی لیے وہ آوازیں کس رہے تھے اور موسیقی کی تال پر مضحکہ اڑانے کے انداز میں سب باجماعت تالیاں بجا رہے تھے۔

بزرگوں نے ادھر ادھر پھیلے ہوئے نوجوانوں کو گھور کر دیکھا مگر ان کم بختوں کو ان کے جذبات کا احساس نہیں تھا۔ انہیں اتنا تو سوچنا چاہیے تھا کہ جوان بیٹے بیٹی والے عزت دار لوگ بدنامی کے ڈر سے بازار حسن میں نہیں جاسکتے تھے۔ ایک یہی شادی بیاہ کا موقع ہوتا ہے کہ وہ طوائفوں کو گھر بلا کر اپنی بوڑھی حسرتوں کو جوان کرلیتے ہیں۔ جب ان کے گھورنے کا نوجوانوں پر اثر نہ ہوا تو ایک بزرگ نے مصلحت اندیشی سے کام لیا اور پروگرام کو از سر نو اس طرح مرتب کیا کہ ایک بار مجرا ہو' دوسری بار نوجوان اپنا آئیٹم پیش کریں پھر تیسری بار مجرا ہو۔ دوسری بار نوجوان اپنا آئیٹم پیش کریں پھر تیسری بار مجرا ہو۔ اس کے بعد ترتیب وار نوجوانوں کی باری آئے۔ نوجوانوں نے خوش ہو کر تالیاں بجائیں۔ پھر اس ترتیب سے مجرا ختم ہوتے ہی جوان لڑکے اور لڑکیاں گٹار اور دف لے کر اسٹیج پر آگئے۔ لڑکیوں کو دیکھتے ہی ان کے باپ محفل سے اٹھ کر جانے لگے۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ ان کی بچیاں کلبوں میں جاتی ہیں لیکن کلبوں میں جا کر ڈانس کرنا اور بات ہے۔ وہاں طوائفیں نہیں جاتیں۔ اس لیے شریف زادیوں کو مجرے والی محفل میں ڈانس کا آئیٹم پیش نہیں کرنا چاہیے۔ اس طبقاتی سماج میں ہر ایک کے لیے الگ الگ کوٹھا مخصوص ہے۔ ان کی بھی کلاسز ہوگئی ہیں۔

اس نئی نسل کو کہاں تک بچے کر کے سمجھایا جائے؟ اور نئی نسل کو شکایت ہے کہ سمجھانے والے بزرگ خود نہیں سمجھتے چنانچہ رنگ میں بھنگ پڑنے لگا۔ نوجوانوں نے مجرے کا بائیکاٹ کیا اور بوڑھوں نے ان کے آئیٹم پر لعنت بھیجی۔ دولہا کے باپ نے سمجھایا کہ شادی کی خوشی میں کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ بہتر یہ ہے کہ کسی بھی طرف سے رقص کا آئیٹم پیش نہ کیا جائے صرف گانے کی محفل ہو۔

دولہا کا باپ ان کا میزبان تھا لہٰذا میزبان کی بات مان لی گئی۔ اسٹیج پر یکے بعد دیگرے دو گانے والے آئے مگر وہ سامعین کو متاثر نہ کرسکے۔ ان کے بعد انور جمال اسٹیج پر آیا اس نے میر اور غالب کا کلام پیش کیا اس لیے بزرگوں نے بڑھ چڑھ کر داد دی۔ چونکہ اس کی گائیکی کا انداز نیا تھا اس لیے نوجوانوں نے بھی اسے پسند کیا۔ اس میں ایک خوبی اور تھی۔ وہ انچاس برس کا بوڑھا تھا لیکن جوان نظر آتا تھا۔ فکر اور پریشانی ایسی بیماریاں ہیں کہ آج کل کے نوجوانوں کے بال سفید ہوجاتے ہیں لیکن انور جمال کے سر اور

مونچھوں کے سیاہ بالوں کو دیکھ کر پتا چل جاتا تھا کہ وہ فارغ البال ہے۔ نہ کوئی فکر ہوگی نہ وہ بوڑھا ہوگا۔ اس کی بوڑھی جوانی ایسی تھی کہ وہاں بوڑھے اور جوان سب ہی اسے پسند کررہے تھے۔

شبانہ اسٹیج سے ذرا دور ادھر سے ادھر پھدکتی پھر رہی تھی۔ گہرے رنگ کی شلوار قمیص میں اس کی گوری اور گلابی رنگت کھل رہی تھی۔ وہ دوپٹے سے بے نیاز تھی۔ اس کے والدین کے خیال میں ابھی اس کی عمر دوپٹہ پہننے کی نہیں تھی۔ وہ ننھی چڑیا کی طرح پھدکتی ہوئی اسٹیج کے قریب آئی۔ اس وقت تمام لوگ انور جمال کی ایک غزل پر دل کھول کر داد دے رہے تھے۔ شبانہ دوڑتی ہوئی زنان خانے میں صفیہ باجی کے پاس آئی پھر ہانپتے ہوئے بولی۔

"باجی باجی! باہر دولہا بھائی کی خوب تعریف ہو رہی ہے سب لوگ تالیاں بجا رہے ہیں۔"

صفیہ اپنے شوہر کی تعریف سن کر مسکراتی ہوئی بولی۔

"ہاں۔ ان کی آواز یہاں تک آرہی ہے مگر اس شور و غل میں پتہ نہیں چلتا کہ لوگ تعریف کررہے ہیں یا آوازیں کس رہے ہیں۔"

"اب تو چل گیا نا باجی؟"

"ہاں۔ خدا کا شکر ہے۔"

"باجی! میں پھر دولہا بھائی کو دیکھ کر آتی ہوں۔"

وہ دوڑتی ہوئی پھر زنان خانے سے باہر چلی گئی۔ صفیہ کے پاس بیٹھی ہوئی ایک عورت نے پوچھا۔

"صفیہ! تمہاری تو کوئی بہن نہیں ہے پھر یہ لڑکی کس رشتے سے تمہارے میاں کو دولہا بھائی کہتی ہے۔"

صفیہ نے جواب دیا "یہ دور کے رشتے سے خالہ زاد بہن ہیں۔"

"تو پھر اس رشتے سے اسے سمجھاؤ کہ وہ دوپٹہ اوڑھ کر رہے۔ اس کے ماں باپ کہاں ہیں۔"

"ماں کچھ بیمار ہے۔ باپ دبئی میں ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ لے آئی ہوں۔"

"تو دوپٹے میں لپیٹ کرلاتیں....؟"

"آپ تو دوپٹے کے پیچھے پڑ گئی ہیں۔ ابھی وہ معصوم لڑکی ہے جب تک اس میں بچپنا ہے میں اس پر دوپٹے کا بوجھ ڈال کر اسے جوانی کا احساس نہیں دلاؤں گی کہ سینے پر دوپٹہ ڈالو' بدن کا حصہ چھپاؤ۔ دیکھو وہ حصہ جھلک رہا ہے۔ ایسے' بیٹھو' ویسے نہ بیٹھو۔ مرد کی نظروں سے بچ کر رہو۔ تب انہیں اپنے بدن کی تبدیلیوں کی اہمیت کا پتا چل جاتا ہے۔ ہم غیر شعوری طور پر انہیں سمجھا دیتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو چھپا کر کس طرح مرد کی نظروں سے آنکھ مچولی کھیل سکتی ہیں۔"

"اونہہ' رہنے دو بی بی! مجھے نفسیات نہ پڑھاؤ...." وہ عورت دوسری طرف منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔

شبانہ دوڑتی ہوئی اسٹیج کی طرف آئی۔ وہاں سامعین انور جمال کو پھر اسٹیج پر آنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ اس کی غزلیں اور گائیکی کا انداز بہت پسند کیا جا رہا تھا۔ شبانہ نے اپنے قریب کھڑی ہوئی ایک چھوٹی سی بچی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بڑے غرور سے کہا۔

"جانتی ہو۔ یہ میرے دولہا بھائی ہیں میں تو روزانہ ان کا گانا سنتی ہوں۔"

ایسا کہتے وقت اس کے دل میں یہ حسرت پیدا ہوئی کہ کاش یہ سچ مچ دولہا بھائی ہوتے اور اسٹیج پر آکر ساری دنیا سے کہتے کہ شبانہ میری سالی ہے۔ سالی اگر گالی ہے تو بعض اوقات مرد کے ساتھ گالی کے رشتے سے وابستہ ہونے پر بھی فخر سا محسوس ہوتا ہے۔

وہ انور جمال کو دیکھتی رہی اور سوچتی رہی۔ انور جمال ایک بار پھر اسٹیج پر گانے کے لیے آیا۔ لیکن گانا شروع کرنے سے پہلے ہی خسروں کی ٹولی تالیاں بجاتی اور اپنے ناز و انداز دکھاتی قناتوں کے اندر محفل میں آگئی۔ ایک ہیجڑے نے تالی کا ٹھپکا دے کر کہا۔

"اے حضور! شادی مبارک' ہم بھی سہرا گائیں گے۔"

دوسرے نے تالی کا ٹھپکا دیا۔ "ٹھمکے لگائیں گے اور محفل لوٹ لیں گے۔"

انور جمال کا گانا سننے والوں نے زنخوں کو دیکھتے ہی برا سا منہ بنایا اور دھتکار کر بھگانے لگے۔ لیکن خسرے جہاں پہنچتے ہیں کمبل بن جاتے ہیں۔ ایک نے تالی بجا کر کہا۔

"اے ہم بھی عزت والے ہیں۔ تمہاری خوشی میں خوش ہونے آئے ہیں۔"

ایک ہیجڑے نے دوسرے ہیجڑے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اے پھلجھڑی بیگم! یہ ایسے نہیں مانیں گے۔ آؤ ہم سب بہنیں مل کر دہائی دیں گے۔"

"اے دولھے کے ابا۔ ہائے ہائے
اے دولھے کی اماں۔ ہائے ہائے
تیرے بیٹے کا سہرا۔ ہائے ہائے
مرجھائے نہ کھل کے۔ ہائے ہائے
دو دل کی خوشیاں۔ ہائے ہائے
میری جان کی دشمن۔ ہائے ہائے

زنان خانہ سے دولھا کی ماں نے گھبرا کر دولھا کو کے باپ کو بلایا اور کہا۔

"ان خسروں میں سدا سہاگن بھی ہوتی ہیں۔ ان کی ہائے میرے بچے پر پڑے گی۔ آپ فوراً ہی ان کی خوشی پوری کر دیں۔"

عورتوں کو بہت جلدی دعاؤں کے ذریعے بلیک میل کیا جا سکتا ہے۔ خسروں نے اس طرح اپنی بات منوالی۔ انور جمال گیت سنائے بغیر اسٹیج سے اتر آیا تو شبانہ کو بہت دکھ پہنچا۔ اسے خسروں پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ غصے کے ساتھ وہ سوچ رہی تھی۔

"آخر یہ خسرے ہوتے کیا ہیں؟ اماں بی تو کہہ رہی تھیں کہ یہ مرد ہوتے ہیں نہ عورت' ادھر کے نہ ادھر کے ہوتے ہیں۔ ان پر خدا کی مار ہوتی ہے۔"

لیکن اماں بی نے یہ نہیں بتایا کہ جو مرد یا عورت نہیں ہوتے' وہ پھر کیا ہوتے ہیں؟ بزرگوں کی ایسی ادھوری باتیں کچے ذہن میں پکتی رہتی ہیں۔ آدھی رات کے بعد ناچ رنگ کی یہ محفل ختم ہو گئی۔ بہت سے مہمان رخصت ہو گئے۔ اس کے باوجود شادی کا گھر قریبی رشتے داروں سے بھرا ہوا تھا۔ جس کو جہاں جگہ مل رہی تھی وہ وہیں بستر لگا رہا تھا۔ صفیہ کو ایک چھوٹا سا کمرا مل گیا۔ انور جمال نے صفیہ کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"چلو اچھا ہے۔ ہمیں علیحدہ کمرا مل گیا ہے۔"

صفیہ نے ہاتھ چھڑا کر کہا۔

"کچھ تو اپنی عمر کا خیال کریں۔ ہمیں یہ کمرا اپنی بیٹی اور داماد کو دینا چاہیے۔"

انور جمال اپنے اندر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ پھر چادر اور تکیہ لے کر برآمدے کی

طرف جاتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔

"بیٹی داماد' نواسے نواسیاں ہوجانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آدمی خواہ مخواہ بوڑھا بن جائے۔ کیا اس عمر میں سینے کے اندر دل نہیں ہوتا۔ ہوتا ہے کہ نہیں ہوتا۔"

اس سوال کا جواب دینے کے لیے صفیہ موجود نہیں تھی۔ وہ کمرے میں بیٹی داماد' نواسے نواسیوں کے آرام کے لیے بستر لگا رہی تھی۔ ایسے حالات میں یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ مرد اس عمر میں بھی صرف اپنے لیے بستر بچھاتا ہے اور عورت اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد کے لیے رت جگا کرتی ہے۔

برآمدے میں نیم تاریکی تھی وہاں دو چار لوگ اور بھی تھے جو دور تک اپنے خراٹے نشر کررہے تھے۔ بچوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ کیڑے مکوڑوں کی طرح آڑے ترچھے ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے سو رہے تھے۔ وہیں ایک طرف ننگے فرش پر شبانہ پڑی ہوئی تھی۔ اس نے انور جمال کو دیکھ کر کہا۔

"دولہا بھائی! آج تو آپ نے کمال کردیا۔ سب لوگ آپ کی تعریفیں کررہے تھے۔"

انور جمال نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ دبلی پتلی سی لڑکی اپنا سر کھجاتے ہوئے بڑی معصومیت سے اس کی تعریف کررہی تھی۔ اس نے پوچھا۔

"کیا تم غسل نہیں کرتیں؟ تمہارے سر میں جوئیں پڑگئی ہیں۔ اچھی بچیوں کو صفائی کا خیال رکھنا چاہیے۔"

"میں تو ہر روز غسل کرتی ہوں مگر اماں جی کے سر کی جوئیں لگ جاتی ہیں۔ میں جس کے ساتھ سوتی ہوں' اسی کا روگ لگ جاتا ہے۔"

"مگر تم سوتی کب ہو؟ اتنی رات ہوگئی اور اب تک جاگ رہی ہو۔ دیکھو دوسرے بچے کیسے سو رہے ہیں۔ چلو تم بھی سوجاؤ۔"

اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ انور جمال دیوار کی طرف کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس کے سر میں بھی کھجلی ہورہی تھی۔ حالانکہ جوئیں نہیں تھیں لیکن بعض لوگوں کی کھوپڑی اندر سے کھجاتی ہے۔ وہ جس دیوار کی طرف منہ کیے ہوئے لیٹا تھا۔ اس دیوار کی اسکرین پر ایک طوائف مجرا پیش کررہی تھی اور دنیا والے بوڑھوں پر کیچڑ اچھال رہے تھے۔ انہیں جوانی کی دہلیز پر دھکے دے کر باہر پھینک رہے تھے کہ اب

زندگی کی رنگینیوں میں ان کا حصہ نہیں ہے۔

یہ کیسا ظلم ہے؟ کیا انسان بوڑھا ہوجاتے ہی مرجاتا ہے؟ اگر بڑھاپے میں زندہ رہتا ہے تو پھر اس کے جسم کو مردہ کیوں سمجھ لیا جاتا ہے۔ وہ بے چینی سے کروٹ بدلنے لگا۔ دوسری کروٹ پر دیوار نہیں تھی۔ ادھر سے ٹھنڈی ہوائیں آرہی تھیں۔ کھجور کے اونچے درخت خاموش کھڑے تھے صرف ان کے پتے ادھر ادھر جھوم رہے تھے۔ جیسے بڑھاپا خاموش رہتا ہے صرف آرزوؤں کے پتے ہوا دیتے رہتے ہیں۔ بوڑھے برگد کے درخت کی مضبوطی اور پائیداری بھی دیدہ بینا کو سمجھاتی ہے کہ بڑھاپے میں کتنا استحکام ہوتا ہے مگر دنیا سمجھنا ہی نہیں چاہتی۔

وہ پریشان ہوکر اٹھ بیٹھا۔ ہر رات یہی ہوتا ہے۔ صفیہ گہری نیند سوجاتی تھی اور وہ جاگتا رہتا تھا۔ اس کی نظریں بھٹکتی ہوئی شبانہ کی طرف گئیں۔ وہ اپنا سر کھجا رہی تھی انور جمال نے اپنی رسٹ واچ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارے' ابھی تک تم نہیں سوئیں؟ تین بج رہے ہیں۔"

"اوں۔ ہونہہ۔ نیند نہیں آرہی ہے۔"

انور جمال نے برآمدے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھا۔ سب سو رہے تھے نیم تاریکی میں سونے والے صرف سائے کی طرح نظر آرہے تھے۔ وہ اپنی جگہ سے کھسکتا ہوا اس کے پاس آگیا پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"آؤ' میری بانہہ پر سر رکھو' میں سلا دیتا ہوں۔"

وہ بانہہ پر سر رکھتے ہوئے بولی۔

"آپ گانا گا کر......"

"پگلی! گانے کی آواز سن کر سونے والے اٹھ جائیں گے' پھر میری بانہہ پر تمہیں سر رکھے دیکھ کر وہ باتیں بنائیں گے۔"

اس لڑکی نے یہ سوچا ہی نہ تھا کہ بانہہ پر سر رکھنا بری بات ہے۔ انور جمال کی بات نے سر رکھنے کے اس انداز کو پراسرار بنا دیا۔ شبانہ نے آہستگی سے پوچھا۔

"باتیں کیوں بنائیں گے؟"

"آں؟" وہ اس سوال پر ہچکچانے لگا۔

"بتایئے نا؟ آپ تو اتنے اچھے ہیں۔ آپ کی اتنی تعریفیں ہوتی ہیں۔ میرا تو جی چاہتا ہے اسی طرح سر رکھ کر آپ کے پاس لیٹی رہوں۔"

"اگر تمہارا جی چاہتا ہے تو میں تمہیں اسی طرح تھپک کر سلایا کروں گا مگر تم اپنی باجی سے کبھی نہ کہنا کہ۔۔۔۔"

تجسس۔ کہ کیوں نہ کہنا؟

اسرار۔ کہ بند لبوں کے پیچھے کون سا راز چھپا رہے گا؟

سنسنی۔ کہ کسی بھید کی پرورش کرتے رہنے سے دماغ میں کیسی سنسناہٹ سی پیدا ہوتی ہے۔

شبانہ کچھ سمجھے اور نہ سمجھے اور ایک نئی دنیا کے دریافت ہونے کے تحیر میں گم رہی اور یہاں سے وہاں تک رات کی آغوش میں بے حیا سناٹا چھایا رہا۔

وہ گہری نیند سوتی رہی۔ اگر اپنا گھر ہوتا تو وہ صبح سے شام تک سوتی ہی رہ جاتی لیکن وہ شادی والے گھر کے برآمدے میں بچوں کے درمیان فرش پر پڑی تھی اس لیے ملازمہ نے اسے جھنجوڑ کر اٹھایا۔ بڑی دیر تک کسمسانے کے بعد اس کی آنکھ کھل گئی۔ پہلے چند لمحوں تک وہ سوچتی رہی کہ کہاں ہے؟ پھر اس نے جلدی سے سر اٹھا کر دیوار کی جانب دیکھا۔ اب وہاں انور جمال کا بستر نہیں تھا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر برآمدے کے زینے پر بیٹھ گئی۔ باہر لان میں ہریالی تھی۔ رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ پھول تو رنگ برنگ ہوتے ہی ہیں لیکن شبانہ کو پہلی بار پھول کا الگ الگ رنگ اور الگ الگ حسن نظر آرہا تھا۔ لان کے سبزے کی ٹھنڈک آنکھوں میں اتر رہی تھی۔ سورج پچھلے تمام دنوں سے زیادہ روشن تھا اور آسمان کے سائے میں پرندے جیسے پہلی بار پرواز کر رہے تھے۔

یا تو دنیا پہلے اتنی خوب صورت نہیں تھی اور اگر تھی تو پھر اس خوب صورتی کو دل میں اتارنے کے لیے شبانہ کو نئی آنکھیں ملی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی سوچ کا انداز بھی کچھ بدل گیا تھا۔ وہ ہر آہٹ پر چونک کر گزرنے والوں کو دیکھتی تھی مگر وہ نظر نہیں آرہا تھا۔ دماغ کے کسی گوشے میں یہ بات تھی کہ جتنی محبت سے اس نے اسے نیند کی آغوش میں پہنچایا تھا اتنے ہی پیار سے وہ اسے زینے پر سے اٹھانے بھی آئے گا۔

مگر وہ نہیں آیا۔ رات گزرتی ہے تو خواب بھی گزر جاتے ہیں۔ خواب میں آنے والے بھی گزر جاتے ہیں۔ شبانہ کو ڈر لگا کہ پچھلی شب بیداری کہیں خواب نہ ہو۔ وہ سیڑھی سے اٹھ کر دوڑتی ہوئی پاس والے کمرے میں گئی۔ وہاں انور جمال کی بیٹی اپنے بچوں کو کپڑے پہنا رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔

"دولہا بھائی کہاں ہیں؟"

"امی اور ابو اس کمرے میں ہیں؟"

وہ اس کمرے میں دوڑتی ہوئی گئی پھر دروازے پر ٹھٹک گئی۔ اس کی صفیہ باجی، انور جمال کی قمیض میں بٹن لگا رہی تھیں۔ ایک ساعت کے لیے منظر بدل گیا۔ شبانہ نے دیکھا کہ وہ انور جمال کی قمیص کے بٹن لگا رہی ہے۔ دوسرے لمحے صفیہ چونک کر اپنے شوہر سے دور ہو گئی پھر جھینپتے ہوئے بولی۔

"ارے شبانہ! وہاں کیوں کھڑی ہو؟ آجاؤ۔"

انور جمال نے فوراً ہی دروازے کی طرف یوں دیکھا جیسے شبانہ شکایت کرنے آئی ہو۔ لیکن اس کے چہرے پر وہی بچوں کی سی معصومیت تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ ایسے چور بدن کی لڑکی تھی کہ ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں سب ہی اسے بچی سمجھتے تھے۔ انور جمال اس کی ہمت افزائی کے لیے مسکرایا۔ وہ بھی بے اختیار مسکرانے لگی۔ صفیہ نے کہا۔

"تم شاید ابھی تک سو رہی تھیں۔ جاؤ جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر آؤ اور لباس بدل لو۔ ہم ناشتہ کرنے کے بعد اپنے گھر جائیں گے۔"

وہ باتھ روم نہیں جانا چاہتی تھی، دوسرے لفظوں میں انور کو دیکھتے رہنا چاہتی تھی۔ وہ اپنا سر کھجاتے ہوئے بولی۔

"باجی! یہاں تو منجن نہیں ہوگا۔ میں کلیاں کر کے آجاتی ہوں۔"

"اری آئینہ میں اپنا حلیہ تو دیکھ۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے رات بھر خوب پٹائی کی ہے۔ انور جمال نے چونک کر صفیہ کو دیکھا وہ اپنی دھن میں کہتی جا رہی تھی۔

"جو لڑکیاں صاف ستھری نہیں رہتیں، شیطان رات کو آکر انہیں خوب مارتا ہے۔ تمہارا بھی حلیہ ایسا ہی ہے۔ اب جاؤ یہاں سے۔۔۔۔"

انور جمال نے ذرا گھوم کر آئینے میں دیکھا۔ وہ کسی پہلو سے شیطان نظر نہیں آرہا تھا۔ کہتے ہیں کہ شیطان کا کوئی مخصوص چہرہ نہیں ہے۔ اس کا چہرہ بے شمار ذروں میں بکھر کر انسانوں میں تقسیم ہوگیا ہے۔ اسی لیے وہ آئینے میں خود کو نہیں دیکھ سکتا...."

انور نے اپنی بیوی کی زبان بند کرنے کے لیے شبانہ سے کہا۔

مجھے بھی ایسی بچیاں پسند ہیں جو روزانہ غسل کرتی ہیں۔ اپنے سر میں جوئیں نہیں پالتیں۔ بالوں میں کنگھی کرتی ہیں اور چہرے پر کریم پاؤڈر لگا کر گڑیا جیسی بن جاتی ہیں۔"

اس کی باتوں کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ وہ گڑیا بننے کے لیے باتھ روم میں چلی گئی۔

صفیہ نے خوش ہو کر کہا۔

"یہ لڑکی آپ کی بڑی عزت کرتی ہے۔ دیکھئے کس طرح آپ کی بات مان کر چلی گئی۔"

"زندگی کے بعض مقامات پر مجبوراً بزرگ بننا پڑتا ہے۔" اس نے بزرگانہ انداز میں کہا۔

"ابھی بچی ہے۔ تم شیطان کا نام لے کر اسے ڈرا رہی تھیں۔ میں نے پیار سے سمجھایا تو چپ چاپ چلی گئی۔"

آدھے گھنٹے بعد جب وہ میاں بیوی اپنی بیٹی' داماد اور نواسے نواسیوں کے ساتھ ناشتہ کرنے بیٹھے تو وہ لباس بدل کر گیلے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے باتھ روم سے باہر آگئی۔ غسل کرنے کے بعد اس کی گوری رنگت گلابی گلابی سی ہوگئی تھی۔ کالی کالی آنکھیں کاجل کی کٹوریاں لگ رہی تھیں۔ لبوں پر قدرتی گلاب کھلے ہوئے تھے۔ بالوں سے پانی ٹپک کر ہونٹوں تک آیا تو شبنم کے بوجھ سے گلاب کی پتیاں کانپنے لگیں۔

صفیہ نے کہا "آؤ شبانہ جلدی سے ناشتا کرلو۔"

انور جمال کے ایک طرف صفیہ بیٹھی ہوئی تھی۔ دوسری طرف اس کی بیٹی صائمہ تھی۔ شبانہ نے ایک بار پلک جھپک کر دیکھا تو صفیہ کی جگہ وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ انور جمال اپنے ہاتھ سے اسے لقمہ بنا کر کھلا رہا تھا۔ دوسری بار پلک جھپکتے ہی صفیہ اس کی جگہ چھین کر پھر انور جمال کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ منہ پھیر کر کھڑی ہوگئی۔ صفیہ نے پوچھا۔

"کیا ہوا ناشتہ نہیں کرو گی؟"

"نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"عجیب لڑکی ہے۔ کھانے کے وقت نہیں کھاتی۔ اسی لیے تو بدن نہیں پکڑتی۔ چل ادھر آ میرے پاس بیٹھ۔ میں تجھے کھلاؤں گی۔"

وہ پاس آکر بولی "میں دولہا بھائی کے پاس بیٹھوں گی۔"

صفیہ نے ہنستے ہوئے اسے اپنے دولہا بھائی کے پاس جگہ دے دی۔ ایک عورت نادانستگی میں کتنی بڑی قربانی دے دیتی ہے۔ یہ بات صفیہ نہیں سمجھتی تھی۔ اس لیے کہ اس کے سامنے جتنے رشتے تھے' وہ صرف پاکیزہ محبت اور عقیدت کے رشتے تھے۔ شوہر' بیٹی' داماد' نواسے اور نواسیاں حتیٰ کہ شبانہ جس سے خون کا رشتہ نہیں تھا لیکن اپنی بیٹی صائمہ کے سامنے وہ بھی بیٹی جیسی تھی۔

انور جمال کی سوچ کچھ اور تھی۔ اگر انسان اتنی بڑی دنیا میں قدم قدم پر مقدس رشتے بناتا جائے تو تفریحی رشتے کے لیے کوئی نہ رہے گا۔ انسان اپنی مرضی سے لباس بدلتا ہے' زبان کے چٹخارے بدلتا ہے۔ اپنے اندر اور اپنے باہر تبدیلیوں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دروازے کھڑکیوں کے پردے' صوفے' گلدان کے پھول اور زندگی گزارنے کے اصول بدلتا رہتا ہے۔ پھر خواہشات کا تبادلہ کیوں نہیں ہوسکتا؟

بے شک ایک عمدہ مثالی معاشرے کی تکمیل کے لیے اخلاقیات کا پاس رکھنا چاہیے لیکن کوئی ایسی خواہش جو اچانک ہی شب خون مارتی ہے۔ اس کے حملے سے ایک شریف آدمی کیسے بچ سکتا ہے۔ اگر وہ ٹھوکر کھاتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اندھا ہے۔ اس ٹھوکر کے بعد وہ سنبھلنا چاہتا ہے۔ انور جمال نے بھی جب اپنے ایک طرف اپنی بیٹی صائمہ کو اور دوسری طرف شبانہ کو دیکھا تو اسے اوندھے منہ گرنے کا احساس ہوگیا۔

اس نے سوچا۔ ایسی خواہش مذہب اور قانون کے مطابق پوری ہوسکتی ہے۔ وہ دوسری شادی کرسکتا ہے لیکن کیسے کرسکتا ہے؟

شبانہ اور اس کی عمر میں زمین و آسمان کا فاصلہ تھا۔ شبانہ نے ابھی پندرہ برس کی زندگی دیکھی تھی اور وہ آدھی صدی گزارنے والا تھا۔ وہ صائمہ سے بھی دس برس چھوٹی تھی۔ یہ حساب کرتے ہی اسے پسینہ آنے لگا۔ اس نے پریشان ہو کر شبانہ کو دیکھا۔ وہ ناشتے کے دوران اس سے لگی بیٹھی تھی۔ بچہ گود کی گرمی تلاش کرتا ہے یا پھر جس سے

مانوس ہو جاتا ہے' اسی سے چپک کر رہتا ہے۔ بعض اوقات مانوس ہونے کے لیے مختصر سی شناسائی کافی ہوتی ہے۔ انور جمال گھبرا کر اس کے پاس سے اٹھ گیا۔ صفیہ نے کہا۔

"آپ نے تو کچھ کھایا ہی نہیں۔ یہ چائے تو پی لیں۔"

"نہیں بہت گرمی ہے۔ چائے نہیں پیؤں گا۔ یوں بھی دیر ہو رہی ہے۔ میں ٹیکسی لے کر آتا ہوں۔"

چھوٹی نواسی نے ماں کی گود سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"نانا میں بھی تکوں گی۔ (نانا میں بھی چلوں گی)"

انور جمال نے اسے پیار سے پچکارتے ہوئے کہا۔

"باہر دھوپ ہو رہی ہے۔ میں ٹیکسی لے کر آتا ہوں پھر بیٹھ کے چلنا۔"

صفیہ نے کہا "لے جائیے نا۔ بچی ضد کر رہی ہے۔"

شبانہ نے اپنی جگہ سے فوراً ہی اٹھ کر بچی گود میں لیتے ہوئے انور جمال سے کہا۔

"میں اسے گود میں لے کر چلتی ہوں۔ آپ کو تکلیف نہیں ہوگی۔"

اس سے پہلے وہ کوئی اعتراض کرتا۔ وہ بچی کو لے کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ پہلے کبھی وہ اس طرح آگے نہیں جاتی تھی۔ کوئی مصیبت جو ہمارے پیچھے کہیں ہوتی ہے اور آگے آنے کی جرات نہیں کرتی' اسے ہم خود اپنے آگے کر دیتے ہیں۔ وہ سوچتا ہوا باہر آیا۔ شبانہ کوٹھی کے احاطے سے باہر بچی کو گود میں لیے کھڑی تھی اور اسے دور سے آتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ یوں تو وہ پہلے بھی اسے دیکھتی تھی۔ اب یہ فرق پیدا ہو گیا تھا کہ وہ اپنی چیز نظر آتا تھا۔ دل کہتا تھا کہ صرف اسے دیکھتی رہے اور اس کے وجود سے وہ خوشی اور خوشبو تلاش کرتی رہے جسے اس نے ایک بار پایا تھا اور بار بار پانے کی بے چینی تھی۔

وہ قریب آکر بولا۔

"شبانہ تمہیں نہیں آنا چاہیے۔ تمہاری باجی کیا سوچیں گی؟"

وہ خاموش نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر وہی بچوں کی سی معصومیت تھی اور آنکھوں سے ایسا مطالبہ جھلک رہا تھا جیسے اپنا کھلونا مانگ رہی ہو۔ وہ جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ غلطی اس کی اپنی تھی۔ اسے خود سوچنا چاہیے تھا کہ صفیہ کیا سوچے گی اور دنیا کیا کہے گی؟

ذرا دور چل کر وہ سڑک کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ آتی جاتی گاڑیاں تیزی سے گزر رہی تھیں۔ کوئی خالی ٹیکسی نظر نہیں آ رہی تھی۔ شبانہ اس کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ بچی کو دھوپ لگ رہی تھی۔ انور جمال نے بچی کو اپنے بازوؤں میں لے کر سینے سے لگا لیا۔

"اوں ہوں ہوں...." شبانہ کے منہ سے آواز نکلی۔ وہ کبھی بچی کو اور کبھی اس کے چٹان جیسے پھیلے ہوئے سینے کو دیکھ کر بے زبان اداؤں سے کہنے لگی "میں بھی تو بچی ہوں۔ مجھے سینے میں چھپا لو۔"

انور جمال کو بے اختیار اس پر پیار آنے لگا۔ اس نے ایک ہاتھ اس کے شانے پر رکھ کر کہا۔

"شبانہ اب تم بچی نہیں ہو۔"

"کیوں نہیں ہوں۔ اماں بی کہتی ہیں۔ محلے والے کہتے ہیں کہ میں بچی ہوں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ تمہیں ابھی پڑھنا اور کھیلنا چاہیے۔"

"آپ میرے ساتھ کھیلیں گے نا؟"

"آں۔" وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ ایک خالی ٹیکسی کو ہاتھ اٹھا کر رکنے کا اشارہ کرنے لگا۔ جب وہ قریب آکر رک گئی تو شبانہ اس کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"آپ میرے ساتھ بیٹھے رہیں گے نا؟"

"کیسی بات کرتی ہو' یہاں پچھلی سیٹ پر تم' تمہاری باجی اور صائمہ اور توفیق میاں بیٹھیں گے۔ میں اگلی سیٹ پر بیٹھوں گا۔"

"اچھا تو آپ باجی سے کہیں کہ مجھے اپنے گھر لے چلیں۔"

"نہیں' تمہاری اماں بی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تم اپنے گھر چلی جانا۔"

"مگر آپ نے تو کہا تھا کہ مجھے نیند نہیں آئے گی تو آپ سلا دیا کریں گے۔"

وہ ایک ہاتھ کی آستین سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولا۔

"اچھی بچیاں ضد نہیں کرتیں۔ وقت پر خود ہی سو جاتی ہیں۔"

وہ ضد کرتی رہی۔ وہ سمجھاتا رہا اور خود سمجھتا رہا کہ ٹھوکر کھا کر انسان سنبھلتا ضرور ہے مگر ٹھوکر سے لگی ہوئی چوٹ سنبھلنے کے بعد بھی تکلیف پہنچاتی ہے۔ کبھی اس کا زخم

بھر جاتا ہے۔ کبھی ناسور بن جاتا ہے۔ کیا شبانہ کا علاج ہو سکتا ہے؟

شبانہ شاید کبھی ساتھ نہ چھوڑتی لیکن صفیہ اسے اس کی ماں کے پاس چھوڑ کر چلی آئی۔ اماں بی کی طبیعت ٹھیک تھی۔ انہوں نے دوپہر کا کھانا پکالیا تھا لیکن شبانہ نے کھانے سے انکار کردیا تھا۔ جب من مزاج ہی ٹھکانے نہ ہو تو بھوک بھی ٹھیک سے نہیں لگتی۔ ماں نے پوچھا۔

"کیا بات ہے۔ تو چپ چپ سی کیوں ہے؟"

چپ چپ رہنے سے وہ نگاہوں کے سامنے رہتا تھا۔ اماں بی کے بولتے ہی گڑ بڑ ہوجاتی۔ وہ چپکے سے آنے والا بھاگ جاتا تھا۔ وہ جھلا کر بولی۔

"اماں بی! کبھی تو چپ رہا کریں۔ جب دیکھو ٹر ٹر کرتی رہتی ہیں۔"

"یہ لو۔ میں تیرے بھلے کے لیے کھانے کو کہہ رہی ہوں۔"

"مجھے بھوک لگے گی تو خود کھالوں گی۔ خدا کے لیے چپ رہیں۔"

وہ خاموش ہو کر نگاہوں کے سامنے اسے بلانے لگی۔ اپنے تصور میں اس کے وجود کی خوبیوں کو مجسم کرنے لگی۔ وہ پھر سامنے آرہا تھا۔ اتنے میں ماں نے کہا۔

"وقت پر نہ کھانے والی لڑکیاں عمر کے مطابق پھلتی پھولتی نہیں۔ تو بدن نہیں پکڑے گی تو کوئی تجھے پسند بھی نہیں کرے گا۔"

وہ چونک کر اماں بی کو دیکھنے لگی "آں! کوئی پسند نہیں کرے گا؟"

وہ جلدی سے اٹھ کر چولھے کے پاس گئی۔ پھر روٹیوں کا چھابہ سامنے رکھ کر پودینے کی چٹنی سے کھانے لگی۔ نوالہ حلق سے نہیں اتر رہا تھا۔ وہ پانی پی پی کر نگل رہی تھی۔ وہ اپنے لیے نہیں، انور جمال کے سامنے پھلنے پھولنے کے لیے کھا رہی تھی۔ انور جمال نے یہ بھی تو کہا تھا کہ اسے وقت پر سوجانا چاہیے۔ لیکن جب رات آئی تو ہمیشہ کی طرح نیند لے کر نہیں آئی۔

اس کے پاس ایک پرانا کیسٹ ریکارڈر تھا اور کتنے ہی کیسٹ تھے، جنہیں وہ کتنی ہی بار سن چکی تھی لیکن آج وہ گانے والی اس کے دل کی تڑپ کو سمجھ کر رات کے سناٹے میں فریاد کررہی تھی کہ تمام رات تیری یاد ستاتی ہے۔ وہ بستر سے اٹھ کر اس گیت کو دوبارہ سننا چاہتی تھی یا خیالوں میں آنے والے کو سنانا چاہتی تھی مگر اتنے میں دوسرا گانا

شروع ہوگیا۔ کسی مرد کی آواز تھی۔

"جب کوئی کلی چٹکتی ہے۔

"تم بہت یاد آتی ہو....."

وہ یہ تو نہ سمجھ سکی کہ کلی کے چٹکنے سے کسی کی یاد کیسے آتی ہے؟ لیکن اسے یوں لگا کہ انور جمال اسے یاد کررہا ہے۔ وہ بھی اپنے گھر میں جاگ رہا ہے اور اس کی طرح کروٹیں بدل رہا ہے۔ اس نے بستر سے اٹھ کر اس گیت کو بار بار سنا۔ پھر اپنی آواز سنانے لگی کہ ساری ساری رات تیری یاد ستاتی ہے۔ اس گیت کے اختتام پر انور جمال نے پھر کہا "تم بہت یاد آتی ہو....." اسی طرح تمام رات وہ دونوں ایک دوسرے کو اپنی صدا سناتے رہے۔

انور جمال کے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ وہ کیسے رات گزار رہی ہے۔ جب وہ سونے کے لیے آیا تو صفیہ اپنی عادت کے مطابق پہلے ہی سوچکی تھی۔ اسے اپنی جوانی کے دن یاد آگئے جب صفیہ ساری ساری رات اس کے لیے جاگتی تھی۔ اب یہ وقت آگیا تھا کہ وہ رات کے دس بجے ہی سوجاتی تھی۔ وہ شکایت کرتا تو جواب ملتا۔

"آپ اس عمر میں بے شرمی کی باتیں نہ کریں۔ رات سونے کے لیے ہوتی ہے۔"

انور جمال کے دماغ میں پھر لاوا پکنے لگا۔ منفی سوچ ابھرنے لگی۔ اس عمر میں رات صرف سونے کے لیے کیوں ہوتی ہے؟ اصل بات تھکن کی ہے۔ عمر نے صفیہ کو تھکا دیا ہے اس لیے وہ سوجاتی ہے۔ مگر میں تو تازہ دم ہوں۔ تھک کر سونا چاہتا ہوں۔

تب اسے شبانہ یاد آنے لگی۔ حالانکہ دن کے وقت..... اس نے توبہ کی تھی۔ اسے سمجھنا چاہیے تھا کہ جب اپنے گھر کا دروازہ بند ہوجاتا ہے تو دوسرے گھر کے دروازے پر توبہ ٹوٹ جاتی ہے۔ شبانہ کو یاد کرتے وقت کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ اسے اس لڑکی کی والہانہ محبت کی ایک ایک ادا یاد آرہی تھی۔ اس کی اداؤں میں بے حیائی نہیں تھی بلکہ ایسا بچپنا تھا جو حیا کے مفہوم کو پوری طرح نہیں سمجھتا۔ اسے سمجھانے والے نے جو سمجھایا۔ وہی سمجھتی رہی۔

انور جمال بہت دیر تک سوچتا رہا۔ وہ اتنی حسین تھی کہ ایک توبہ کے بعد بھلائی نہیں جاسکتی تھی۔ انور نے صاف طور سے محسوس کیا کہ وہ اسے چاہنے لگا ہے۔ ویسے چاہت

اور دیوانگی میں بڑا فرق ہے۔ وہ شبانہ کی طرح دیوانہ نہیں تھا جب سونے کا وقت آیا تو اپنی عادت کے مطابق سو گیا۔

دوسرے دن اپنے دفتر جاتے وقت اس نے ہوش مندی سے سوچا کہ رات بڑی گمراہ کن ہوتی ہے۔ خواہ مخواہ خیالات کو گمراہ کر کے کہاں سے کہاں لے جاتی ہے۔ اب وہ شبانہ کے متعلق بالکل نہیں سوچے گا۔ رات آئی تو اس کی ہوش مندی سورج کے ساتھ غروب ہو گئی۔ پھر یہ خیال مستحکم ہوا کہ جب تک دل جوان ہے' اسے جوانوں کی طرح جذبات کے سینے میں دھڑکتے رہنا چاہیے۔ مگر یہ سب سوچ ہی سوچ تھی۔ اس نے عملی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ نہ تو اس نے صفیہ سے شبانہ کا کوئی ذکر چھیڑا اور نہ ہی اس کے گھر کا رخ کیا۔

تیسرے دن شام کو صفیہ اس کے گھر گئی تو وہ بخار کی حالت میں بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ صفیہ نے تعجب سے کہا۔

"ارے یہ تو اچھی بھلی تھی۔ یہ بخار کیسے آ گیا؟"

اماں بی نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"بیٹی کیا بتاؤں؟ یہ لڑکی میری سمجھ میں نہیں آتی۔ رات بھر جاگتی اور گاتی رہتی ہے۔ دن کو گھڑی دو گھڑی کے لیے آنکھ بند کرتی ہے پھر چونک کر اٹھ جاتی ہے۔ میں اسے پیر صاحب کے پاس لے جاؤں گی۔"

شبانہ نے انکار میں سر جھٹک دیا۔

"میں نہیں جاؤں گی پیر فقیر کے پاس.... باجی میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔ مجھے اپنے گھر لے چلیں۔"

"اچھی بات ہے۔ میں تمہیں ڈاکٹر کو دکھا کر گھر لے چلوں گی۔"

اماں بی نے احسان مندی سے صفیہ کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"بیٹی تم ہمارا کتنا بوجھ اٹھاؤ گی۔ ہمارے راشن کے لیے پیسے دیتی ہو۔ ہمارے ہر دکھ میں کام آتی ہو۔ اس کا باپ تو دبئی جا کر ہمیں بھول گیا۔ کبھی ایک خط سے بھی خبر نہیں لی۔ میں اس کے باپ کو کہاں تلاش کروں؟ تم نہ ہوتیں تو میں گھبرا کر مر جاتی۔"

صفیہ نے بوڑھی عورت کے شانے کو تھپک کر تسلیاں دیں پھر شبانہ کو ساتھ لے کر

چلی گئی۔ جب شام کو انور جمال گھر میں داخل ہوا تو بستر پر لیٹی ہوئی شبانہ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ بڑھتے ہوئے قدم تو رک گئے لیکن دل کی دھڑکنیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ وہ جوئیں ٹٹولنے کے انداز میں اپنا سر کھجا رہی تھی۔ صفیہ نے کہا۔

اسے کل سے بخار ہے۔ اماں بی بتا رہی تھیں کہ یہ رات بھر جاگتی رہتی ہے۔

انور جمال نے جھینپتے ہوئے شبانہ کو دیکھا۔ شبانہ کی کالی آنکھوں میں کالی رات جاگ رہی تھی۔ اس کی خاموش نگاہیں اس سے کہہ رہی تھیں۔

"آپ نے تو کہا تھا کہ نیند نہیں آئے گی تو آپ سلا دیا کریں گے۔"

وہ ڈر گیا۔ حالانکہ شبانہ کی زبان نہیں کہہ رہی تھی۔ لیکن چور کو دل کی آواز بھی دھماکے کی طرح لگتی ہے۔ اس نے چور نظروں سے صفیہ کو دیکھا۔ وہ بے چاری کیا سمجھتی کہ چوری کس انداز میں ہو رہی ہے۔ انور جمال نے آگے بڑھ کر شبانہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"گھبراؤ نہیں! دوا پی لو۔ جلد اچھی ہو جاؤ گی۔"

شبانہ نے اپنے سر کی طرف ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ کو تھام لیا۔ پھر دوسرے ہاتھ سے سر کھجاتے ہوئے بولی۔

"آپ اپنے ہاتھوں سے مجھے دوا پلائیں گے نا۔"

اس کی محبت بھری التجا سن کر ممتا کی ماری صفیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے کہا۔

"پتہ نہیں اس کے ابا کہاں گم ہو گئے ہیں۔ بے چاری محبت کی بھوکی ہے۔ کیا آپ شیخ صاحب کا پتہ نہیں لگا سکتے؟"

"بہت مشکل ہے شیخ صاحب نے کسی سے مشورہ نہیں کیا۔ شبانہ اور اماں بی کے زیورات بیچ کر نہ جانے کس ایجنسی کے ذریعے دبئی چلے گئے۔ کیا پتہ کہ وہ دبئی پہنچے بھی ہیں یا نہیں۔ اگر کوئی جان پہچان والا دبئی سے آیا تو اس سے پوچھیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں آیا اور لباس بدلنے لگا۔ صفیہ نے آ کر بڑی رازداری سے کہا۔

"میں شبانہ کو لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھی۔ ڈاکٹر کرید کرید کر اس کی عمر پوچھ

رہی تھی کہ اس کی عمر کیا ہے؟ یہ بالغ ہے یا نہیں؟ ساری رات کیوں جاگتی ہے۔ کیا سوچتی رہتی ہے؟ میرا خیال ہے کہ وہ اپنے ابا کو یاد کرتی رہتی ہے۔"

انور جمال نے جھلا کر پوچھا۔

"کیا تمہیں الہام ہوا ہے کہ وہ اپنے ابا کو یاد کرتی ہے۔ تم اتنا نہیں سمجھتیں کہ لیڈی ڈاکٹر اس کی عمر اور بلوغت کے بارے میں کیوں پوچھ رہی تھی۔ اگر تم بیٹیوں اور نواسیوں والی ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تمام دنیا کی لڑکیوں کو ننھی بچیاں سمجھتی رہو۔"

صفیہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"آپ ناراض کیوں ہو رہے ہیں۔ کم عمر بچوں کو ہم بچے ہی کہیں گے۔"

"صفیہ بیگم! تم مجھ سے آٹھ برس چھوٹی ہو پھر کیوں نہ میں تمہیں بھی بچی ہی سمجھوں۔"

صفیہ کو ہنسی آگئی۔ انور جمال بھی یہ سوچ کر مسکرانے لگا کہ چلو گفتگو کا ایک خطرناک موضوع ٹل گیا ہے۔ ایک گھنٹے بعد کھانے کی میز پر صفیہ نے کہا۔

ڈاکٹر نے شبانہ کو دودھ اور ڈبل روٹی کھانے کے لیے کہا ہے مگر وہ کھانے سے انکار کر رہی ہے۔ آپ ذرا بہلا پھسلا کر اسے کھلا دیں۔"

وہ اپنا کھانا ختم کر کے دودھ اور ڈبل روٹی لے کر اس کمرے میں چلا گیا جو شبانہ کے لیے مخصوص ہو گیا تھا۔ صفیہ اس دوران باورچی خانے میں مصروف رہی۔ آدھے گھنٹے بعد انور جمال خالی برتن لے کر واپس آیا تو صفیہ نے خوش ہو کر کہا۔

"میں پہلے ہی جانتی تھی کہ وہ پیٹ کی نہیں محبت کی بھوکی ہے۔ آپ کے ہاتھ سے کھا لے گی۔"

انور جمال نے پوچھا "اسے دوا کی دوسری خوراک کب دو گی؟ مجھے تو نیند آ رہی ہے۔ میں سونے جا رہا ہوں۔"

"آپ سو جائیں۔ میں اسے دوا پلانے تک جاگتی رہوں گی۔"

انور جمال چلا گیا۔ جب وہ کام ختم کر کے اپنے شوہر کے پاس آئی تو وہ آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ وہ بھی تھکے انداز میں بستر پر گرتے ہوئے بولی۔

"میں جانتی ہوں۔ آپ اتنی جلدی نہیں سوتے ہیں۔"

وہ آنکھیں کھول کر مسکراتے ہوئے بولا۔

"میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم شبانہ کے لیے کس طرح جاگتی ہو۔"

"تو یہ ہے۔ مجھے زور کی نیند آ رہی ہے اور دوا ایک گھنٹے بعد پلانی ہے۔"

ایک گھنٹہ بہت ہوتا ہے۔ وہ شروع سے نیند کی کچی تھی۔ بیس منٹ کے بعد ہی گہری نیند سو گئی۔ انور جمال نے اسے ایک دو بار آواز دی پھر مریضہ کو دوا پلانے چلا گیا۔

دوسرے دن شبانہ کا بخار اتر گیا۔ وقت اور حالات لڑکیوں کو اپنی عمر سے زیادہ چالاکی سکھا دیتے ہیں۔ شبانہ کے دماغ میں یہ بات آئی کہ طبیعت ٹھیک ہو جائے گی تو صفیہ باجی اسے گھر بھیج دیں گی یا اماں بی آکر لے جائیں گی اس لیے اس نے کمزوری کا بہانہ کیا۔ صفیہ نے ڈاکٹر کے پاس چلنے کے لیے کہا تو وہ بولی۔

"کیسے چلوں بستر سے اٹھتی ہوں تو سر گھومنے لگتا ہے۔"

وہ اپنا سر کھجانے لگی۔ سر گھومے یا نہ گھومے جوئیں سر پر ضرور گھومتی تھیں۔ صفیہ اسے چھوڑ کر ڈاکٹر کے پاس گئی اور اسے مریضہ کا حال بتا کر دوا لے آئی۔ دو روز تک خود ساختہ کمزوری کا علاج ہوتا رہا پھر پیٹ میں درد شروع ہو گیا۔ اس طرح اس نے ایک ہفتہ وہاں گزار لیا۔ ایک دن اماں بی آکر اسے زبردستی لے گئیں۔

اس کے جانے کے بعد صفیہ نے اپنے شوہر کے پاس آکر اسے جھنجھوڑتے ہوئے اٹھایا۔

"اب اٹھ بھی جائیے۔ آج کل آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ اپنی عادت کے خلاف دن چڑھے تک سوتے رہتے ہیں؟"

انور جمال نیند میں جواب تو نہ دے سکا البتہ اپنا سر کھجانے لگا۔ اسی لمحے صفیہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کے سرتاج کے سر میں سے دو موٹی موٹی جوئیں گر کر تکیے کے سفید غلاف پر گری تھیں اور بڑے آرام سے چہل قدمی کر رہی تھیں۔

صفیہ کا دماغ غصے کے آخری درجہ حرارت سے کھول رہا تھا پھر بھی اس نے یہ سوچ کر تحمل سے کام لیا کہ پہلے جوؤں کے متعلق تفتیش کرنا چاہیے۔ جب انور جمال دفتر چلا گیا تو وہ غور کرنے بیٹھ گئی۔ پہلا سوال یہ تھا جوئیں کہاں سے آئیں؟"

صفیہ کا جواب تھا "میرے سر میں جوئیں نہیں ہیں اور دفتر میں کسی کے ساتھ سر جوڑ کر نہیں بیٹھتے۔ یہ شبانہ کے سر کی جوئیں ہیں۔"

دوسرا سوال تھا "ایک سر کی کھجلی دوسرے سر میں کیسے منتقل ہوتی ہے؟"

صفیہ نے پہلے تو خود کو دلاسہ دیا کہ تکیہ بدل گیا ہوگا مگر اس کمزور دلاسے نے سہارا نہیں دیا کیونکہ جب تک شبانہ وہاں رہی، ہر ایک کا تکیہ اپنے اپنے بستر پر رہا۔ بے جان تکیہ اپنی جگہ خود نہیں بدل سکتا۔ آدمی کا سر اور اس کی سوچ اپنی جگہ بدل سکتی ہے۔

ایک بیوی یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کے سر تاج کا سر کسی دوسری کے لیے کھجلائے۔ وہ غصے میں گھر سے نکلی، دروازے پر تالا ڈالا پھر سیدھی شبانہ کے پاس پہنچ گئی۔ وہاں کیسٹ ریکارڈر بج رہا تھا۔

"نہ جھٹکو زلف سے پانی۔ یہ موتی ٹوٹ جائیں گے....."

شبانہ فرش پر بیٹھی زلفوں کو جھٹکنے کے بعد کنگھی کر رہی تھی اور جوئیں موتی کی طرح سر سے ٹپک رہی تھیں۔ وہ صفیہ کو دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور خوش ہو کر بولی۔

"ہائے باجی! میں آپ ہی کو یاد کر رہی تھی۔ یہاں میرا دل نہیں لگتا۔ آپ مجھے اپنے پاس لے جائیں۔"

صفیہ ایسی ہی بچوں والی ضد سے مجبور ہو کر اسے اپنے ساتھ لے جایا کرتی تھی۔ اب یہ انکشاف ہو رہا تھا کہ وہ بالشت بھر کی چھوکری سے کیسا دھوکا کھا رہی تھی۔ وہ غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"یہاں تمہارا دل نہیں لگتا۔ وہاں تمہارے دولہا بھائی کا دل نہیں لگتا۔ وہ تمام رات تمہیں یاد کرتے ہیں اور کروٹیں بدل بدل کر صبح کر دیتے ہیں۔"

شبانہ یہ سن کر بہت خوش ہوئی کہ وہ اس کی یاد میں جاگتا ہے اور یہ سوچ کر دکھ بھی ہوا کہ پہلے جو آرام سے سوجاتا تھا، اب اسے نیند نہیں آتی۔ وہ بے اختیار بولی۔

"وہ مجھے سلایا کرتے تھے۔ انہیں میری جاگنے والی بیماری لگ گئی ہے۔ اب میں انہیں....."

وہ کہتے کہتے رک گئی پھر سوچ کر بولی۔

"مگر میں کچھ نہیں کہوں گی۔ انہوں نے کہا تھا کہ اپنی باجی کو کچھ نہ بتانا۔"

صفیہ نے جبراً مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم کیا بتاؤ گی۔ انہوں نے خود ہی مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔"

"سچ باجی؟ مگر وہ تو کہہ رہے تھے کہ آپ کو معلوم ہوگا تو آپ غصہ کریں گی۔"

"واہ، مجھے غصہ آتا تو کیا میں تمہارے پاس آتی؟"

"ہائے باجی آپ کتنی اچھی ہیں۔"

وہ خوش ہو کر اس سے لپٹ گئی۔ صفیہ کو یوں لگا جیسے ایک شعلہ اس سے لپٹ گیا ہو اور اسے اپنی لپیٹ میں لے کر اس کے گھر کو پھونک ڈالنے والا ہو۔ اس نے بڑے تحمل سے اسے پرے ہٹا کر کہا۔

"اب گھر چلو۔ میں انہیں فون کر دوں گی کہ تم واپس آگئی ہو۔"

اس روز شام کو انور جمال مقررہ وقت سے پہلے ہی گھر آگیا۔ صفیہ سر میں رومال دھے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ انور جمال ادھر ادھر دیکھتا ہوا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر بولا۔

"تم نے فون پر کہا تھا کہ شبانہ واپس آگئی ہے۔ کہاں ہے وہ؟"

صفیہ نے کہا "میں نے فون پر یہ بھی تو کہا تھا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میرے سر پر پٹی بندھی دیکھ کر بھی آپ نے میرا حال نہیں پوچھا اور جو نظر نہیں آ رہی ہے اسے پوچھ رہے ہیں۔"

"صفیہ! کیا آج تم نئی بن گئی ہو۔ تم نہیں جانتیں کہ پہلے میں جوتے اتارتا ہوں۔ لباس بدلتا ہوں پھر تمہارے پاس آکر اطمینان سے باتیں کرتا ہوں۔ شکایت کرنے سے بہتر تھا کہ ذرا انتظار کر لیتیں۔"

"بس رہنے دیجئے جسے دیکھنا چاہتے ہیں، اسے بلا دیتی ہوں....."

اس نے شبانہ کو آواز دی۔

"میں اسے دیکھنا چاہوں گا! کیوں..... آج تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟" انور جمال نے کہا۔

"آج ہی تو سچی باتیں کر رہی ہوں۔ آپ بھی سچ بتا دیں کہ اس لڑکی سے آپ کا اور کیا رشتہ ہے۔"

"اں۔" اس نے گھبرا کر کہا "کچھ نہیں..... بھئی وہ ایک معصوم بچی ہے۔"

"ہاں ایسی ہی معصوم ہے جیسے آپ ہیں۔"

اتنے میں شبانہ کمرے میں آ گئی۔ اس نے انور جمال کو دیکھتے ہی صفیہ سے کہا۔

"باجی! آپ نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ انور صاحب آج وقت سے پہلے گھر آ جائیں گے۔"

انور جمال نے حیرانی اور پریشانی سے کہا۔

"اے تم مجھے انور صاحب کیوں کہہ رہی ہو؟"

شبانہ نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے بے باکی سے کہا۔

"آپ نے باجی کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس لیے باجی کہتی ہیں کہ اب میں آپ کو دولہا بھائی نہ کہوں۔"

انور جمال کو ایک ساعت کے لیے یوں لگا جیسے جسم کا تمام خون خشک ہو گیا ہو۔ اس نے مجرم کی طرح نظریں اٹھائیں تو صفیہ اسے گھور کر دیکھ رہی تھی۔ صبح سے اس کے دل میں پکنے والا لاوا پھٹ پڑا۔ وہ غصے سے کانپتے ہوئے بولی۔

"آپ مجھے اس طرح دیکھ کر یہ تاثر دے رہے ہیں کہ آپ شرمندہ ہیں۔ کیا آپ کو اس وقت شرم نہیں آئی تھی جب آپ نے پہلی بار بے شرم ہو کر اس لڑکی کو ہاتھ لگایا تھا؟ کیا آپ نے اپنی اور اس کی عمر کا بھی حساب نہیں کیا؟ آپ نے اس کی بھی پروا نہیں کی میرے دل پر کیسی قیامت گزرے گی؟"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شبانہ کی سمجھ میں آ گیا کہ صفیہ اس سے حقیقت اگلوانے کے لیے اسے یہاں لائی ہے اور اب ان کی چوری کھل کر سامنے آ گئی ہے۔ اسے پہلے تو ڈر لگا پھر اس نے سوچا۔

"ڈرنے کی کیا بات ہے۔ انور صاحب تو میرے ہیں۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ جب بھی مجھے نیند نہیں آئے گی تو وہ مجھے سلا دیا کریں گے۔"

اس نے سہارا پانے کے لیے انور جمال کی طرف دیکھا۔ وہ ایک مجرم کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر صفیہ کے پاس گیا۔ شبانہ کے دل کو ٹھیس پہنچی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ اس کے پاس آئے گا لیکن وہ تو رونے والی کے آنسو پونچھنے جا رہا تھا۔ صفیہ نے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا۔

"ان ناپاک ہاتھوں کو مجھ سے دور رکھیں۔ مجھے آپ کی ہمدردیاں نہیں چاہئیں۔"

"صفیہ! مجھے معاف کر دو تم جس طرح کہو گی۔ میں اس غلطی کی تلافی کروں گا۔"

"آپ جھوٹ کہتے ہیں۔ جب تک یہ راز نہیں کھلا تھا آپ اپنی غلطی کو جائز سمجھ کر مجھے دھوکا دیتے رہے۔ اب آپ کس غلطی کی تلافی کریں گے؟"

میں اپنے گھر کے ماحول کو پرسکون اور خوش گوار بناؤں گا۔ اب شبانہ یہاں کبھی نہیں آئے گی۔"

شبانہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ روتے ہوئے بولی۔

"میں آؤں گی۔ باجی! میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟ میں تو صرف سونے کے لیے آتی ہوں اگر نہیں آؤں گی تو نیند نہیں آئے گی۔"

صفیہ نے غصے سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"چپ بے شرم' بدذات۔ سونے کی بات ایسے کرتی ہے جیسے کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ کیا تو نہیں جانتی کہ یہ گناہ ہے؟"

اس نے بڑی معصومیت سے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

"نہیں باجی! انور صاحب نے مجھے یہی بتایا ہے کہ محبت میں جو کچھ ہوتا ہے' اسے گناہ نہیں کہتے....."

انور نے جلدی سے بات کاٹ کر کہا۔

"شبانہ تم کیا الٹی سیدھی باتیں کر رہی ہو۔ میں نے کب ایسا کہا تھا؟"

صفیہ نے کہا "آپ خاموش رہیں..... ہاں تو شبانہ انہوں نے اور کیا سمجھایا تھا؟"

"یہ بہت اچھے ہیں باجی۔ ان کی باتیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ اسی لیے میں ان کی ہر بات مان لیتی ہوں۔ پیار کرنے والے لوگ تو اچھے ہوتے ہیں۔ آپ بھی مجھے پیار کرتی ہیں تو یہ گناہ تو نہیں ہوتا۔ انور صاحب بھی پیار کرتے کرتے مجھے سلا دیتے ہیں۔ اچھی باجی آپ اسے گناہ کیوں کہتی ہیں؟"

یہ معصوم سا سوال صفیہ کے دل میں اتر گیا۔ اتنی دیر بعد اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ غصے میں ایک معصوم لڑکی سے لڑ رہی ہے جسے کسی نے اب تک ایک مرد کی قربت کی اونچ نیچ نہیں سمجھائی ہے۔ جب وہ تیرہ برس کی تھی تو باپ اسے ادھوری شفقت سے آشنا

کر کے دبئی چلا گیا۔ اماں بی دو برس سے اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ بیٹی کی طرف دھیان نہ تھا۔ اکثر مائیں بیٹیوں کی طرف سے غافل رہتی ہیں۔ ان کی معصومانہ سوچ کو نہیں سمجھتیں کہ زندگی کے موڑ پر کوئی اچانک آئے گا اور گناہ کو محبت کے خوب صورت غلاف میں لپیٹ کر ان کی معصومیت سے کھیلتا رہے گا۔"

صفیہ بھی جوان بیٹی کی ماں تھی۔ اس نے ممتا کے ترازو میں شبانہ کو تولا تو ترازو کی ڈنڈی مارنے والا مجرم انور جمال نکلا۔ وہ شبانہ کو سینے سے لگا کر بھینچتے ہوئے بولی۔

"تمہارا قصور نہیں ہے۔ میں ناحق تم پر ناراض ہو رہی تھی۔ مگر شبانہ! اب تم کو اچھی لڑکیوں کی طرح اچھے برے کی تمیز کرنا چاہیے۔ اب تک جو کچھ ہوا، برا ہوا۔ اسے بھول جاؤ۔ چلو میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔"

"اوں ہوں۔ باجی۔ مجھے وہاں نیند نہیں آئے گی۔"

"پھر وہی بات۔ کیا تم اچھی لڑکی نہیں بنو گی؟ چلو یہاں سے....."

وہ اس کا بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے لے گئی۔ انور جمال نے سر اٹھا کر اسے جاتے ہوئے نہیں دیکھا لیکن اس کی آواز کانوں میں گونج رہی تھی کہ اسے نیند نہیں آئے گی۔ وہ تھکے ہوئے انداز میں بستر پر گر پڑا اور اپنے دل کو سمجھانے لگا کہ بات کھل گئی تو کیا ہوا؟ یہ بات بیوی تک محدود رہے گی اور وہ آئندہ ایسی غلطیوں سے بچتا رہے گا۔

صفیہ نے اسے گھر پہنچایا پھر اماں بی کے پاس آ کر بولی۔

"اماں بی، آپ کب تک اپنے شوہر کا انتظار کرتی رہیں گی۔ آپ کو شبانہ کی فکر کرنی چاہیے۔ اب وہ ننھی بچی نہیں ہے کہ باپ کے انتظار میں بیٹھی رہے۔"

اماں بی نے بڑے تعجب سے پوچھا۔

"کیوں بیٹی! کیا شبانہ سے کچھ اونچ نیچ ہو گئی ہے۔"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے مگر سمجھنے سے کوئی بات سمجھ میں آتی ہے۔ آخر یہ راتوں کو جاگتی کیوں ہے۔ کیا سوچتی رہتی ہے۔ لیڈی ڈاکٹر نے بھی مشورہ دیا ہے کہ اس کی شادی جلد ہی کر دی جائے۔"

شبانہ دوسرے کمرے سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اب ہر بات اس کی سمجھ میں آ جاتی تھی کہ اس کی شادی کے مشورے کیوں ہو رہے ہیں؟ اسے انور جمال سے چھڑا کر

کسی اور کے پالنے میں ڈالا جائے گا تاکہ وہاں نیند آ جایا کرے۔ اس میں صفیہ باجی کا بھی فائدہ تھا۔ وہ جھوٹ موٹ لیڈی ڈاکٹر کا حوالہ دے کر شادی کی جلدی کر رہی تھیں۔

اس کے تصور میں کتنے ہی دولہا سہرا باندھ کر آئے لیکن وہ انور جمال جس کے سر پر سہرا نہیں تھا، وہی سب سے اچھا لگ رہا تھا۔ وہ دروازے پر آ کر بولی۔

"باجی! میں شادی نہیں کروں گی..... نہیں کروں گی..... کبھی نہیں کروں گی۔"

اس سے پہلے کہ صفیہ کچھ کہتی۔ اس نے زوردار آواز کے ساتھ دروازہ بند کر دیا۔

کچھ دنوں کے لیے صفیہ اور انور جمال کے درمیان سے شبانہ کی دیوار ہٹ گئی۔ اس کے باوجود میاں بیوی کے اعتماد والا رشتہ کمزور پڑ گیا۔ اگر انور کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتا تو صفیہ کو شبہ ہوتا کہ وہ شبانہ کی یاد میں کھویا ہوا ہے۔ وہ طنزیہ لہجے میں پوچھتی۔

"کیا وہ بہت یاد آ رہی ہے؟"

"آں۔ کون؟" وہ خیالات سے چونک کر پوچھتا پھر بیگم کا طنز سمجھ جاتا۔

"صفیہ! سوچنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی کو یاد کیا جا رہا ہے۔ میں اپنے کاروبار کے متعلق سوچ رہا ہوں۔"

اس نے صفیہ سے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ وہ سچ مچ کاروبار کے متعلق سوچ رہا تھا۔ سوچ کا سلسلہ کچھ یوں ہوتا تھا۔

"ہماری سگریٹ کی مانگ دن بدن بڑھتی جا رہی ہے لیکن صرف مانگ بڑھنے سے کچھ نہیں ہوتا، دام بھی بڑھنے چاہئیں۔ اگر ہم سگریٹ کی سپلائی روک دیں تو لوگ بازار میں سگریٹ تلاش کرتے پھریں گے۔ پھر ہم دام بڑھا کر سپلائی بڑھائیں گے تو منافع میں اضافہ ہو جائے گا۔ ایسا صرف کاروبار میں نہیں ہوتا۔ سماج میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ بوڑھوں کی زندگی میں اس دنیا کے حسن اور رنگینیوں کی سپلائی روک دی جاتی ہے۔ ایسے میں جس بوڑھے کی قوت خرید زیادہ ہوتی ہے، وہ سماج کے چور دروازے سے کوئی خوب صورتی خرید لیتا ہے۔ خریدنے کے لیے پیسہ ضروری نہیں ہوتا۔ میں نے تو شبانہ کے آگے نیند کا سکہ پھینک کر اسے حاصل کر لیا ہے۔ جب میں نے شادی کے گھر والے برآمدے میں اسے بچوں کے درمیان لیٹے ہوئے دیکھا۔ جب میں کھسک کر اس کے پاس گیا۔ جب میں نے اسے زانو پر سلا دیا۔ جب میں نے اسے یہ کہا۔ جب میں نے....."

وہ سوچتے سوچتے چونک جاتا۔ کیونکہ وہ تو کاروبار کی باتیں سوچ رہا تھا پھر شبانہ کیسے ہیرا پھیری سے اس کی سوچ میں آجاتی تھی؟ صفیہ کا شبہ درست تھا اور انور سچا تھا کہ وہ کام کی باتیں سوچتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ شبانہ بھی آپ ہی آپ کام کی بات بن جاتی تھی۔

انور جمال کی کار ورکشاپ سے آگئی تھی۔ ایک صبح وہ دفتر کی طرف جارہا تھا۔ اپنے گھر سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر گول چکر کے پاس شبانہ نظر آئی۔ وہ ہاتھ اٹھا کر گاڑی روکنے کا اشارہ کررہی تھی۔ انور نے قریب پہنچ کر گاڑی روکتے ہوئے پوچھا۔

"تم یہاں کیا کررہی ہو؟"

وہ کار کا اگلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ پتا نہیں وہ کب سے دھوپ میں کھڑی انتظار کررہی تھی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ سیاہ آنکھیں وحشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ ایسے دیکھ رہی تھی جیسے بلی چھینکے کی جانب حسرت ویاس اور اضطراب سے دیکھتی ہے۔ اس نے تھکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"آپ یہ کیوں پوچھتے ہیں کہ میں یہاں کیا کررہی تھی۔ آپ خود کیوں نہیں سمجھتے....."

"آں۔ ہاں۔ سمجھ گیا۔ تم میرا انتظار کررہی تھیں۔"

"آج ہی نہیں، میں روز انتظار کرتی ہوں۔ پہلے میں یہاں فٹ پاتھ پر کھڑی رہتی تھی مگر آپ تیزی سے کار چلاتے ہوئے گزر جاتے تھے۔ جب آپ نے پانچ دنوں تک میری طرف نہیں دیکھا تو میں ادھر کھڑی ہوگئی تھی۔ آپ کو دیکھتے ہی ہاتھ ہلاتی تھی۔ ایک ہفتے بعد سمجھ میں آیا کہ آپ گاڑی موڑتے وقت سیدھے راستے کی طرف دیکھتے ہیں۔ اس لیے آج میں گول چکر کے پاس کھڑی رہی کیونکہ گاڑی موڑنے سے پہلے گول چکر سامنے آجاتا ہے۔"

انور جمال اس کی باتیں سن رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ دو ماہ تک دور رہنے کے باوجود وہ اس لڑکی کے دماغ سے نہ مٹ سکا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی پھر ایک ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولا۔

"یہ پاگل پن ہے۔ تم تنہا وہاں کھڑی رہتی تھیں۔ لوگ کیا سوچتے ہوں گے؟"

"آپ لوگوں کے بارے میں سوچتے ہیں۔ میرے بارے میں کچھ نہیں سوچتے؟"

اس نے اعتراف کیا "ہاں سوچتا ہوں۔ نہ سوچتا ہوں تب بھی تمہارے متعلق سوچتا چلا جاتا ہوں۔"

"سچ؟" وہ خوش ہوگئی "پھر آپ مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے؟"

"کیسے آسکتا ہوں۔ صفیہ کو معلوم ہو جائے گا تو گھریلو زندگی عذاب ہو جائے گی۔"

"باجی کو نہیں معلوم ہوگا۔"

"نہیں شبانہ! تمہاری اماں بی بتا دیں گی۔ پھر محلے والے بھی سوچیں گے کہ پہلے میں بیوی کے ساتھ بھی تمہارے گھر نہیں آتا تھا۔ اب تنہا کیوں آتا ہوں؟"

وہ اپنا سر کھجاتے ہوئے بولی۔

"میں کچھ نہیں جانتی۔ آپ کہیں بھی ملیں۔ مجھے نیند نہیں آتی ہے۔ میں کل رات بھی نہیں سوئی ابھی تک جاگ رہی ہوں۔"

انور جمال کے دل میں اس کے لیے محبت اور ہمدردی کے جذبات مچلنے لگے۔ اس نے عہد کیا تھا کہ آئندہ غلطی نہیں کرے گا۔ یہ بھی ایک غلطی ہوتی کہ وہ اسے راتوں کو جاگنے اور دن کو اپنی راہ پر بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا۔ اس بے چاری کا کیا قصور تھا۔ وہ تو پیار کی پیاسی تھی۔ ایک ایک بوند کے لیے اس کے پاس پھڑپھڑا رہی تھی۔

انور نے کولڈ اسپاٹ کے سامنے گاڑی روک دی۔ ملازم آرڈر لینے آیا تو اس نے کہا۔

"کوک لے آؤ....."

ملازم نے شبانہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"صاحب بے بی کے لیے آئس کریم لے آؤں؟"

"لے آؤ۔" یہ دو لفظ کہتے وقت انور کا گلا خشک ہوگیا۔ جب آئس کریم اور ٹھنڈی بوتل آگئی تو اس نے ایک گھونٹ پی کر کہا۔

"شبانہ! ملازم تمہیں بے بی کہہ رہا تھا۔ وہ کیا سب ہی تمہیں بچی کہیں گے۔ میں بہت عمر والا آدمی ہوں۔ تمہیں کسی نوجوان سے محبت کرنی چاہیے۔"

"محبت کیسے کروں؟ میں نے تو آپ سے بھی محبت نہیں کی تھی۔ یہ تو آپی آپ ہوگئی

اور کسی سے آپی آپ نہیں ہوتی۔"

"تم کوشش تو کرو۔"

"میں نے کی تھی مگر نہیں ہوئی۔"

"کب؟" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

"جب باجی نے آپ سے الگ کر دیا تو میں روز اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس بیٹھ کر آپ کا انتظار کرتی تھی اور ایک نوجوان مجھے دیکھتا رہتا تھا۔ پہلے تو میں نے غصہ دکھایا پھر چپل دکھائی مگر وہ باز نہ آیا۔ کتنے ہی رت جگوں کے بعد میں نے سوچا۔ آپ باجی سے ڈرتے ہیں اور یہ نوجوان کسی سے نہیں ڈرتا۔ یہ ساری زندگی ساتھ نبھائے گا۔ میری سوچ بدلی تو میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی تو ایک رات وہ میرے پاس آ گیا۔"

انور جمال نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے رقابت سے پوچھا "پھر؟"

"پھر کیا۔ میں نے اس کے بازوؤں کو چھو کر دیکھا۔ وہ آپ کے جیسے نہیں تھے۔ میں نے اس کے سینے پر سر رکھا لیکن آپ کی مہک نہیں مل رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے آپ کا تصور کیا پھر بھی ایسا لگا کہ مجھے بھیک مانگنے پر کھوٹا سکہ مل رہا ہے۔ میں نے اسے زور کا دھکا دے کر کہا۔ تمہیں میرے گھر آنے کی جرات کیسے ہوئی اگر خیریت چاہتے ہو تو بھاگ جاؤ۔ ورنہ ابھی شور مچاتی ہوں۔ میرے تیور بدلتے دیکھ کر وہ کھڑکی سے کود کر بھاگتا چلا گیا...."

انور جمال دل کھول کر یوں ہنسنے لگا جیسے دماغ سے بوجھ اتر گیا ہو۔ یہ سوچ کر کتنی مسرت اور کتنا فخر محسوس ہوتا ہے کہ یہ جو سامنے بیٹھی ہے' سر سے پاؤں تک ہماری ہے۔ اسے کوئی نہیں چرا سکتا۔ یہ ہماری جاگیر ہے۔ صرف یہی نہیں۔ دنیا کی ہر چیز کو اپنی جاگیر اور جائداد بنا کر رکھنے کا دستور بہت پرانا ہے۔ اپنا بنا کر برتنے میں یہ خوشی ہوتی ہے کہ ایسی انمول چیز اور ایسا بے مثال ماڈل کسی دوسرے کے پاس نہیں ہے۔

انور جمال کے دل نے سمجھایا کہ اس عمر میں ایسی کم سن حسین محبوبہ نصیب سے ہی ملتی ہے۔ یعنی شبانہ جیسی پیار کی دیوانی جو راتوں کو اس کے لیے جاگتی ہے۔ دن کو اس کی تلاش میں بھٹکتی رہتی ہے۔ اس کی یاد میں بھوکی رہتی ہے۔ اس کی جدائی میں سنگار نہیں کرتی اور اس کے لیے بچپن کو چھوڑ کر پھول جیسی جوانی کے کانٹوں بھرے راستے پر آ گئی

ایسے وقت وہ اس کے راستے سے کانٹے نہ چنتا تو پھر اس شکایت کا بھی حقدار نہ ہوتا کہ بوڑھوں کو اس دنیا کی خوب صورتی میں حصہ نہیں ملتا ہے۔

وہ شبانہ کو اپنے دفتر میں لے آیا۔ اپنے چپراسی کو سمجھا دیا کہ کوئی ملنے آئے یا ٹیلی فون آئے تو کہہ دینا کہ آج صاحب دفتر نہیں آئیں گے اور جنرل منیجر سے بھی کہہ دیتا کہ ضروری کام وہ خود نمٹا لے اور اسے ڈسٹرب نہ کرے۔ اس طرح باہر کی دنیا سے رابطہ ختم کر کے اس نے اپنے ایر کنڈیشنڈ دفتر کی دنیا کا دروازہ بند کر لیا۔

اس دن سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کبھی دفتر کبھی ہاکس بے اور کبھی ڈرائیو ان سینما اور ہر وہ جگہ جہاں دو دلوں کے درمیان کوئی دیوار نہیں ہوتی لیکن کبھی نہ کبھی تو چوری پکڑی ہی جاتی ہے۔ ایک ہفتے بعد صفیہ نے بڑے یقین کے ساتھ اپنے شوہر سے کہا۔

"آج کل آپ شبانہ سے پھر ملنے لگے ہیں؟"

"کون کہتا ہے؟ جب سے تم نے اسے یہاں سے نکالا ہے' میں نے اس کی صورت تک نہیں دیکھی۔"

"آپ مردوں میں یہ بڑی خوبی ہے۔ جھوٹ بولتے وقت ذرا بھی نہیں جھجکتے۔ میں پچھلے تین دن سے آپ کو سر کھجاتے دیکھ رہی ہوں۔"

وہ شکست خوردہ انداز میں سر کھجانے لگا۔ وہ غصے سے بولنے لگی۔

"آپ کو اپنی عزت کا ذرا بھی خیال نہیں ہے۔ معزز لوگوں میں بیٹھ کر اس طرح سر کھجاتے ہوں گے تو اچھا لگتا ہوگا۔ یہ بڑھاپے کا عشق آپ کو جگہ جگہ بدنام کرے گا۔"

اس نے اپنی صفائی پیش کی۔

"صفیہ! میں اس کے پیچھے نہیں جاتا' وہ میرے پیچھے آ جاتی ہے۔ میں کیا کروں؟"

"اگر آپ بے قصور ہوتے تو خفیہ ملاقاتوں کو مجھ سے نہ چھپاتے۔ اب آپ سچ سچ بتائیں کہ وہ کب اور کہاں ملتی ہے؟"

وہ تمام خفیہ اڈے نہیں بتا سکتا تھا۔ اس نے صرف اتنا ہی کہا۔

"دفتر کے راستے میں کہیں نہ کہیں مل جاتی ہے۔"

"آپ مجھے بے وقوف بنا رہے ہیں۔ وہ آپ سے راستے میں ملتی ہے۔ آپ اسے

دعائیں دیتے ہیں' وہ آپ کو جوئیں دے کر چلی جاتی ہے۔ کیا آپ سچ نہیں بولیں گے۔"

سوکن والی سچائی عورت کب برداشت کرتی ہے اس لیے وہ صفیہ کو ٹالنے لگا۔ آخر صفیہ نے تنگ آ کر کہا۔

"میں اسے اپنا گھر برباد نہیں کرنے دوں گی۔ کل سے میں آپ کے ساتھ دفتر جاؤں گی۔ آپ کو وہاں چھوڑ کر گھر کا کام کروں گی۔ پھر شام کو دفتر جا کر آپ کو ساتھ لے آؤں گی۔"

"کیا میں مجرم ہوں کہ تم مجھے قیدی بنا کر رکھو گی؟"

"اگر آپ مجرم نہیں ہیں تو اعتراض نہ کریں۔ میں تو شبانہ کا راستہ روکنے کے لیے ایسا کروں گی۔"

وہ مزید بحث کرتا تو مجرم کہلاتا اس لیے خاموش رہا۔ دوسرے دن سے صفیہ اس کے ساتھ دفتر جانے اور آنے لگی۔ وہ دو دنوں تک شبانہ کو راستے میں کہیں نہ کہیں دیکھتی رہی۔ شبانہ نے بھی اسے انور کے ساتھ کار میں بیٹھے دیکھ لیا تھا اس لیے راستہ نہ روک سکی۔ تیسرے دن وہ نظر نہیں آئی۔ صفیہ نے مسکرا کر کہا۔

"دیکھا آپ نے؟ اب وہ سمجھ گئی ہے کہ دال نہیں گلے گی۔"

وہ شوہر کو دفتر میں چھوڑ کر گھر کے کاموں سے نمٹنے چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی بڑی سی میز کے نیچے سے شبانہ نکل آئی۔

"تم....؟" انور اسے حیرانی سے دیکھنے لگا۔

وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر بولی۔

"ہاں میں.... آپ مجھ سے پیچھا چھڑانے کے لیے اب باجی کے ساتھ آنے جانے لگے ہیں۔"

"تم غلط سمجھ رہی ہو۔ دراصل صفیہ کو ہماری ملاقاتوں کا علم ہو گیا ہے اس لیے وہ میری پہرے دار بن گئی ہے۔"

"جھوٹ۔ باجی کو کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ ہم ملتے رہتے ہیں۔"

"انور جمال نے اپنے سر پر ہاتھ مار کر کہا۔

"یہ سر کھجانے کی وجہ سے.... میں نے تمہیں ہزار بار سمجھایا کہ روز اپنا سر دھویا

کرو۔ کسی طرح جوئیں ختم کرو مگر تم خود ہی بے پروائی سے راز فاش کر دیتی ہو۔"

وہ شرمندہ سی ہو کر سر کھجاتے ہوئے بولی۔

"میں نے تو کتنی چیزوں سے سر دھو کر دیکھ لیا۔ کچھ نہیں ہوتا۔ پتہ نہیں یہ جوئیں کہاں سے آتی ہیں؟ یہ بال میرے پیار کے دشمن بن گئے ہیں۔ آپ سے ملنے کے لیے سر منڈوا لوں گی۔"

اس کے لہجے میں ارادے کی پختگی تھی۔ انور اس کی دیوانگی کو سمجھتا تھا کہ اس کی خاطر وہ اپنے بال کاٹ کر پھینک دے گی۔ اس نے کہا۔

"ایسی حماقت نہ کرنا۔ عورت کا حسن اس کے بالوں سے ہوتا ہے۔ خواہ اس میں جوئیں ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ لو سو روپے رکھ لو اور کسی ڈاکٹر کے پاس جاؤ۔ شاید وہ جوئیں مارنے کی کوئی دوا بتا سکے۔"

اس نے سو روپے دیے پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر...... کھینچ لیا۔ اسی لمحے کھلنے والے دروازے سے آواز آئی۔

"میں تو آپ سے یہ کہنا بھول ہی گئی......"

صفیہ دروازے پر ٹھٹک گئی۔ انور جمال اچھل کر شبانہ سے الگ ہو گیا مگر صفیہ کو جو کچھ دیکھنا تھا' وہ دیکھ چکی تھی اور دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر غصہ سے لرز رہی تھی۔ اس کے ہونٹ یوں کانپ رہے تھے جیسے بہت ساری گالیاں ایک ساتھ نکلنا چاہتی ہوں اور وہ انہیں تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں سے روک رہی ہو۔

"سس..... صفیہ! یہ...... یہ تمہارے جانے کے بعد آئی ہے۔ میں نے نہیں بلایا ہے۔"

"وہ غصے سے پھٹ پڑی۔" آپ نے نہیں بلایا۔ آپ ابھی شریف آدمیوں کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ سب کچھ یہ کر رہی تھی۔ آپ کو شرم سے ڈوب مرنا چاہیے۔ جو اپنی بیوی کے ساتھ باعزت ازدواجی زندگی نہیں گزار سکتا اس سے زیادہ ذلیل اور کمینہ شخص کوئی اور نہیں ہوتا۔"

"صفیہ!" انور جمال نے گرج کر کہا۔ "تم ہوش میں ہو کہ نہیں۔ یہ گالیاں کسے دے رہی ہو؟"

"ہاں۔ میں آج ہوش میں آئی ہوں۔ آپ یہ گالیاں دینے والی زبان کھینچ لیں۔ اس لیے کہ آپ مجازی خدا بنے بیٹھے ہیں لیکن آپ جو اپنے عمل سے ایک بیوی کے رشتے کو گالیاں دے رہے ہیں، ایک مہذب انسان ہو کر انسانی تہذیب کو گالیاں دے رہے ہیں تو آپ کو اس کی سزا کون دے گا۔ کوئی نہیں۔ کوئی آپ کا گریبان پکڑنے والا نہیں ہے۔ اسی لیے آپ کھل کر یہ کھیل کھیلتے ہیں۔"

انور جمال نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"صفیہ! آہستہ بولو۔ دفتر کے لوگ سن رہے ہوں گے۔"

"دفتر کے لوگ اندھے بہرے نہیں ہیں۔ وہ یہ بھی دیکھتے اور سمجھتے ہوں گے کہ یہ لڑکی یہاں کیوں آتی ہے؟ ذرا دیکھو تو یہ کمینی کتنے اطمینان سے ہمارا جھگڑا دیکھ رہی ہے۔" اس نے شبانہ کے بال پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ "چل نکل یہاں سے۔ کیا یہ تیرے باپ کا دفتر ہے......"

شبانہ نے ایک جھٹکے سے اپنے بالوں کو چھڑا کر صفیہ کو زور کا دھکا دیتے ہوئے کہا۔

"نہ میرے باپ کا دفتر ہے نہ تمہارے باپ کا...... بس میں تمہاری بہت عزت کر چکی، اب سمجھا دیتی ہوں کہ میرے منہ نہ لگنا ورنہ......"

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی انور جمال نے اسے ایک زور کا تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔

"تم صفیہ سے بدتمیزی کر رہی ہو۔ میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔ چلو نکلو یہاں سے......"

اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچا مگر شبانہ فرش پر گر کر اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔

"میں نہیں جاؤں گی...... یہاں سے نہیں جاؤں گی......"

"یہ نہیں جائے گی۔ میں ہی چلی جاتی ہوں۔" صفیہ روتے ہوئے اپنے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے دروازہ کھول کر جانے لگی۔

"صفیہ رک جاؤ۔ میری بات سنو......"

وہ دروازے پر آیا تو باہر چپراسی، کلرک، منیجر اور جنرل منیجر وغیرہ سب ایک مجمع لگائے کھڑے تھے۔ اس نے گرج کر کہا۔

"یہاں کیوں کھڑے ہو؟ کیا تماشہ ہو رہا ہے؟ جاؤ اپنا کام کرو۔"

بھیڑ چھٹنے لگی۔ اتنی سی دیر میں صفیہ جا چکی تھی۔ وہ تھوڑی دیر تک گم صم کھڑا رہا۔ اس نے ملازموں سے غصے میں کہا تھا۔ کیا یہاں تماشہ ہو رہا ہے؟ اب یہ سمجھ میں آ گیا کہ واقعی دلچسپ اور شرمناک تماشہ ہو چکا ہے۔ دفتر کے ہر شخص کو معلوم ہو چکا ہے کہ وہ اپنی بیوی سے گالیاں سنتا ہے اور خود وہ گالیاں سننے کے کام کرتا ہے اور یہ حقیقت کھل چکی تھی کہ اوپر سے شریف اور صاف ستھرے نظر آنے والے لوگ اندر سے کتنے میلے اور گھناؤنے ہوتے ہیں۔"

اس نے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ شبانہ فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے تیزی سے قریب آ کر اسے ایک ٹھوکر ماری۔

"کمینی بد ذات! تیری وجہ سے میرا گھر برباد ہو رہا ہے۔ باہر والوں کے سامنے بھی میری بے عزتی ہو رہی ہے۔ آخر تو میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتی؟"

وہ اس کے بال پکڑ کر اسے تڑا تڑ مارتا رہا۔ اس نے منہ سے اف تک نہ کی۔ مار کھاتی رہی اور اس کے قدموں سے لپٹی رہی۔ بعض اوقات پتہ نہیں چلتا کہ قدموں سے خوش نصیبی لپٹ رہی ہے یا بد نصیبی؟ کیوں کہ وہ اسے خوش نصیبی سمجھ کر گلے لگاتا تھا اور بد نصیبی سمجھ کر مار رہا تھا۔ اور بد نصیبی کے لیے یہ بات مشہور ہے کہ نہ وہ زور سے جاتی ہے نہ زر سے۔ ایسے وقت آدمی اسے مار کر دراصل خود کو مارتا ہے۔

جب وہ مارتے مارتے تھک گیا تو صوفے پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ جوانی کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔ بڑھاپا خود ہی تھک ہار کر بیٹھ گیا تھا۔ شبانہ اپنے کپڑے درست کرتے ہوئے اٹھی۔ دوپٹے سے اپنے چہرے اور گردن کو پونچھا پھر میز کی دراز سے آئینہ اور کنگھی نکال کر بکھری ہوئی زلفیں سنوارنے لگی۔ وہ غصے سے بولا۔

"کیا تمہارے پاس ذرا بھی شرم و حیا نہیں ہے؟"

"ہے......" اس نے آئینے سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "مگر اب آپ کے پاس آ کر شرمانے کے لیے کیا رہ گیا ہے؟"

وہ تلملاتا ہوا صوفے سے اٹھ کر اس کے پاس آیا پھر اس کا بازو پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

"تم ڈھیٹ ہو۔ کوئی دوسری ہوتی تو اتنی مار کھانے کے بعد یہاں ایک لمحے کے لیے بھی ٹھہرنا گوارا نہ کرتی۔"

"دوسری ہوتی تو گوارہ نہ کرتی۔ میں تو آپ کی اپنی ہوں۔"

وہ اسے بے بسی سے دیکھتا ہوا بولا۔

"خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو۔ میں نے تمہیں مارا ہے مجھ سے نفرت کرو۔"

"کیسی نفرت؟ میرا آدمی مجھے نہیں مارے گا تو کیا دوسرا کوئی مارنے آئے گا۔"

وہ سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ شبانہ قریب آکر اس کے سر کو سہلاتے ہوئے بولی۔

"آج میں بہت خوش ہوں۔ پہلے باجی مجھے آپ سے دور بھگاتی تھیں' آج میں نے انہیں بھگا دیا۔ آج مجھے پتہ چل گیا کہ مار کھا کر بھی میدان میں جمے رہو تو جیت اپنی ہی ہوتی ہے۔ اب تک باجی کا ڈر تھا اور دنیا والوں کا ڈر تھا۔ اب وہ میرے دل سے نکل گیا ہے......"

وہ بولتی رہی اور ٹٹول ٹٹول کر اپنے محبوب کے سر سے جوئیں نکالتی رہی۔

وہ شام کو دفتر سے واپس آیا تو گھر میں نواسے نواسیاں کھیل رہے تھے۔ وہ بچوں کو باری باری گود میں لے کر پیار کرنے لگا۔ ایسے وقت اس کا ضمیر ملامت کر رہا تھا کہ وہ اپنے گھر کی جنت کو اپنے ہاتھوں سے جہنم بنا رہا تھا۔ اب وہ اپنے کمرے میں جاتے ہوئے ڈر رہا تھا کیوں کہ بچے آئے ہیں تو صائمہ بیٹی بھی آئی ہوگی۔ وہ گناہ گار بن کر بیوی کا سامنا کر چکا تھا مگر بیٹی سے آنکھ ملانے کا حوصلہ نہیں تھا۔

پھر اس نے دل کو سمجھایا کہ صفیہ سمجھ دار ہے۔ اس نے بیٹی سے بات چھپائی ہوگی اور یہ بھی خیال آیا کہ وہ بہت غصے میں تھی۔ آج سے پہلے اس نے کبھی گستاخی نہیں کی تھی لیکن اب اس کے منہ سے گالیاں بھی نکل چکی تھیں۔ دل کا بوجھ گالیاں دینے سے بھی ہلکا نہ ہو تو اولاد کے سامنے دکھڑا رونے سے کچھ کم ہو جاتا ہے۔ اس نے اپنی بڑی نواسی سے پوچھا۔

"تمہاری امی اور ابو بھی آئے ہیں؟"

"ابو نہیں' امی آئی ہیں۔"

"وہ کیا کر رہی ہیں؟"

"وہ نانی اماں کے ساتھ رو رہی ہیں۔ ہمیں کمرے سے بھگا دیا۔ نانا! وہ کیوں رو رہی ہیں۔"

بڑا چبھتا ہوا سوال تھا۔ صائمہ بھی یہی سوال کرتی کہ آپ امی کو کیوں رلا رہے ہیں؟

اس کے جی میں آیا کہ گھر سے بھاگ جائے مگر بھاگ کر کہاں جائے؟ کیا اپنا گھر' اپنی بیوی' بچے اپنا کاروبار سب چھوڑ دے؟ کیا احمقانہ خیال ہے۔ جو بویا ہے وہ تو کاٹنا ہی پڑے گا۔ وہ نواسی کو گود سے اتار کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے کمرے کے دروازہ پر پہنچا۔ وہ دونوں پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ صفیہ اپنی بیٹی کے سینے پر سر رکھے رو رہی تھی اور بیٹی اپنے آنچل سے آنسو پونچھ رہی تھی۔

ایک وقت تھا جب ننھی صائمہ روتی تھی تو صفیہ اسے گود میں لے کر پچکارتی اور اس کے آنسو پونچھتی تھی۔ آنسو پونچھنے والی محبت جو اولاد پر قرض ہوتی ہے' وہ قرض آج بیٹی ادا کر رہی تھی کیوں کہ شوہر کا رومال پرایا ہو گیا تھا۔

صائمہ کی نظریں دروازے تک گئیں اس نے باپ کو دیکھتے ہی اپنے آنسو پونچھتے ہوئے سلام کیا۔ انور جمال شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ بیٹی اپنی ماں کی مظلومیت کا حساب باپ سے لے گی۔ شکایتیں کرے گی یا ماں کی حمایت میں باپ سے منہ پھیرے گی لیکن جو لڑکیاں مشرقی آداب سے واقف ہوتی ہیں۔ وہ ظالم باپ کو بھی ادب سے سلام کرتی ہیں اور یہ سلام غیر مشرقی باپ کے لیے طنز بن جاتا ہے۔ اس نے ندامت سے سر جھکا کر کہا۔

"بیٹے میں اس بات پر شرمندہ ہوں کہ میری ایک غلطی سے تمہاری ماں کی آنکھوں میں آنسو آگئے لیکن غلطی کس سے نہیں ہوتی۔ جب میں غلطی کی تلافی کرنا چاہتا ہوں تو تمہاری امی کو آنسو نہیں بہانا چاہئیں۔"

صفیہ روتے ہوئے بولی۔

"جی ہاں' مجھے رونا نہیں چاہیے' جشن منانا چاہیے کہ آپ اس کلموہی کو دفتر میں چھپا کر رکھتے ہیں۔"

"صفیہ تم مجھے الزام دے رہی ہو۔ میں تمہارے ساتھ گھر سے دفتر گیا تھا۔ ہمارے

پہنچنے سے پہلے ہی وہ وہاں جا کر چھپ گئی تھی۔"
"اگر چھپ گئی تھی تو آپ نے اسے مار کر کیوں نہ بھگایا؟ مگر آپ کیسے بھگاتے۔ آپ پر تو پھر جوانی آئی ہے۔"
"بیٹی کے سامنے ایسی باتیں کرتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے۔"
"آپ کو شرم نہیں آئی تو پھر مجھے کیوں آئے؟"
"امی۔" صائمہ نے صفیہ کو جھنجوڑ کر کہا۔ "آپ ابو سے کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ کیا آپ مہذب انداز اختیار نہیں کر سکتیں۔"
"بیٹی! تم انہیں مہذب انداز سکھا رہی ہو' یہ تو دفتر میں بھی مجھے گالیاں دے کر آئی ہیں۔
صائمہ نے حیرانی اور بے یقینی سے اپنی ماں کو دیکھا۔ وہ منہ پھیر کر بولی۔
"میں نے گالیاں نہیں دیں۔ میں غصے میں تھی' نہ جانے میرے منہ سے کیا کچھ نکل گیا۔"
صائمہ نے کہا۔ "آپ کو ہوش میں رہ کر منہ سے کوئی بات نکالنی چاہیے۔ امی! کیا میں بیٹی ہو کر سمجھاؤں کہ شوہر کی عزت سے عورت کی عزت ہوتی ہے۔ آپ ابو کے خلاف کچھ کہیں گی تو ان کی بدنامی آپ کی' ہماری سب کی بدنامی ہوگی۔ خدا کے لیے غصہ تھوک دیں۔ ابو پریشان ہیں۔ آپ ہی ان کی پریشانی دور کر سکتی ہیں۔"
"صائمہ۔" انور جمال نے کہا۔ "میں تمہارے سامنے تمہاری امی سے اپنی غلطی کی معافی چاہتا ہوں۔"
صفیہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔
"میں نے آپ سے بدکلامی کی ہے۔ آپ مجھے معاف کر دیں۔"
انور اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا پھر اس کے آنسو پونچھنے کے لیے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو یاد آیا کہ رومال تو شبانہ کے پاس رہ گیا ہے۔ ایسے وقت بیوی کے پاس صرف اپنا ہی آنچل رہ جاتا ہے۔ اس نے اس کے آنچل سے کام لیتے ہوئے کہا۔
"میں نے تمہیں معاف کیا۔ میرے خدا نے تمہیں معاف کیا۔ اب تم بھی انصاف سے کہو۔ کیا میں اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش نہیں کرتا ہوں؟"

"ہاں' میں نے آپ کو ناحق الزام دیا۔ آپ اس سے بچنے کے لیے میرے ساتھ دفتر آتے جاتے رہے۔ آج آپ نے میرے سامنے اسے مارا بھی ہے۔
"صفیہ! میں نے تمہارے جانے کے بعد بھی اس کی خوب پٹائی کی ہے۔"
صائمہ نے پوچھا۔ "ابو پھر تو وہ مار کھا کر بھاگ گئی ہوگی؟"
انور جمال نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔
"نہیں بیٹے! مصیبت اتنی جلدی نہیں بھاگتی؟"
صفیہ نے چونک کر پوچھا۔
"کیا میرے جانے کے بعد بھی وہ آپ کے پاس رہی تھی؟"
"میں کیا کرتا؟ وہ جانا ہی نہیں چاہتی تھی۔"
"اس لیے آپ نے اسے کلیجے سے لگا کر رکھ لیا۔"
"تم پھر وہی غصہ دکھا رہی ہو۔ کیا مجھے طعنے دینے سے بگڑی بات بن جائے گی؟"
"امی! آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ کیا آپ ابو سے سمجھوتہ نہیں کر سکتیں؟"
"میں کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میرے اندر آگ لگی ہوئی ہے۔"
"امی آپ ہی نے مجھے سمجھایا تھا کہ عورت خود جل جاتی ہے مگر اپنے گھر کو جلنے نہیں دیتی۔ آپ کی یہ دانش مندانہ نصیحتیں کیا ہو گئیں؟"
انور جمال وہاں سے اٹھ کر دور چلا گیا پھر پلٹ کر بولا۔
"شیشے میں بال پڑ جائے تو وہ نہ مٹنے والا داغ بن کر رہ جاتا ہے۔ میں اپنی ایک غلطی کی ہزار معافی مانگوں تب بھی تمہاری امی کے دل میں بے اعتمادی کا نہ مٹنے والا داغ رہے گا۔ بیٹی یہ جاننے کے باوجود میں آخری سانس تک تمہاری امی کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔"
صفیہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔
"اعتماد اسی طرح بحال ہو سکتا ہے کہ میں جو کہوں آپ وہی کریں۔"
"میں وہی کروں گا۔"
"تو پھر آپ کل سے دفتر نہیں جائیں گے۔"

"نہیں جاؤں گا لیکن کاروبار کا کیا ہوگا؟"

"کاروبار کے لیے دفتر جانا ضروری نہیں ہے۔ آپ گھر میں بیٹھ کر فون پر پارٹیوں سے رابطہ کرسکتے ہیں اور یہیں بیٹھ کر آفس کے معاملات نمٹا سکتے ہیں۔ کسی پارٹی سے ملنا ہو تو میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔"

"مجھے منظور ہے۔ مگر تم یہ دیکھ چکی ہو کہ وہ اب تم سے بھی نہیں ڈرتی ہے۔"

"اس کا تو باپ بھی ڈرے گا۔ ایسے جوتے لگاؤں گی کہ سر کی ساری جوئیں مرجائیں گی۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ میں کل سے دفتر نہیں جاؤں گا۔ فون پر بہانہ کردوں گا کہ میں بیمار ہوں۔"

"ہرگز نہیں' بیماری کی خبر سن کر آپ کی وہ سگی عیادت کے لیے یہاں آجائے گی۔ توبہ ہے ایسی بے شرم لڑکی تو میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ زبردستی گلے پڑتی ہے۔"

صائمہ نے کہا۔ "اگر ہم اس سے ڈریں گے تو وہ اور سر چڑھے گی۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ کوئی ہنگامہ نہیں کرے گی۔ آخر اسے بھی اپنی عزت کا خیال ہوگا۔ امی! اگر ہم اس کے گھر جاکر اس کی ماں کو سمجھائیں کہ اگر شبانہ اپنی حرکتوں سے بدنام ہوگئی تو پھر کہیں سے اس کا رشتہ نہیں آئے گا۔"

"میں تو اماں بی کو سمجھا چکی ہوں۔ تم کہتی ہو تو چلو ہم بڑی بی کو ایک بار پھر سمجھائیں۔"

میاں بیوی کے درمیان سمجھوتہ ہوگیا۔ بیٹی خوش ہوگئی۔ ایسے موقع پر یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اپنا گھر بچا کر دوسرے کے گھر میں آگ لگائی جاچکی ہے۔ اب شبانہ جلے' مرے یا زندہ رہے۔ ایسا تو اکثر ہوتا ہے کہ کسی دوشیزہ کو مکھی بنا کر خود ہی دودھ میں ڈالا جاتا ہے پھر گھر کے افراد متحد ہو کر اس مکھی کو نکال پھینکتے ہیں تاکہ گھر کا کمانے والا مرد مکھی کی بیماریوں سے محفوظ رہے۔

دونوں ماں بیٹی شبانہ کے گھر پہنچیں تو وہ انور سے کئے ہوئے وعدے کے مطابق اپنے سر سے جوئیں صاف کررہی تھی۔ اماں بی چولہے کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ شبانہ انہیں دیکھتے ہی چونک گئی۔ صفیہ اسے نفرت سے دیکھتے ہوئے اماں بی کے پاس پہنچ کر بولی۔

"میں آپ سے صاف صاف بات کرنے آئی ہوں۔ آپ اس لڑکی کو گھر میں تالا ڈال کر رکھیں ورنہ یہ ایسے بدنام ہوگی کہ کوئی رشتہ مانگنے تو کیا یہاں تھوکنے بھی نہیں آئے گا۔"

اماں بی نے کہا۔ "اے بیٹی ذرا آہستہ بولو۔ خواہ مخواہ میری بچی کو بدنام کیوں کررہی ہو۔"

"میں کیا بدنام کروں گی جب کہ یہ خود بدنام ہونا چاہتی ہے۔ آپ بیٹی سے یہ نہیں پوچھتیں کہ صبح صبح یہ کہاں جاتی ہے؟"

"بیٹی یہ تو اپنی سہیلیوں کے گھر جاتی ہے۔"

"اماں بی۔ یہ کسی سہیلی سے نہیں' کسی یار سے ملنے جاتی ہے۔"

اماں ایک دم سے گھبرا کر شبانہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔ شبانہ نے چبھتی ہوئی نظروں سے صفیہ کو دیکھا پھر کنگھی پھینک کر ایک طرف کھڑی ہوگئی۔ اس کے بعد دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر بولی۔

"میں تمہیں باجی کہتی رہی' تمہاری عزت کرتی رہی۔ کبھی تمہارے گھر میں ڈاکا نہیں ڈالا' بلکہ تمہارے گھر کے شریف لٹیرے نے مجھے لوٹا ہے۔ یہ میری شرافت ہے کہ میں نے اسے بدنام نہیں کیا۔ یہ تمہاری ذلالت ہے کہ تم مجھے بدنام کرنے یہاں آگئیں۔ جب کسی یار سے منسوب کررہی ہو تو پھر یہ کیوں نہیں بتاتیں کہ اس کا نام انور جمال ہے۔"

اماں بی اپنے سینے پر دو ہتڑ مار کر بولیں۔

"اری حرافہ! کیسی بے شرمی سے بول رہی ہے۔ ایسا ہونے سے پہلے تجھے موت آجاتی تو اچھا تھا۔ ہائے بیٹی صفیہ! تم نے مجھ پر اتنے احسانات کئے۔ میں کیا جانتی تھی کہ تمہارے میاں احسانات کا بدلہ میری بیٹی سے لیں گے۔ میں غریب جس کا شوہر گم ہوگیا ہو جس کا کوئی عزیز رشتہ دار نہ ہو۔ وہ کس کے سامنے فریاد کرنے جائے۔"

صفیہ نے کہا۔ "اماں بی! اس طرح رونے سے سارا محلہ سنے گا۔ میں آپ کی بھلائی کے لئے سمجھانے آئی ہوں۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ دنیا والے کچھ نہیں جانتے۔ ہم جلد از جلد کوئی اچھا لڑکا تلاش کرکے اس بدنامی کو سہاگ کا جوڑا پہنا دیں گے۔"

شبانہ نے کہا۔ "تمہیں شوق ہے تو تم پہن لو۔"
صائمہ نے قریب آکر پیار سے سمجھایا۔

"شبانہ! امی سے ایسی بات نہ کرو۔ تم کنواری ہو اس لیے تمہاری شادی کی بات کر رہے ہیں۔"

"مگر صائمہ! تمہارے ابو نے تو مجھے سمجھایا ہے کہ شادی صرف دنیا کو دکھانے کی رسم ہے۔ وہ شادی کے بغیر بھی مجھے ساری عمر چاہتے رہیں گے۔"

اس کی باتیں سن کر دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں۔ اماں بی نے روتے ہوئے کہا۔

"سن لو صفیہ! تمہارے میاں میری نادان بچی کو کیسی باتیں سمجھاتے رہے ہیں۔ تمہارے پاس ایمان ہے تو تم خود ہی انصاف کرو کہ میری بیٹی کتنی مظلوم ہے اور تمہارے میاں کتنے ظالم۔"

"اماں بی! میں نے اپنے شوہر سے کتنا جھگڑا کیا ہے اور انہیں کیسی شرم دلائی ہے۔ یہ میرا خدا ہی جانتا ہے لیکن جو کچھ ہو چکا ہے اگر اس کا ہم ماتم کرتے رہیں گے تو بگڑی ہوئی بات کبھی نہیں بنے گی۔ دانش مندی یہی ہے کہ آپ اپنی بیٹی کو سمجھائیں، منائیں یا زور زبردستی سے گھر کی چار دیواری میں بند رکھیں۔ میں نے بھی اپنے شوہر کو دفتر جانے سے روک دیا ہے۔ اب وہ گھر میں رہا کریں گے۔"

شبانہ نے چونک کر پوچھا۔

"کیا وہ گھر میں رہیں گے۔ کیا تم انہیں چوڑیاں پہنا کر بٹھا دو گی؟"

صفیہ نے کہا۔

"میں کیا کروں گی، یہ تمہیں اب پتہ چلے گا۔ تم ان کے سائے تک بھی نہیں پہنچ سکو گی۔"

شبانہ اسے گھورتے ہوئے سوچنے لگی کہ اب کیا ہوگا۔ وہ انور کے سینے پر سر رکھ کر کیسے سوئے گی۔ یوں تو وہ اب بھی راتوں کو جاگتی تھی مگر اس یقین کے ساتھ کہ اگلے دن اس کے جاتے پہچانے بازو کا تکیہ مل جائے گا اور صفیہ پھر اس تکیہ کو اس کے سرہانے سے کھینچ رہی تھی اور اس کی ماں سے کہہ رہی تھی۔

"مرد ہزار غلطیاں کر کے نیک نام رہتا ہے۔ میرے شوہر کا کچھ نہیں بگڑے گا لیکن میں آپ کا بھی کچھ بگاڑنا نہیں چاہتی۔ اسی لیے سمجھا رہی ہوں کہ اپنی بیٹی کو فوراً شادی کے لیے راضی کر لیں۔"

"کیسے راضی کروں۔ بیٹی تم خود ہی ذرا پیار و محبت سے اس کے دماغ میں یہ بات بٹھاؤ کہ شادی دکھاوے کی رسم نہیں ہے۔ شادی کے بغیر عورت عزت سے اپنا مقام نہیں بنا سکتی۔"

"میں اسے کیسے سمجھاؤں۔ یہ تو مجھے اپنا دشمن سمجھتی ہے۔ بات کرو تو کاٹنے کو دوڑتی ہے۔"

"اماں! میں نے شبانہ کو سمجھاتی ہوں۔"

صائمہ سمجھانے کے لیے دوسری طرف مڑی مگر دوسری طرف اب شبانہ نہیں تھی۔

"شبانہ کہاں ہو تم......؟" وہ آوازیں دیتی ہوئی کمرے میں گئی۔ غسل خانے میں جھانک کر دیکھا اسٹور روم کا دروازہ کھولا پھر واپس آکر بولی۔

"امی شبانہ کہیں نہیں ہے۔"

"نہیں ہے؟ یہ اچانک کہاں غائب ہو گئی؟" صفیہ نے پوچھا۔ پھر چونک کر چیخ پڑی۔

"ہائے صائمہ! وہ چڑیل تمہارے ابو کے پاس گئی ہو گی۔ جلدی چلو......"

دونوں ماں بیٹی تیزی سے چلتی ہوئی مکان سے باہر آئیں۔ باہر گلی بہت تنگ تھی۔ اس لیے وہ سڑک پر کار چھوڑ کر آئی تھیں۔ جب وہ وہاں پہنچیں تو کار بھی غائب تھی۔ صفیہ نے جھلا کر کہا۔

"یہ ڈرائیور گاڑی لے کر کہاں چلا گیا۔ میں اسے ملازمت سے نکال دوں گی۔"

صائمہ نے ایک قریبی چائے خانہ کی طرف اشارہ کیا۔

"امی! شاید وہ چائے پینے گیا ہو گا۔"

"ارے تو کیا گاڑی بھی چائے خانے کے اندر لے گیا ہو گا؟"

صائمہ نے آگے بڑھ کر چائے خانہ کے ایک آدمی سے پوچھا۔

"ہاں بی بی جی! ابھی ہمارے محلے کی ایک لڑکی شبانہ اس گاڑی میں بیٹھ کر گئی ہے۔"

صفیہ نے جب یہ سنا تو وہیں کھڑے کھڑے شبانہ کو گالیاں دینے لگی۔ اس کے شوہر

سے اسی کی گاڑی لے کر ملنے گئی ہے۔ اس وقت صفیہ کو پاگل پن کی حد تک غصہ آرہا تھا۔ غصہ اس لیے بھی آرہا تھا کہ ایسے وقت رکشہ ٹیکسی کا بھی کال پڑ جاتا ہے۔ وہ دونوں تیزی سے چلتی ہوئی بڑی سڑک پر پہنچیں۔ وہاں رکشے اور ٹیکسیاں آندھی طوفان کی طرح گزر رہے تھے کسی کو رکنے کی فرصت نہیں تھی۔ آخر صائمہ نے لفٹ لینے کے ایک کار کو اشارہ کیا۔ کار قریب آکر رک گئی۔ وہاں اسٹیرنگ سیٹ پر ایک لئے خوش پوش ادھیڑ عمر کا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ صائمہ نے کہا۔

"پلیز مجھے اور میری امی کو ذرا سوسائٹی تک......"

"امی؟" کار والے نے ناگواری سے کہا۔ "سوری میں سمجھا تھا تم اکیلی ہو......"

ایک جھٹکے سے کار آگے بڑھی پھر فراٹے بھرتی ہوئی دور چلی گئی۔ صائمہ کے منہ پر گالی آتے آتے رہ گئی۔ اسے اچانک ہی سمجھ آگئی کہ وہ گالی اس کے باپ کو بھی پڑے گی۔"

دوسری طرف صفیہ ایک کار والے کو گالیاں دیتی آرہی تھی۔ صائمہ نے پوچھا۔

"کیا ہوا امی؟"

"کیا بتاؤں' یہ دولت انسان کو اندھا بنا دیتی ہے۔ میں نے اس کمینے سے کہا۔ مجھے اور میری بیٹی کو ذرا سوسائٹی پہنچا دو۔ وہ حیرانی سے بولا۔ بیٹی؟ میں تو تمہیں کنواری سمجھ رہا تھا۔ حرامی کمینہ......"

صائمہ سر اٹھا کر تاریک آسمان کو دیکھنے لگی۔ اس آسمان کے نیچے جس زمین پر وہ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ زمین کار والوں کی ہیڈ لائٹس سے روشن تھی۔ اس روشنی میں معزز لوگ کسی کنواری یا اکیلی عورت کو تلاش کر رہے تھے۔ آخر کار ایک ٹیکسی مل گئی۔ جب وہ دونوں ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنی کوٹھی کے احاطے میں پہنچیں تو ڈرائیور کار کی صفائی کر رہا تھا۔ صفیہ نے غصے سے پوچھا۔

"تم کس کی اجازت سے گاڑی یہاں لائے ہو؟"

"جی بیگم صاحبہ! اجازت کون دیتا جی۔ شبانہ بی بی جی نے کہا کہ آپ ان کے ہاں' رات کا کھانا کھائیں گی جی اور آپ نے صاحب جی کو بھی وہاں بلایا ہے۔ بس جی میں شبانہ بی بی جی کے ساتھ صاحب جی کو لینے آگیا۔ میں تو حکم کا بندہ ہوں......"

وہ غصے سے پیر پٹختی ہوئی مکان میں داخل ہوئی۔ اس کا غصہ ایسا تھا کہ جیسے شبانہ کو چیر پھاڑ کر رکھ دے گی لیکن ڈرائنگ روم میں پہنچتے ہی ٹھٹک گئی۔ وہاں اس کا داماد' صائمہ کا شوہر توفیق بیٹھا ہوا تھا۔ اب وہ داماد کی موجودگی میں نہ تو شبانہ کی چوٹی پکڑ سکتی تھی' نہ ہی شوہر کے گریبان پر ہاتھ ڈال سکتی تھی۔ توفیق نے پوچھا۔

"آنٹی آپ پریشان نظر آرہی ہیں۔ یہ گڑیا کہہ رہی تھی کہ امی اور نانی اماں رو رہی تھیں۔"

صفیہ نے جبراً مسکراتے ہوئے کہا۔

"ارے وہ۔ صائمہ نے ایک لطیفہ سنایا تھا۔ ہنستے ہنستے آنسو آگئے تھے۔ بچوں نے سمجھا کہ ہم رو رہے تھے۔ البتہ سر کے درد سے پریشان ہوں۔ تم صائمہ سے باتیں کرو میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ داماد کو مزید کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ توفیق نے اپنی بیوی سے کہا۔

"یہاں آکر بیٹھو' وہ لطیفہ مجھے بھی سناؤ تاکہ ہنستے ہنستے آنسو آجائیں۔ ابھی دس منٹ پہلے میں نے تمہارے ابو کے کمرے میں شبانہ کی آنکھیں بھیگی ہوئی دیکھیں۔ شاید تمہارے ابو بھی اسے کوئی لطیفہ سنا رہے تھے۔"

صائمہ نے کہا۔ "آپ طنز نہ کریں۔ امی اپنے ہوش میں نہیں ہیں۔ اپنی پریشانیاں چھپانے کے لیے الٹی سیدھی باتیں کر رہی ہیں۔"

"تم تو ہوش میں ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھ سے کچھ نہیں چھپاؤ گی۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آنٹی کی پریشانیاں دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔"

میں گھر پہنچ کر آپ کو سب کچھ بتا دوں گی۔ ابھی ہمارا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں ہے اس سے پہلے کہ امی ہمیں ڈنر کے لیے کہیں۔ ہمیں یہاں سے چپ چاپ نکل جانا چاہیے۔"

توفیق اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ دوسری طرف صفیہ تیزی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں پہنچی تو انور جمال وہاں تنہا نظر آیا۔ وہ مٹھیاں بھینچ کر دانت پیستی ہوئی اور داماد کے خیال سے اپنی آواز کو دباتے ہوئے بولی۔

"وہ کمینی بدذات کہاں ہے؟"

انور جمال کے چہرے سے گھبراہٹ اور پریشانی عیاں تھی۔ وہ التجا آمیز لہجے میں بولا۔

"صفیہ! ذرا صبر سے۔ توفیق میاں کو چلا جانے دو پھر تم میری گردن پر چھری پھیر دینا۔"

"میں خود مر رہی ہوں' آپ کو کیا ماروں گی۔ مرتے مرتے بھی آپ کی عزت کا خیال کرتی ہوں۔ اپنی آواز کو دباتی ہوں۔ اپنے غصے کو کچلتی ہوں۔ دو کوڑی کی ایک لڑکی کے آگے میرے ازدواجی حقوق مٹی میں ملا رہے ہیں پھر بھی میں شور نہیں مچا رہی ہوں۔ بیٹی میرے آنسو کب تک پونچھے گی؟ میں توفیق میاں سے کب تک حقیقت چھپاؤں گی؟"

"تم یقین کرو صفیہ! تھوڑی دیر پہلے میں شبانہ کو یہی سمجھا رہا تھا کہ وہ میری عزت کا خیال کرے۔ میری اپنے گھر میں عزت نہ رہی۔ میں دفتر میں بدنام ہوگیا۔ اب یہ بدنامی آگے بڑھے گی تو میں توفیق میاں سے نظریں نہ ملا سکوں گا۔ میں نے اسے ہر طرح سے سمجھایا مگر وہ سمجھنا ہی نہیں چاہتی۔"

"اسے سمجھنے کی ضرورت ہی کیا ہے جب کہ وہ تنہائی میں آپ کو اچھی طرح سمجھا کر پگھلا دیتی ہے۔ اسے تو میں یہاں سے دھکے دے کر نکالوں گی۔ کہاں ہے وہ؟"

"میں یہاں ہوں......" شبانہ باتھ روم کے دروازے سے باہر آکر کھڑی ہوگئی پھر دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر بولی۔ "تم انہیں اگر قیدی بنا کر رکھو گی تو میں یہاں سے کبھی نہیں جاؤں گی۔"

"کیسے نہیں جائے گی۔ یہ میرا گھر ہے۔" صفیہ نے آگے بڑھ کر اس کو گریبان سے پکڑ لیا۔ اس نے صفیہ کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ لیا۔ انور جمال دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ ایک دوسرے کو مار رہی تھیں اور نوچ کھسوٹ رہی تھیں۔ انور جمال کو بھی کئی ہاتھ پڑ گئے۔ اس نے بڑی مشکلوں سے دونوں کو الگ کیا پھر شبانہ کو ڈانٹ کر کہا۔

"تم کب تک مصیبت بنی رہو گی۔ تمہاری وجہ سے میرا سکون برباد ہوگیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ کہیں بھاگ جاؤں۔"

شبانہ نے کہا "یہی تو میں اتنی دیر سے سمجھا رہی تھی کہ ہم کہیں بھاگ جائیں گے مگر

آپ ہمت ہی نہیں کرتے۔"

"میں تمہارے ساتھ نہیں' تنہا بھاگنا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ پہلے آپ تنہا بھاگ جائیں۔ میں بعد میں آجاؤں گی۔"

"اف!" وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹنے لگا۔ صفیہ کو اس پر ترس آگیا۔ وہ ذرا نرم پڑ کر شبانہ سے بولی۔

"کیا تمہیں ان پر ترس نہیں آتا۔ اس طرح تو یہ پاگل ہو جائیں گے۔"

شبانہ نے پوچھا "ہو جائیں گے کیا مطلب؟ یہ تو بہت پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ شبانہ میں تمہارے لیے پاگل ہو چکا ہوں۔"

صفیہ نے گھور کر انور کو دیکھا۔ انور نے جلدی سے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"خدا کی قسم یہ بات میں نے دو ماہ پہلے کہی تھی۔ اب تو میں پچھتا رہا ہوں۔"

"اگر پچھتا رہے ہیں تو پھر اسے جوتے مار کر یہاں سے نکال دیں۔ یہ باتوں سے نہیں مانے گی۔"

انور جمال نے شبانہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔

"تم سچ مچ باتوں سے نہیں مانو گی۔ میں تمہیں دھکے دے کر نکالوں گا۔"

وہ اپنا ہاتھ چھڑانے لگی۔ صفیہ نے پوچھا۔

"آپ اسے مارتے کیوں نہیں؟"

انور نے تراخ سے اسے ایک طمانچہ رسید کیا۔ شبانہ نے اپنے گال پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"آپ اپنی مردانگی دکھانے کے لیے ماریں گے تو میں خوشی سے مار کھالوں گی اور اگر بیوی کے کہنے پر ماریں گے تو پھر میں اپنی عزت کا بھی خیال نہیں کروں گی۔ اور شور مچانا شروع کردوں گی۔"

صفیہ نے کہا "آپ اس کی دھمکیوں میں نہ آئیں۔ اس کی ہڈیاں پسلیاں توڑ کر رکھ دیں۔"

انور نے اسے دو چار ہاتھ اور جمائے پھر اسے بالوں سے پکڑ کر فرش پر گرا دیا اور لاتوں سے مارنے لگا۔ اسی لمحے شبانہ نے زور کی چیخ ماری۔ چیخ کی آواز آس پاس کی

کوٹھیوں تک ضرور پہنچی ہوگی۔ انور جمال سہم گیا کیونکہ چیخ کے ذریعے بدنامی نشر ہو رہی تھی۔ شبانہ نے ہذیانی انداز میں دوسری بار چیخ ماری۔ انور نے فرش پر بیٹھ کر اس کے منہ پر سختی سے ہاتھ رکھ دیا۔

"یہ کیا پاگل پن ہے۔ کیا تم مجھے بدنام کرنا چاہتی ہو؟"

شبانہ نے اپنے منہ سے اس کا ہاتھ ہٹا کر کہا۔

"آپ میرے ساتھ کون سی بھلائی کر رہے ہیں۔ میں پھر سمجھا دیتی ہوں کہ آپ مجھے اپنا سمجھ کر ماریں۔ دوسروں کے کہنے پر دشمن بن کر ماریں گے تو میں بھی دشمن بن جاؤں گی۔"

"کیا یہ دشمنی نہیں ہے کہ تم مجھے پریشان کر رہی ہو؟"

"جب آپ نے مجھے محبت کا سبق سکھایا تو وہ دشمنی نہیں تھی۔ اب میں محبت سے مجبور ہو کر آپ کے قدموں سے لپٹ رہی ہوں تو آپ اسے دشمنی کہہ رہے ہیں۔ آپ کیسی دوغلی باتیں کرتے ہیں۔ مجھے سمجھائیے کہ جو پہلے محبت تھی وہ اب دشمنی کیسے ہوگئی؟"

وہ بڑی بے بسی سے بولا۔

"میں کیسے سمجھاؤں؟ دراصل پہلے میں نے غلط کہا تھا۔ ہم نے جو کچھ کیا۔ وہ محبت نہیں تھی..... بے شرمی تھی۔"

"اچھا تو اب آپ شرم کریں۔ اس بے شرمی کو محبت میں بدل دیں۔ مجھ سے شادی کرلیں۔"

صفیہ ایسے ہی وقت کے لیے ڈر رہی تھی کہ وہ چھوکری کبھی سوکن بننے کی ضد نہ کرے اسی لیے وہ اپنے شوہر سے اسے دور بھگاتی رہی تھی مگر وہ تو جونک کی طرح چمٹ گئی تھی اور اب شادی کا مطالبہ شروع کردیا تھا۔ صفیہ اسے مارنے کے لیے آگے بڑھی۔

"کمینی تو میری سوکن بننا چاہتی ہے۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

شبانہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"تم خود ہی تو کہہ رہی تھیں مجھے شادی کرلینی چاہیے۔ میں کوئی ایسی ویسی لڑکی تو ہوں نہیں کہ شادی کا سبق تمہارے میاں سے پڑھ کر آموختہ کسی دوسرے کو سناؤں۔ کیا

تم بھی انور صاحب سے شادی کرنے سے پہلے کہیں سے سبق پڑھ کر آئی تھیں؟"

"اری او حرافہ! میں تیری زبان کھینچ لوں گی۔"

"یعنی میری یہ بات اتنی بری ہے کہ تم میری زبان کھینچ لوگی اور تم جو یہی شرمناک مشورہ مجھے دے رہی ہو تو ایسے وقت ایک عورت ہو کر تمہیں ذرا بھی شرم نہیں آتی۔ کیا تم ذرا بھی انصاف سے نہیں سوچتیں کہ میں غریب ہوں تو کیا ہوا' بازاری نہیں ہوں۔ ہر شریف لڑکی کی طرح میرا بھی خدا ایک ہے' میرا مرد بھی ایک ہی ہوگا۔ میں اپنی جان دے دوں گی مگر کسی دوسرے مرد کا منہ نہیں دیکھوں گی۔"

"بڑی آئی شریف زادی۔ میں تجھے اپنی سوکن نہیں بننے دوں گی۔" پھر وہ انور سے بولی "آپ خاموش کیوں بیٹھے ہیں۔ کیا آپ بھی اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟"

انور نے کہا "شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شبانہ! میں تمہیں سمجھا چکا ہوں کہ ہماری عمروں کے درمیان زمین و آسمان کا فاصلہ ہے۔ ہمیں میاں بیوی کے روپ میں دیکھ کر دنیا والے مذاق اڑائیں گے پھر یہ کہ میرا بڑھاپا ایک ایسا پرانا شکستہ سا پلنگ ہے جو زیادہ عرصہ تک جوانی کا بوجھ نہیں برداشت کرسکے گا۔ کسی بھی وقت ٹوٹ جائے گا۔"

شبانہ نے کہا "میں بھی آپ سے کہہ چکی ہوں کہ آپ کے لیے بھری جوانی میں بوڑھی بن جاؤں گی لیکن آپ سے دور نہیں رہوں گی۔"

صفیہ اپنے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر پاگل ہوجانے کے انداز میں چیخنے لگی۔

"یہ مصیبت کسی طرح میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی اور میں اپنے اوپر سوکن کبھی برداشت نہیں کروں گی۔ میرے سرتاج! میرے مجازی خدا! جب آپ ہی نے اسے گلے لگا کر مجھ سے دشمنی کی ہے تو میں کسی کو کیا الزام دوں؟ اب آپ اس سے بیاہ رچائیں۔ میں یہ گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ کہیں جا کر اپنی جان دے دوں گی۔"

وہ غصے میں منمناتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ انور جمال نے آگے بڑھ کر اسے آواز دی۔

"صفیہ! ٹھہر جاؤ' پاگل نہ بنو۔ اتنی رات کو تنہا کہاں جاؤ گی؟"

شبانہ نے پیچھے سے قمیص کا دامن پکڑ کر پوچھا۔

"آپ مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں؟"

اس نے بڑی نرمی سے التجا کی۔

"میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جا رہا ہوں۔ مجھے صفیہ کو روکنے دو۔ اگر وہ غم اور غصے کی حالت میں جان پر کھیل گئی تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔"

وہ جلدی سے پیچھا چھڑا کر کمرے سے باہر آیا پھر دوڑتا ہوا ڈرائنگ روم سے گزر کر باہر پورچ میں آیا۔ صفیہ کوٹھی کے احاطے سے باہر جا رہی تھی۔ وہ دوڑتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا پھر ہانپتے ہوئے بولا۔

"وہ نادانی کر رہی ہے۔ خدا کے لیے عقل سے کام لو اتنی رات گئے باہر نہ جاؤ۔"

"تو کیا اسے سوکن بنا کر بٹھا لوں؟ اس سے پہلے کہیں جا کر اپنی جان دے دوں گی۔"

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں' اس سے شادی نہیں کروں گا۔ اس سے نجات پانے کی ایک تدبیر ہے۔ اگر تم میرا ساتھ دو....."

"کیا تدبیر ہے' جلدی بتائیے؟"

"صفیہ! تم آج رات شبانہ کو اپنے گھر میں برداشت کر لو۔ کل تم ہنستے بولتے اسے رخصت کرتے وقت کہنا کہ وہ ہر رات ہمارے یہاں آجایا کرے۔ اس طرح وہ شادی کے لیے ضد نہیں کرے گی۔"

"آخر کو آپ مرد ہیں نا' اپنے فائدے والی تدبیر سوچیں گے۔ میں اسے ایک منٹ کے لیے برداشت نہیں کروں گی۔"

"صفیہ! پہلے تم میری پوری بات تو سن لو۔ میری تدبیر یہ ہے کہ کل جب وہ اپنے گھر چلی جائے گی تو ہم اپنا سامان باندھیں گے' کوٹھی لاک کریں گے اور کسی دوسرے شہر چلے جائیں گے پھر جب تک شبانہ کی شادی کی خبر نہ ملے' واپس نہیں آئیں گے۔ ٹھیک ہے؟"

صفیہ نے خوش ہو کر اس کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا۔

○☆○

وہ کراچی چھوڑ کر صفیہ کے ساتھ حیدر آباد آگیا اور وہاں دو بیڈ روم ایک ڈرائنگ روم کی چھوٹی سی کوٹھی کرائے پر لے لی۔ یہ بات صرف اس کی بیٹی داماد اور اس کے جنرل منیجر کو معلوم تھی۔ جنرل منیجر دفتری معاملات کے سلسلے میں رابطہ رکھتا تھا۔ وصائمہ اور توفیق یہ مخبری کرتے تھے کہ شبانہ کس حال میں ہے اور شادی کے لیے راضی ہو رہی ہے یا

نہیں؟"

پہلے دو ہفتوں تک خبر ملتی رہی کہ شبانہ بولائی بولائی سی پھرتی رہتی ہے۔

"کب تک ماری ماری پھرے گی۔ آخر ہار پچھتا کر شادی کر لے گی۔ جوان لڑکی ہے اسی طرح گھومتی پھرتی رہے گی تو غنڈے بدمعاش اٹھا کر لے جائیں گے۔"

انور جمال اس سے پیچھا چھڑا کر آ تو گیا تھا مگر اس کا ضمیر ملامت کر رہا تھا کہ ایک لڑکی کو بچپن کی ٹھنڈی چھاؤں سے نکال کر اس نے جوانی کی دھوپ میں جلنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ آخر کوئی تو خطا ہوتی ہے جس کی سزا خطا وار کو دی جاتی ہے۔ شبانہ نے کون سی غلطی کی تھی؟ اس نے اپنی معصوم راتوں میں اسے بلایا نہیں تھا' وہ خود محبت کا فریب دینے اور اس کی نیند کا سودا کرنے پہنچا تھا۔

جب سودا طے ہو گیا تو وہ اب قیمت ادا کرتے رہنے سے کترا رہا تھا۔ اپنا گھر' اپنی بیوی اور اپنی عزت کی سلامتی کے لیے ایک مجبور لڑکی کو بے عزتی کی راہوں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ آیا تھا اور اب چپ چاپ پچھتا رہا تھا۔ کھانے کے لیے بیٹھتا تو نوالہ حلق سے نہ اترتا۔ نگاہوں کے سامنے وہ گلی گلی اسے پکارتی نظر آتی۔ راتوں کو کروٹیں بدل بدل کر صبح کر دیتا۔ یہی سوچتا رہ جاتا کہ وہ سر کھجا کھجا کر جاگ رہی ہوگی۔

صفیہ اپنے شوہر کی خاموش پریشانیوں کو سمجھ رہی تھی۔ وہ اس کی دل جوئی کرتی تھی۔ اس کے لیے دیر تک راتوں کو جاگنے لگی تھی۔ بیوی کی خدمت گزاری دیکھ کر وہ سوچتا کہ صفیہ کا بھی کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ بھی اپنے سہاگ کی سلامتی کے لیے اسے شبانہ سے چھڑا کر لائی ہے اور اپنے حقوق کو بحال رکھنے کی خاطر اپنے فرائض ادا کر رہی ہے۔

قصور اس کا بھی نہیں تھا اور اس کا بھی نہیں تھا۔ وہ خود ہی خطاوار تھا۔ دو ماہ گزر گئے خبر ملی کہ جس کوٹھی کو وہ لاک کر کے آئے تھے' اس میں سے ٹی وی' ریڈیو' گھڑی اور دوسری قیمتی چیزیں چوری ہو گئیں۔ پانچ ماہ بعد ایسٹرن تمباکو کمپنی سے نوٹس ملا کہ انور جمال ایجنسی کی کارکردگی مایوس کن ہے اگر کاروبار پر توجہ نہ دی گئی تو ایجنسی ختم کر دی جائے گی۔

انور جمال نے صرف ایک غلطی کی تھی اور اس کا ردعمل چاروں طرف سے نقصان

اور تباہی کی صورت میں ظاہر ہو رہا تھا۔ ایک روز صائمہ اور توفیق ان سے ملنے حیدر آباد آئے۔ توفیق نے کہا۔

"انکل! آپ اس لڑکی کی وجہ سے کس طرح تباہ ہو رہے ہیں۔ یہ آپ خود سمجھ رہے ہیں مگر وہ نہیں سمجھتی۔ اس نے اب تک شادی نہیں کی۔ آپ کب تک اپنا گھر اور کاروبار چھوڑ کر یہاں بیٹھے رہیں گے۔"

انور جمال اس سلسلے میں اپنے داماد سے باتیں کرتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ اسے شدت سے احساس ہوتا تھا کہ سسر اور داماد کے درمیان یہ موضوع انتہائی شرم ناک ہے۔ اسے کہیں ڈوب مرنا چاہیے۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ توفیق نے پوچھا۔

"انکل! آپ نے جواب نہیں دیا؟"

"کیا جواب دوں۔ بس ایک ہی راستہ ہے کہ مر جاؤں۔"

صفیہ نے کہا "مریں آپ کے دشمن.... آپ ہمیشہ مجھے دکھ پہنچانے والی باتیں سوچتے ہیں۔ اس حرافہ کا کیا جائے گا۔ آپ کے بعد وہ کسی سے شادی کر لے گی۔ میں کس کے سہارے جیئوں گی؟"

وہ ایک دم سے جھلا گیا "میں کیا جانوں کہ تم کس طرح جیئو گی۔۔ میں بھی تو مر مر کر جی رہا ہوں۔ میری بھوک مر گئی۔ میری نیند اڑ گئی۔ میری عزت خاک میں مل گئی۔ میرا کاروبار تباہ ہو گیا۔ اب زندہ رہنے کے لیے کیا رہ گیا ہے؟ کچھ نہیں..... جب کچھ نہیں رہا تو مجھے جلد از جلد اپنی موت کا آخری فیصلہ کرنا چاہیے۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلتا ہوا ڈرائنگ روم سے نکلا پھر کاریڈور سے گزرتا ہوا بیڈ روم میں پہنچ گیا۔ کمرے میں پہنچتے ہی وہ چونک گیا۔ کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس شبانہ کھڑی ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی دل دھک سے رہ گیا۔ وہ بچپن کی شاخ سے ٹوٹی ہوئی کلی، جوانی کی بہار میں آکر اجڑ گئی تھی۔ اس کے لانبے بال گرد سے اٹے ہوئے تھے شکن آلود لباس کتنی ہی جگہ سے پھٹا ہوا تھا، ننگے پیروں میں تلاش کے چھالے پڑے ہوئے تھے۔ جو پھوٹ کر زخم بن گئے تھے۔

انور نے سوچا "اب یہ میری بے وفائی پر طعنے دے گی۔ صفیہ کی طرح منہ سے گالیاں بھی نکالے گی اور پھر سے ہنگامے کھڑے کرے گی۔" لیکن جب اس نے دونوں بازو

پھیلائے تو وہ دوڑتی ہوئی آکر اس کے سینے سے چپک گئی۔

انور نے پھر سوچا "اب یہ روئے گی اور اسے چھوڑ کر آنے کی شکایتیں کرے گی...." لیکن وہ بالکل چپ تھی۔ اس نے کچھ پوچھنے کے لیے اپنے بازوؤں کی گرفت ذرا ڈھیلی کی تو وہ فرش پر گرنے لگی۔ تب پتہ چلا کہ وہ بے ہوش ہو چکی ہے۔ اس نے اسے سنبھال کر فرش پر لٹایا۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں ایسی معصوم اور مظلوم نظر آ رہی تھی کہ انور جمال مارے شرم کے رونے لگا۔

رونے کی کیا ضرورت تھی؟ اس لڑکی نے تو شکایت نہیں کی تھی۔ اس کا زخم کی طرح کھلا ہوا چہرہ بتا رہا تھا کہ وقت نے اس کے منہ پر کتنے طمانچے مارے ہیں۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بول رہی تھی اس کے پاؤں کے چھالے کہہ رہے تھے کہ وہ سات ماہ سے دوڑتے دوڑتے آج منزل پر پہنچ کر بے ہوش ہو گئی ہے۔ اس کی دوڑ بے ہوش ہونے کی حد تک نہیں تھی۔ اگر وہ نہ ملتا تو وہ باؤلی زندگی کی انتہا اور موت کی ابتدا تک دوڑتی رہتی۔

انور جمال نے تڑپ کر سوچا کہ اسے کاندھے پر لاد کر کہیں دور بھاگ جائے۔ ساری دنیا سے ناطہ توڑ لے۔ سوچنا تو بہت آسان ہوتا ہے لیکن اس پر عمل کرنے کا وقت آتا ہے تو پاؤں میں پرانے رشتوں کی زنجیر پڑ جاتی ہے۔ سوسائٹی سے حاصل کی ہوئی عزت ہاتھ تھام لیتی ہے اور سب سے بری بزدلی ہوتی ہے جو ڈانٹ کر ایک طرف بٹھا دیتی ہے۔

وہ سوچنے کے دوران اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کرتا رہا۔ وہ ہوش میں آئی تو نگاہوں کے سامنے اپنے محبوب کو دیکھتے ہی رونے لگی۔ انور جمال نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"میں شرمندہ ہوں کہ تمہیں چھوڑ کر یہاں چلا آیا۔"

"آپ کیوں شرمندہ ہوتے ہیں۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ باجی نے ہم کو چھڑایا ہے۔"

اسے اطمینان ہوا کہ وہ اسے فریبی نہیں سمجھ رہی ہے۔ اس نے پوچھا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں۔"

"جب سے آپ غائب ہوئے تھے، میں ہر ایک سے پوچھتی پھرتی تھی۔ صائمہ تو کبھی

نہ بتاتی۔ اس لیے میں دفتر کے لوگوں کے پیچھے پڑگئی۔ وہاں بھی کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ آخر تھک ہار کر مجھے ذرا بے شرم بننا پڑا۔ میں نے چپراسی کو مسکرا کر دیکھا تو اس نے مجھے بتا دیا کہ جنرل منیجر کے سوا کوئی بھی صاحب کا پتا نہیں جانتا ہے۔ پھر میں نے آپ کے نوجوان منیجر سے عشق شروع کردیا۔ ایک دن اس کے ساتھ پارک گئی' دوسرے دن سنیما دیکھا۔ آج تیسرے دن اس نے اپنے گھر بلایا۔ میں نے کہا۔ صرف ایک شرط پر آؤں گی۔ پہلے اپنے صاحب کا پتا بتاؤ۔ بے چارے عاشق نے بتا دیا۔ میں یہاں آگئی۔ وہ وہاں اپنے گھر میں میرا انتظار کر رہا ہوگا۔"

انور جمال اسے یک ٹک دیکھنے لگا۔ جو لڑکی صرف سر کھجانے اور جوئیں مارنے کے سوا کچھ نہیں جانتی تھی۔ اسے انور جمال کے عشق نے اتنا چالاک بنا دیا تھا کہ اب وہ دوسروں کو عشق کا فریب دے کر اپنی منزل کا سراغ لگا لیتی ہے۔ کوئی عورت چالاک بن کر پیدا نہیں ہوتی' مرد کے ہاتھوں میں کھیلنے کے بعد مکاری سے جینے کے ڈھنگ سیکھتی ہے۔

انور جمال کو مزید کچھ کہنے سننے کا موقع نہ ملا۔ صفیہ' صائمہ اور توفیق وہاں پہنچ گئے۔ شبانہ کو دیکھتے ہی پھر ہنگامہ شروع ہوگیا کہ وہ کیوں آئی؟ کیسے آئی؟ اسے مار پیٹ کر گھر سے نکالو.... شبانہ تھکن سے نڈھال تھی پھر بھی میدان میں جم کر کھڑی ہوگئی۔ توفیق نے کہا۔

"لڑائی جھگڑے سے کچھ حاصل نہ ہوگا بلکہ ہم یہاں بھی بدنام ہوجائیں گے۔"

صفیہ نے غصے میں پوچھا "کیا میں بدنامی کے ڈر سے اسے اپنی سوکن بنالوں؟"

شبانہ نے عاجزی سے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"باجی! میں لڑنا بھی جانتی ہوں اور مجھے جھکنا بھی آتا ہے۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ مجھے آپ کی عالی شان کوٹھی نہیں چاہیے۔ آپ کے شوہر کی دولت کا ایک پیسہ بھی نہیں چاہیے۔ میں آپ کی سوکن بھی نہیں بننا چاہتی۔ میں تو صرف اتنا چاہتی ہوں کہ آپ انور صاحب کو مجھ سے دور نہ کریں.... نہ کریں باجی! نہیں تو مرتے دم تک اسی طرح لڑتی رہوں گی۔"

توفیق نے انور جمال سے کہا۔

"انکل! آپ اس لڑکی کو اپنا آخری فیصلہ سنا دیں کہ یہ ساری عمر لڑتی رہے گی تب

بھی آپ اسے دھتکارتے رہیں گے۔"

کمرے میں ایک طرف شبانہ کھڑی تھی۔ دوسری طرف بیوی بیٹی اور داماد تھے۔ ان کے ساتھ خاندانی عزت اور سماجی نیک نامی تھی۔ شبانہ کے ساتھ صرف اس کی دیوانگی تھی۔ لہٰذا اسے داماد کی بات ماننی پڑی۔ اس نے ذرا سخت لہجے میں پوچھا۔

"شبانہ تم کیا چاہتی ہو کہ میں بیٹی اور داماد کی نظروں سے بھی گر جاؤں؟ تم خود سوچو کہ تم نے مجھے کہاں کہاں بدنام نہیں کیا۔ تمہاری وجہ سے میرا کاروبار تباہ ہوگیا۔ میرا گھر جہنم بن گیا اور میں خانہ بدوش کی طرح بے گھر ہو کر رہ گیا ہوں۔ میں تم سے آخری بار کہتا ہوں کہ میرا پیچھا چھوڑ دو ورنہ....."

شبانہ نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

"ورنہ آپ یہاں سے بھاگ کر کسی دوسری جگہ چلے جائیں گے۔ آپ کیسے مرد ہیں۔ بیوی کہتی ہے کہ مارو تو آپ مجھے مارنے لگتے ہیں۔ داماد کہتا ہے کہ چھوڑو تو آپ مجھے چھوڑنے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔ آپ کے پاس اپنا دماغ اور اپنے ارادے نہیں ہیں۔"

انور جمال نے کہا "ہر انسان کے پاس اپنا دماغ ہوتا ہے لیکن سوسائٹی میں اپنا مقام بنانے کے لیے اور خاندان میں اپنی عزت کو قائم رکھنے کے لیے اسے دوسروں کی خواہش کے مطابق عمل کرنا پڑتا ہے۔ تم مجھ سے بحث نہ کرو۔ یہاں سے چپ چاپ چلی جاؤ۔"

وہ ہاتھ نچا کر بولی "آپ نے کہا اور میں چلی گئی۔ واہ میری بے غرض محبت کا بہت اچھا صلہ دے رہے ہیں۔"

"مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔" وہ چیخ کر بولا۔

"ہے۔" وہ بھی چیخ کر بولی "آپ بیوی اور داماد کے ڈر سے انکار کر رہے ہیں۔ آج آپ کو ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کرنا ہوگا کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ ورنہ میں یہیں جان دے دوں گی۔"

"تم مر جاؤ مگر میں یہی کہتا رہوں گا کہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔"

"اچھا تو میں مر کر دکھاؤں؟"

وہ کمرے میں چاروں طرف یوں نظریں دوڑانے لگی جیسے مرنے کے لیے کوئی ہتھیار

تلاش کر رہی ہو پھر وہ تیزی سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ صفیہ نے کہا۔

"خس کم جہاں پاک۔ اچھا ہے کہ کہیں جا کر مرجائے۔"

صائمہ نے پریشان ہو کر کہا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں وہ سچ مچ جان دینے نہ چلی گئی ہو۔"

توفیق نے کمرے سے جاتے ہوئے کہا۔

اگر اس نے یہاں خودکشی کی تو ہم سب بری طرح پھنس جائیں گے۔ اسے یہاں سے دور بھگانا ہوگا۔"

اس نے معقول بات کہی تھی۔ سب ہی کمرے سے نکل کر اسے تلاش کرنے لگے۔ انہوں نے دوسرے بیڈ روم اور ڈرائنگ روم میں دیکھا پھر کوٹھی سے باہر آ گئے۔ کچن میں کسی نے نہیں دیکھا۔ باہر بھی اسے نہ پا کر انہیں اطمینان ہو گیا کہ وہ ان کی رہائش گاہ سے دور جا کر مرے گی۔"

وہ سب باتیں کرتے ہوئے کوٹھی میں داخل ہوئے۔ پھر ڈرائنگ روم میں آئے وہاں شبانہ کو دیکھتے ہی ان کا اطمینان غارت ہو گیا۔ وہ شرابیوں کے انداز میں ایک صوفے پر نیم دراز تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک بوتل تھی' بوتل شراب کی نہیں مٹی کے تیل کی تھی۔ اس نے بوتل کو بلند کرتے ہوئے انور جمال سے کہا۔

"میں آپ کی خواہش کے مطابق مر رہی ہوں۔ آدھی بوتل پی لی ہے۔ آدھی اور پینے سے پہلے آپ ایک بار ان سب کے سامنے ذرا جرات سے کہہ دیں کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔"

اس کی خودکشی کا اندازہ دیکھ کر سب ہی لرز گئے۔ توفیق نے گھبرا کر کہا۔

"یہ یہاں مرے گی تو ہم سب تھانے میں نظر آئیں گے۔"

وہ بوتل کو منہ سے لگانے جا رہی تھی۔ انور جمال نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے بوتل چھینتے ہوئے کہا۔

"توفیق میاں! فوراً ہی کار گیراج سے نکالیں۔ اسے اسپتال لے جانا ہوگا۔"

توفیق باہر چلا گیا۔ صفیہ نے کہا۔

آپ کیوں اس سے ہمدردی کر رہے ہیں۔ کار میں لے جا کر کہیں چھوڑ آئیے۔ اس

کے مرنے کے بعد کسی کو بھی پتہ نہیں چلے گا کہ ہمارا اس سے کوئی تعلق تھا۔"

"بکواس مت کرو۔ میں تم سب لوگوں کی خاطر مجبور ہو کر شبانہ سے بے وفائی تو کر سکتا ہوں مگر اس کا قاتل نہیں بن سکتا۔"

وہ اسے بازوؤں میں اٹھا کر لے جانے لگا۔ مٹی کے تیل کی گرمی سے شبانہ کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ نے زبان سے نہیں کہا مگر عمل سے ثابت کر دیا ہے کہ آپ کو مجھ سے محبت ہے۔ بس میں جیت گئی۔"

اتنا کہہ کر اس نے اپنا سر بوڑھے محبوب کے شانے پر رکھ دیا پھر بڑی آسودگی سے آنکھیں بند کر لیں۔

طبی امداد بروقت پہنچائی گئی تھی اس لیے وہ مرتے مرتے بچ گئی اور بچنے کے بعد پھر مصیبت بن گئی۔ انور جمال نے جب اسے اسپتال سے لے جانے کی اجازت مانگی تو ڈاکٹر نے کہا "سوری! ابھی نہیں۔ میں ذرا ایک کیس نمٹا کر پولیس انسپکٹر کو کال کروں گا۔ آپ کو یہ بیان دینا ہوگا کہ لڑکی خودکشی کیوں کرنا چاہتی تھی۔"

انور جمال' صفیہ' صائمہ اور توفیق سب ہی بوکھلا گئے۔ صفیہ نے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! ہم شریف لوگ ہیں۔ تھانہ کچہری سے دور ہی رہتے ہیں۔ پلیز آپ مریضہ کو چھٹی دے دیں۔"

"محترمہ میں مجبور ہوں۔ یہ اسپتال والوں کا نہیں' پولیس والوں کا کیس ہے۔ آپ میرا وقت ضائع نہ کریں۔"

وہ سب باری باری خوشامدیں کرتے رہے مگر ڈاکٹر نے ایک نہ سنی توفیق نے وارڈ بوائے کو ایک طرف لے جا کر معلوم کیا کہ ڈاکٹر صاحب کو رشوت دے کر کام چل سکتا ہے یا نہیں؟" وارڈ بوائے نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔

"ڈاکٹر صاحب بہت سخت آدمی ہیں آپ بھولے سے بھی ان کے سامنے رشوت کا نام نہ لیں۔"

صفیہ نے کہا "پتا نہیں وہ پولیس آفیسر کس مزاج کا ہوگا۔ اگر اس نے بھی رشوت لینے سے انکار کر دیا تو یہ بدنامی عدالت اور اخبارات تک پہنچے گی۔"

پھر وہ انور جمال سے بولی "اسی دن کے لیے سمجھایا جاتا تھا کہ انسان کو ہوس میں اندھا نہیں ہونا چاہیے۔ آپ کے ایک گناہ کی سزا ہم سب کو مل رہی ہے۔۔۔۔"

انور جمال سر جھکا کر اپنے داماد کے سامنے سے گزر گیا۔ اب وہ اتنا نادم تھا کہ وہ خود اپنی صورت نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ زنانہ وارڈ کے قریب سے گزرتے وقت دل نے کہا کہ شبانہ کو ایک نظر دیکھ لوں مگر وہ دل پر جبر کرتا ہوا اسپتال سے باہر آگیا۔ کار اس نے صفیہ وغیرہ کے لیے چھوڑ دی۔ اور ٹیکسی میں بیٹھ کر کوٹھی پر واپس آگیا۔ اب اسپتال میں جو ہوتا ہے وہ ہوتا رہے۔ اس میں اب مزید بدنامی برداشت کرنے کا حوصلہ نہ رہا تھا۔ گھر پہنچتے ہی وہ کاغذ اور قلم لے کر بیٹھ گیا اور لکھنے لگا۔

"صفیہ۔۔۔۔! بہت ہو چکا۔ جو نہیں ہونا چاہیے تھا وہ بھی ہو چکا۔ میں یہ شکایت نہیں کروں گا کہ تم نے مجھے گالیاں دیں اور داماد کے سامنے طعنے بھی دیے۔ میں ایسی سزاؤں کا مستحق تھا۔

میں کسی سے فریاد بھی نہیں کر سکتا کہ میرا کاروبار تباہ ہو گیا اور میں گھر سے دفتر اور دفتر سے تھانے کچہری تک بدنام ہونے جا رہا ہوں۔ کیوں کہ تباہی اور بدنامی کے راستے میں نے خود اپنائے ہیں۔

میں مجرم بھی ہوں اور ظالم بھی۔ میں نے شبانہ جیسی معصوم لڑکی پر ظلم کیا ہے۔ اس کی آنکھوں سے کسی نوجوان محبوب کے سپنے نوچ کر اس کے دماغ میں ایک بوڑھے آئیڈیل کو بٹھا دیا۔ یہ بات میری سمجھ میں آگئی ہے کہ جب تک میں زندہ رہوں گا۔ وہ کسی سے شادی نہیں کرے گی۔ مجھے اب اس کے دماغ میں مر جانا ہوگا۔

ایک بار میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اس سے شادی کرلوں گا مگر وہ جذباتی فیصلہ تھا۔ مجھے عقل آگئی کہ میری بوڑھی جوانی ایک چراغ سحری ہے۔ کسی وقت بھی بجھ سکتی ہے۔ پھر ایک جوان بیٹی کا باپ ہو کر یہ سوچنا پڑتا ہے کہ کہیں میری دیکھا دیکھی میرا داماد بھی میری بیٹی پر سوکن نہ لے آئے۔ میں کیا بتاؤں کہ ہر طرف سے کیسی کیسی مار کھاتا رہا ہوں۔

ایسی مار کھائی ہے کہ کسی نے نہ کھائی ہوگی۔ بیوی کا اعتماد' بیٹی کی محبت' نواسے اور نواسیوں کا پیار' اپنا گھر' اپنا کاروبار' اپنی عزت اور نیک نامی سب کچھ ہار کر جا رہا ہوں۔ بے شک اس دنیا کی خوب صورتی میں سب کا حصہ ہوتا ہے۔ صرف بوڑھے اس لیے

حصہ نہیں لے سکتے کہ انہیں ساری عمر کی کمائی ہوئی محبت اور عزت کی پونجی ہارنی پڑتی ہے۔

صفیہ! مجھے تمہاری فکر نہیں ہے۔ کاروبار ختم ہونے کے بعد تمہارے پاس بقیہ زندگی گزارنے کے لیے کافی دولت اور اولاد کی محبت ہوگی۔ اب میں شبانہ کے کام آکر اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔ اب میں ایسی راہ سے گزرنے والا ہوں جہاں سے گزرنے کے بعد شبانہ مجبور ہو کر جوانی کی کڑی دھوپ میں کوئی اور سایہ ڈھونڈ لے گی۔

ہو سکے تو اب مجھے گالیاں نہ دینا۔

تم سب کا مجرم انور جمال۔"

اس نے خط کو مکمل کر کے پلنگ کے سرہانے والی میز پر رکھ دیا پھر گھر کے دروازوں کو بند کرتا ہوا باہر آگیا۔ باہر ایسی گہری تاریکی تھی جو گناہوں کو اور گناہگاروں کو چھپا لیتی ہے۔ وہ تاریکی میں چھپتا چلا گیا۔

جب بگڑی بننے پر آتی ہے تو بنتی ہی چلی جاتی ہے۔ اسپتال میں شبانہ کا بیان لینے والا پولیس انسپکٹر اتفاق سے توفیق کا دوست نکل آیا۔ لہٰذا خودکشی کے اقدام کا وہ کیس اسپتال سے باہر آتے ہی ختم کر دیا گیا۔ وہ لوگ شبانہ کو لے کر کوٹھی واپس آئے تو انور جمال کے بجائے ایک خط نظر آیا۔ اسے پڑھتے ہی پھر ایک بار کہرام مچ گیا۔ صفیہ رونے اور شبانہ کو گالیاں دینے لگی۔

شبانہ کو یقین نہیں آرہا تھا کہ جس کے لیے وہ جان دے رہی تھی۔ وہ خود کہیں جان پر کھیلنے چلا گیا ہے مگر ایک روز تو یقین آنا ہی تھا۔ اس رات وہ سب اسے تلاش کرتے ہوئے کراچی پہنچ گئے۔ دوسرے دن کراچی میں اسے تلاش کیا گیا۔ تیسرے دن اخبارات کے تلاش گم شدہ کے کالم میں اسے پکارا گیا۔ دور دور کے شہروں میں اپنے آدمی بھیجے گئے۔ آخر صفیہ نے دھاڑیں مار مار کر اپنے ہاتھوں کی چوڑیاں توڑ ڈالیں۔

شبانہ کے پاس توڑنے کے لیے چوڑیاں نہیں تھیں لیکن اتنے بڑے المیے سے کچھ تو ٹوٹنا ہے اس لیے اس کا دل ٹوٹ گیا۔ اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ وہ راتوں کو بھی جاگتی رہتی تھی۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ انور ہمیشہ کے لیے گم ہو گیا ہے۔ وہ چھپ چھپ کر صفیہ اور صائمہ کی کوٹھیوں کے چکر لگاتی تھی کہ شاید انور کبھی چھپ کر اپنی بیوی اور بیٹی

سے ملنے آئے تو وہ اس کے قدموں سے لپٹ جائے گی۔

چھ ماہ بعد اسے یقین کرنا پڑا۔ کیونکہ جہاں انور جمال کا بہت بڑا دفتر تھا۔ اب وہاں دوسرا دفتر کھل گیا تھا۔ جنرل منیجر ایک بار شبانہ سے دھوکا کھا چکا تھا۔ اس نے کہا۔

"میری جان! جو وہ بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔ کاروبار ختم ہو چکا ہے اور انور صاحب شاید اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ میرے پاس آجاؤ تم کو میں خوش کر دوں گا۔"

وہ نفرت سے تھوک کر صفیہ کی کوٹھی کی طرف چلی گئی۔ وہ سفید لباس پہنے اپنی کار میں بیٹھنے جا رہی تھی۔ شبانہ کو دیکھ کر اس نے خلاف توقع نرمی سے کہا۔

"شبانہ! اب میں تم سے شکایت نہیں کروں گی۔ جو کچھ ہوتا ہے' اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔ میں پہلے ایک وقت کی نماز بھی نہیں پڑھتی تھی۔ اب پانچوں وقت کی نماز پڑھتی ہوں' مجھے بڑا سکون ملتا ہے۔ کل صبح کی فلائٹ سے میں حج کرنے جا رہی ہوں۔ جانے سے پہلے میں ایک بار پھر تمہیں نصیحت کرتی ہوں۔ میری نادان بیٹی! اب ضد سے باز آجاؤ اور شادی کر لو۔ اپنے لیے نہ سہی انور صاحب کی روح کو سکون پہنچانے کے لیے شادی کر لو....."

شبانہ سر جھکا کر گھر واپس آئی تو اماں بی نے روتے ہوئے کہا۔

"کب تک مرنے والے کو تلاش کرتی رہے گی بیٹی! یہ شریف زادیوں کے لچھن نہیں ہیں۔ میں تیری ماں ہو کر تیرے قدموں پر سر رکھتی ہوں۔ خدا کے لیے شادی کے لئے ہاں کر دے....."

اماں بی نے اس کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ پھر ماں کے گلے لگ کر رونے لگی۔ اس دن کے بعد سے اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ وہ رفتہ رفتہ وقت پر کھانے لگی اور وقت پر سونے لگی۔ پہلے اس فکر میں بھوک مر جاتی تھی کہ انور اس کا ہوتے ہوئے بھی اس کا نہیں ہے اور اس انتظار میں نیند نہیں آتی تھی کہ تھپک کر سلانے والا شاید کسی وقت آجائے۔ جس چیز کی تمنا ہو اور وہ فنا ہو جائے تو تمنا کرنے والے یا والی کو رفتہ رفتہ صبر آجاتا ہے۔

شبانہ کے دل و دماغ میں اب بھی بچھڑے ہوئے پیار کی خوشبو تھی مگر صرف یاد

کرنے کی حد تک تھی۔ جو دکھائی نہ دے' جس کی آواز سنائی نہ دے اور کبھی حاصل نہ ہو سکے اس کی محبت صرف یادوں تک محدود ہو جاتی ہے۔ ایسے وقت دوسروں کی نصیحتیں سمجھ میں بھی آتی ہیں اور اثر بھی کرتی ہیں۔ جوان بیوائیں بھی دل و جان سے چاہنے والے خاوند کے مرنے کے بعد دوسری شادی کر لیتی ہیں اور وہ تو نہ بیوی تھی' نہ بیوہ۔ اپنے مستقبل کے لیے کچھ نہ کچھ تو فیصلہ کرنا ہی تھا۔ یوں بھی زمانہ خراب ہے اگر وہ جوانی کے سکوں کو اپنی پسند سے خرچ نہ کرتی تو کوئی اس بھرے خزانے کو زبردستی اٹھا لے جاتا۔

آخر ایک دن اس نے گھبرا کر کہا۔

"اماں بی! میں تمہاری ہر بات مان لوں گی مگر اب اس شہر میں نہیں رہوں گی۔ ہر دم گھبراہٹ سی ہوتی ہے۔ ہم کسی دوسرے شہر چلے جائیں گے۔"

اماں بی کی پڑوسن بہت دنوں سے اپنے بھائی کے لیے شبانہ کا رشتہ مانگ رہی تھی۔ اس کا بھائی لاہور میں ایک بہت بڑے جنرل اسٹور کا مالک تھا۔ اماں بی نے فوراً ہی بات پکی کر دی اور یہ طے کر لیا کہ شادی لاہور میں ہو گی۔ دو ہفتے بعد ہی ماں بیٹی گھر کا سارا سامان بیچ کر لاہور آ گئیں۔ اماں بی نے ایک کمرے کا مکان کرائے پر لیا اور شادی کی تیاریاں کرنے لگیں۔

شادی کے معنی ہیں خوشی۔ مگر شبانہ کے دل میں کوئی خوشی نہیں تھی۔ اس کو انور جمال کی یہ بات یاد تھی کہ شادی محض ایک دنیاوی رسم ہے۔ اس۔ لیے وہ دنیا میں رہنے کے لیے یہ رسم ادا کر رہی تھی۔ چونکہ اسے خوشی نہیں تھی اس لیے وہ شادی کے کسی کام میں ماں کا ہاتھ نہیں بٹاتی تھی۔ بازار سے کچھ خریدنا ہوتا تو اماں بی سر پر چادر ڈال کر خود ہی نکلتی تھیں۔ ایک روز وہ اچانک ہی بازار میں انور جمال سے ٹکرا گئیں۔

"ارے تم؟" وہ پریشان ہو کر بولیں "تم انور ہو نا؟"

وہ سر جھکا کر بولا "جی ہاں۔"

"وہی کراچی والے انور' یعنی صفیہ کے شوہر ہو۔"

"جی ہاں۔"

"تو تم۔ تم ابھی زندہ ہو؟"

"جی ہاں۔ شبانہ کیسی ہے؟ کیا شادی ہو گئی؟"

"اگلے جمعے کو شادی ہے مگر تمہیں دیکھے گی تو گھونگھٹ اتار کر پھینک دے گی اور تمہارے پیچھے پھر بھاگنے لگے گی۔"

"اماں بی! آپ ناحق پریشان ہوتی ہیں۔ میرا یہ روپ دیکھ کر اب وہ میرے پاس نہیں آئے گی۔"

"تم نے یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔

"میں بہت بزدل ہوں اس لیے خودکشی نہ کر سکا لیکن میرا ضمیر مجھے چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ ضمیر کے اس بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ میں خود کو سزا دوں۔ ایسی سزا جو میرے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی عبرت ناک ہو۔ ایسی سزا جو جوانی کو کاٹ کر بڑھاپے سے الگ کر دے اور آپ دیکھ رہی ہیں کہ میں اس حلیے میں یہ سزا پا رہا ہوں۔"

اماں بی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے سامنے وہ دھندلا سا نظر آرہا تھا۔ صاف طور پر پہچانا بھی نہیں جاتا تھا۔

اگلے جمعہ کو شبانہ دلہن بن کر رخصت ہوگئی۔ دوسرے دن سسرال میں ولیمے کی تقریب تھی۔ کوٹھی دلہن کی طرح سجائی گئی تھی۔ رنگ برنگے قمقمے جل بجھ رہے تھے اور مہمانوں کی تفریح کے لیے ورائٹی پروگرام پیش کیا جارہا تھا۔ ایک طوائف مجرا پیش کررہی تھی۔ وہاں جتنے بوڑھے تھے، وہ طوائف کی ایک ایک ادا پر نوٹوں کی بارش کررہے تھے۔

اس کے بعد نوجوان لڑکے لڑکیاں گٹار اور دف لے کر ناچ گانا پیش کرنے لگے۔ ان میں ایک شخص کے گانے کا انداز بہت مقبول ہورہا تھا۔ اسے بار بار اسٹیج پر بلایا جارہا تھا۔ پندرہ برس کی ایک لڑکی اسٹیج کے قریب کھڑی ہوئی تھی۔ شاید اسے اپنی عمر کا اندازہ نہ تھا اس لیے دوپٹے سے بے نیاز تھی۔ وہ دوڑتی ہوئی زنان خانے میں گئی۔ وہاں نئی نویلی دلہن شبانہ ولیمے کا سبز جوڑا پہنے ہوئے بیٹھی تھی۔ لڑکی نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"بھابی بھابی! آپ نے بھائی جان کا گانا سنا؟ سب ہی ان کی خوب تعریفیں کررہے ہیں۔"

"ہاں۔ یہاں تک آواز آرہی ہے۔"

"صرف آواز سے کیا ہوتا ہے۔ آپ میرے ساتھ چل کر انہیں دیکھیں۔ کتنے اسٹائل سے گاتے ہیں۔"

وہ شبانہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگی۔ شبانہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی ساس نے کہا۔

"چلی جاؤ بیٹی! بچی ضد کررہی ہے۔"

جانے کیسے شبانہ کو وہ رات یاد آگئی جب اس نے صفیہ باجی کے پاس آکر انور جمال کے گانے کی تعریفیں کی تھیں۔ وہ اپنی چھوٹی نند کے ساتھ زنان خانہ سے نکل کر اسٹیج کی طرف جانے لگی۔ اس وقت ہیجڑوں کی ایک ٹولی تالیاں بجاتی وہاں پہنچ گئی۔ ایک ہیجڑے نے تالی بجا کر تال پر کہا۔

"اے حضور شادی مبارک۔ تمہاری خوشی میں ہم بھی ناچیں گے۔"

دوسرے نے کہا "بدھائی دیں گے اور ناچیں گے۔"

تیسرے کہا "بدھائی دیں گے اور داد لیں گے اور ہاں انعام بھی لیں گے۔"

نوجوانوں نے رنگ میں بھنگ پڑتے دیکھ کر انہیں بھگانے کی کوشش کی مگر خسرے ایسی محفلوں میں پہنچ کر کمبل بن جاتے ہیں۔ ٹلنے کا نام نہیں لیتے۔ ایک خسرے نے دوسرے سے کہا۔

"اے انوری بیگم۔ یہ ایسے نہیں مانیں گے۔ آؤ ہم سب مل کر دہائی دیں۔"

مگر انوری بیگم چپ تھی (تھا) وہ یک ٹک شبانہ کو دیکھ رہی تھی (تھا) شبانہ جس نوجوان کے پاس کھڑی تھی۔ وہ اپنا سر کھجا رہا تھا۔

انوری بیگم نے ایک گہری سانس لے کر سوچا "اب میرا سر کبھی نہیں کھجائے گا۔"

اس نے ڈوبتے ہوئے دل سے ڈھولک اٹھا کر اپنے کاندھے سے لٹکائی۔ سر پر دوپٹے کو درست کیا پھر اس محفل سے منہ پھیر کر جانے لگی۔ (جانے لگا)

○☆○

اشکِ لازوال

کسی کے آنسو اپنے دامن تک
اور کسی کے درِ محبوب تک پہنچتے ہیں
کوئی روتا ہے تو دریا بہا دیتا ہے
کوئی دریا کے کنارے تاج محل بنا دیتا ہے۔

آج بھی کوئی یار سے بچھڑا، فراق کا مارا، آبدیدہ ہو کر دیکھتا ہے تو تاج محل اشکِ لازوال دکھائی دیتا ہے۔'

اشک لازوال

نیم پردہ نشیں دوشیزاؤں کی روشن پیشانیاں اور سیاہ غزالی آنکھیں بے نقاب تھیں۔ باقی نصف چہرے کی گلابی گلابی رنگت' نقاب کی مہین جالیوں سے جھلملا رہی تھی۔ عورتوں کے اس بازار میں نصف پردہ بھی غیر ضروری تھا لیکن ابھی ابھی شہنشاہ نورالدین جہانگیر اپنی راحت جاں ملکہ نور جہاں کے ساتھ وہاں سے گزر چکے تھے۔ اب شہزادوں کی باری تھی۔ ان باذوق شہزادوں کی نظریں گل رخوں پر ٹھہر ٹھہر جاتی تھیں اس لیے رسم نبھانے کی خاطر نصف پردہ لازمی ہو گیا تھا۔ ویسے بھی مینا بازار ہو یا بادشاہوں کی حرم سرا' بیگمات اور شہزادیاں زنخوں اور شہزادوں سے بس یوں ہی رسمی سا پردہ کرتی تھیں۔

شہزادہ شہریار طبعاً عیاش تھا۔ اس کی نگاہیں آفتابی و ماہتابی چہروں پر بھٹک رہی تھیں۔ وہاں کوئی گل بدن تھی تو کوئی سمن اندام' سب ہی اپنی اپنی جوانی کا بوجھ اٹھائے ادھر سے ادھر اتراتی پھر رہی تھیں۔ شہزادہ شہریار دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔

"کوئی کیتکی اور کوئی گلاب
کوئی مہرتن اور کوئی مہتاب
ادھر آتیاں ادھر جاتیاں
پھریں اپنے جوبن کو دکھلاتیاں۔"

"شہزادہ خرم عیاش نہیں تھا مگر حسن پرست ضرور تھا۔ حسن پھول میں یا پھول بدن میں' قدرت کی صناعی سے وہ منہ نہیں پھیرتا تھا۔ اس وقت بھی اس کی نظریں ایک حسین مہ جبیں پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ مہ جبیں شہزادے کی نظروں سے بے خبر پھولوں کی انجمن میں کھڑی ہوئی تھی۔ پھول بیچنے والی موتیے اور بیلے کے ہار لیے اس سے کہہ رہی تھی۔

"یہ ہار میری بیٹی نے تیار کیے ہیں۔ وہ جنم کی اندھی ہے۔ اس نے کبھی طلوع آفتاب کا نظارہ نہیں دیکھا۔ وہ نہیں جانتی کہ اس دنیا میں خوب صورتی کا معیار کیا ہے لیکن ذرا اس ہار کو دیکھیے اور اس کا حسن ترتیب ملاحظہ فرمائیے۔ موتیے اور بیلے کو اس ترتیب سے پرویا ہے کہ دونوں پھول ایک دوسرے میں ڈوب کر ایک پھول کی خاصیت پیش کر رہے ہیں۔ یہ ایک جنم کی اندھی کا کمال ہے۔"

مہ جبین نے ہار کو دونوں ہاتھوں میں لے کر تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"واقعی اگر ایک جنم کی اندھی نے اس ہار کو گوندھا ہے تو ایک حیرت انگیز کمال ہے۔ ہم اس کی منہ مانگی قیمت ادا کریں گے۔"

"اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ یہ انمول ہے۔ اس اندھی نے پیش گوئی کی ہے کہ یہ ہار جس کے گلے کی زینت بنے گا' وہ ولی عہد سے منسوب ہو جائے گی اور آئندہ ہندوستان کی ملکہ کہلائے گی۔"

مہ جبین کی غزالی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس کے ہاتھوں میں وہ ہار کانپنے لگا۔ ہندوستان کی ملکہ بننے کا خواب کون حسینہ نہیں دیکھتی لیکن وہ خواب ہار کی صورت میں تعبیر بن کر ایک دم سے گلے کے قریب آگیا تھا۔

"بیٹی آپ سوچتی کیا ہیں۔ اسے اپنے گلے کی زینت بنائیں اور اس اندھی کی پیش گوئی آزمالیں۔"

یہ کہہ کر اس نے مہ جبین کے ہاتھوں سے ہار لے لیا اور اسے پہنانے لگی۔ وہ ہار اس کے کانپتے ہوئے سینے پر آکر ٹھہر گیا لیکن گردن تک نہیں پہنچ سکا کیونکہ نصف چہرے پر پڑی ہوئی نقاب گردن اور سینے تک آرہی تھی اور صراحی دار گردن کے حسن کو چھپا رہی تھی۔ گل فروش خاتون نے کہا۔

"بیٹی یہاں کس سے پردہ کر رہی ہیں۔ یہاں تو عورتیں ہی عورتیں ہیں۔ آپ سے

درخواست کرتی ہوں کہ یہ نقاب رخ سے ہٹالیں۔ ایک اندھی کا ہار اور ہندوستان کا تاج آپ کا منتظر ہے۔ نصیبی

وہ مہ جبین گم صم کھڑی تھی اور اپنے بڑوں کی کہاوتیں یاد کر رہی تھی جو "نابینا ہوتے ہیں' وہ آج کا سورج نہیں دیکھتے مگر آنے والے وقت کا چہرہ دیکھ لیتے ہیں" پھر اس اندھی کی بات پر کیوں یقین نہ کیا جائے جس نے بیلے اور موتیے کے ساتھ اس کی خوش نصیبی کو گوندھ کر بھیجا ہے۔

وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس ہار کو گلے لگانے کو جی چاہتا تھا لیکن حیا آڑے آرہی تھی۔ انکار ناممکن تھا اور اقرار محال۔ گل فروش خاتون نے اسے پس وپیش میں مبتلا پا کر اپنا ہاتھ بڑھایا اور رخ زیبا سے نقاب ہٹادی۔ نقاب یوں سرکتی گئی جیسے رات صبح کے چہرے سے سرکتی ہے۔ شہزادہ خرم پھولوں سے لدی ہوئی ٹوکریوں کے پیچھے محو نظارہ تھا۔ پھولوں کی انجمن میں گلاب سا چہرہ کھلتے دیکھ کر وہ آس پاس کی ساری دنیا کو بھول گیا تھا۔ وہ مقناطیسی حسن اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ وہ زیادہ دیر تک خود کو پوشیدہ نہ رکھ سکا۔ اسے قریب اور قریب سے دیکھنے کے لیے بے اختیار اس کے روبرو آگیا۔

اتنی دیر میں گل فروش خاتون اس مہ جبین کو وہ ہار پہنا چکی تھی۔ مہ جبین سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس کے گلابی رخسار تمتا رہے تھے۔ کسی کی آہٹ سن کر اس نے سر کو اٹھایا تو کلیجا دھک سے رہ گیا۔ عین نگاہوں کے سامنے ہاتھ بھر کے فاصلے پر شاہ بلند اقبال شہزادہ خرم کی صورت نظر آئی۔ چند لمحوں تک یقین اور بے یقینی کی کیفیت رہی۔ کھلی آنکھوں سے دیکھ کر بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ ہار کو گلے کی زینت بناتے ہی ایک اندھی کی پیش گوئی قدم قدم چل کر ولی عہد کے روپ میں سامنے آگئی ہے۔

شہزادہ خرم کا یہ حال تھا کہ وہ اس جیتی جاگتی دنیا سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ حسن و جمال کی رعنائیوں میں ڈوبتا جارہا تھا۔ عجیب طلسماتی حسن تھا۔ آنکھیں ہرنی کی طرح سہمی ہوئی تھیں اور سوالیہ بھی تھیں۔ رخساروں پر حیا کی لالی' لبوں پر ہلکی ہلکی لرزش اور پیشانی پر پسینے کے چمکدار موتی بکھرے ہوئے تھے۔ اس سیم تن کا قد ایسا اونچا پورا تھا جیسے ابھی زمین سے ماہتابی چھوٹی ہو۔ شہزادہ خرم سانس لیتے ہوئے تاج کا ابتدائی سپنا دیکھ رہا تھا۔

پھر وہ سپنا ٹوٹ گیا۔ اس مہ جبین کو ہوش آگیا کہ وہ خوابوں کی تعبیر کے روبرو آگئی

ہے۔ اس نے فوراً ہی رخ پھیرتے ہوئے چہرے کو نقاب میں چھپالیا پھر سرتاپا چھپنے کے
لیے پھولوں کے انبار کے پیچھے ہوگئی۔ وہاں عطر فروش کی دکان کی آڑ لیتے ہوئے خوشبوؤں
میں بستی بساتی اپنے وجود کی خوشبو لٹاتی، کچھ ڈولتی، کچھ ڈگمگاتی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔
وہ حسین مہ جبین شاہ ارجمند بانو، نواب آصف خان کی بیٹی اور ملکہ نورجہاں کی بھتیجی
تھی۔ شاہ بانو کے جاتے ہی گل فروش خاتون نے دست بستہ عرض کیا۔

"شہزادہ عالی جاہ! آپ کے حسب حکم شاہ بانو کو بے نقاب کرنا ممکن نہیں تھا لیکن
بندی نے حکم بجالانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ میں نے ایک خیالی پیش گوئی سنائی،
ملکہ ہندوستان کا سپنا دکھایا۔ اس طرح ان کی جلوہ نمائی کی لیکن میں نے ایک عورت کی
آنکھوں سے شاہ بانو کو دیکھا ہے۔ ان کی آنکھوں میں ملکہ ہندوستان بننے کا خواب برائے
نام تھا مگر آپ سے منسوب ہونے کی حیا ایسی تھی کہ وہ سر نہیں اٹھا رہی تھی۔ ہونٹوں کا
شرمیلا تبسم اس محبت کی چغلی کھا رہا تھا جو انہیں آپ کی ذات گرامی سے ہے۔"

شہزادہ خرم کی باچھیں خوشی سے کھلی جارہی تھیں۔ اس نے گل فروش کی خدمات
سے خوش ہوکر اپنے گلے سے سچے موتیوں کی مالا اتاری اور اس کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے
بولا۔

"انشاء اللہ اس خیالی اندھی کی پیش گوئی درست ثابت ہوگی۔ ہم اسے صرف
ہندوستان کی ہی نہیں اپنے دل کی ملکہ بھی بنائیں گے۔"

گل فروش خاتون انعام پاکر تعظیماً جھکتے ہوئے پرے ہٹ گئی۔ شہزادہ اس سراپا ناز
کے تصور میں گم ہوکر پھولوں کی انجمن سے باہر چلا گیا۔ باہر حسینوں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ اس
مینا بازار میں ہر صوبے اور ہر شہر کی رئیس زادیاں تھیں۔ ایک سے ایک ہنستے مسکراتے،
چمکتے دمکتے مکھڑے تھے جو پیاسی آنکھوں میں اترتے تھے اور دل میں سما جاتے تھے لیکن
ایسے شاہکار چہرے بھی شہزادے کا دھیان نہ بٹا سکے۔ معاً اس کی راہ میں ایک دوشیزہ آکر
کھڑی ہوگئی۔

ولی عہد کا راستہ روکنا آسان نہ تھا لیکن وہ بھی کوئی ایسی ویسی دوشیزہ نہیں تھی۔ وہ
ملکہ نورجہاں کی دختر لاڈلی بیگم تھی ملکہ ہند کی دختر ہونے کے باوجود وہ شہزادی نہیں کہلاتی
تھی کیونکہ وہ مہرالنسا بیگم (نورجہاں) کے پہلے خاوند شیر افگن کے صلب سے تھی۔

"لاڈلی بیگم! کیا بات ہے۔ آپ امی حضور کا ساتھ چھوڑ کر تنہا بازار کی سیر کر رہی
ہیں۔"

لاڈلی بیگم نے ایک ادائے ناز سے کہا "شہزادہ عالم ہمیشہ تجاہل عارفانہ سے کام لیتے
ہیں۔ ہم نے امی حضور کا ساتھ اس لیے چھوڑا ہے کہ آپ کی صحبت نصیب ہو۔ یہ صحبت
ہمارے لیے عزو شرف کا باعث ہوگی۔"

شہزادے نے آگے بڑھتے ہوئے کہا "ہم یہ محسوس کر رہے ہیں کہ آپ کی یہ آرزو
ہمارے بزرگوں کے سوچنے کا انداز بدل رہی ہے۔ اگر کبھی جواب طلبی ہوئی تو ہم صاف
کہہ دیں گے کہ ہمارے درمیان صرف بہن بھائی کے رشتے کے متعلق سوچا جائے۔ اس
سے زیادہ اور کچھ نہیں....."

"ہمارے درمیان بہن بھائی کا رشتہ نہیں ہے۔" وہ چیخ کر کہنے لگی "ملکہ عالیہ آپ
کی امی نہیں ہیں، صرف میری امی ہیں اور جہاں پناہ آپ کے والد ہیں میرے نہیں
ہیں۔"

"اس کے باوجود وہ ہم دونوں کے مشترکہ والدین ہیں اور ہم سعادت مند اولاد کی
طرح اس رشتے کی نفی نہیں کرسکتے۔"

یہ کہہ کر وہ جواب سنے بغیر اسے چھوڑ کر آگے بڑھتا چلا گیا۔

لاڈلی بیگم توہین کے احساس سے کھڑی تلملاتی رہی۔ شہزادے کے دل ودماغ پر شاہ
بانو چھائی ہوئی تھی۔ عشق وجنون میں یہ بھی نہ سوچا کہ اس نے نورجہاں کی لاڈلی بیٹی کی
دل شکنی کی ہے۔ بے شک وہ شہنشاہ جہانگیر کا بیٹا تھا اور ولی عہد سمجھا جاتا تھا لیکن
ہندوستان کی سیاسی بساط پر نورجہاں اپنی مرضی کے مطابق مہرے چلتی تھی۔ شہنشاہ جہانگیر
بھی اپنی چہیتی بیگم کے ہاتھوں میں محض ایک بے جان مہرہ تھا لہٰذا وہ کسی بھی وقت شہزادہ
خرم کو اٹھا کر سیاسی بساط سے باہر پھینک سکتی تھی۔

حکومت کا نشہ رشتوں کو کاٹتا ہے۔ محبت کا نشہ نئے رشتوں کو جوڑتا ہے۔ شہزادہ
ایک نئے رشتے کی دھن میں مگن رہا۔ دن گزر گیا، رات آگئی۔ دوبارہ ملاقات کی صورت
نظر نہیں آئی۔ ایک آفتاب سا چہرہ تھا۔ آفتاب مہ جبین تھی۔ جھکی جھکی سی گردن اور حیا
بار تبسم تھا جو رہ رہ کر دل کو تڑپا رہا تھا۔ نیند آنکھوں تک پہنچنا نہیں چاہتی تھی۔ آخر کار

سوچ بچار کے بعد یہی صورت نظر آئی کہ نامہ و پیام کا سہارا لیا جائے۔ شاید کہ امید بر آئے۔

وہ تمام رات جاگتا رہا اور نوک قلم سے حال دل بیان کرتا رہا۔ صبح ہوئی تو اس کے آس پاس کاغذ کے چھوٹے ٹکڑوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ یہ محبت نامے لاد کر لے جانے کے لیے کم از کم ایک خچر کی ضرورت تھی لیکن چوری چھپے پیغامات صرف کبوتر ہی لے جا سکتے تھے۔ مجبوراً اس نے دل کے تمام ٹکڑوں کو سنبھال کر رکھ لیا اور ایک مختصر سا محبت نامہ تحریر کیا۔

"راحت دل و جان

آبروئے تاج ہندوستان!

کل پھولوں کی انجمن میں ایک گلاب کو بے نقاب دیکھا۔ گلاب کا نام لکھنا بعید از مصلحت ہے۔ مبادا یہ نامہ کسی دشمن کے ہاتھ لگ جائے۔ عرض حال یہ ہے کہ اس گلاب کو ایک بار دیکھا ہے دوسری بار دیکھنے کی تمنا ہے۔ آج چودھویں کا چاند ہوگا' جمنا کا کنارہ ہوگا' نصف شب ہوگی اور ہم بارہ دری میں انتظار کریں گے۔ خدارا آیئے۔ ہم ایک اندھی کی پیش گوئی کو سچ ثابت کریں گے۔

دیدار کا متمنی

شہاب الدین خرم"

اس نے بصد شوق نامہ لکھ کر تہ کیا اور ایک کبوتر کے پنجے میں رکھ کر اسے چھلا پہنا دیا پھر اس نامے کو بڑی امیدوں سے چوم کر کبوتر فضا میں چھوڑ دیا۔ کبوتر خانے میں مختلف تربیت یافتہ کبوتر تھے جو مخصوص مقامات پر پیغام رسانی کا کام کرتے تھے۔ جو کبوتر نامہ محبت لیے جا رہا تھا' اس کی پرواز امین الدولہ آصف خان کی رہائش گاہ تک محدود تھی۔

شاہی محل کے چوبارے سے ایک خواجہ سرا نے اس کبوتر کو شہزادہ خرم کے محل سے پرواز کرتے اور آصف خان کی رہائش گاہ تک جاتے دیکھا تو لاڈلی بیگم تک اس کی اطلاع پہنچا دی اور لاڈلی بیگم نے اپنی والدہ ملکہ نور جہاں کے حضور یہ مسئلہ پیش کر دیا کہ ایسا کون سا پیغام ہے جسے شہزادے نے ایک کبوتر کے ذریعے ماموں جان آصف خان کے پاس بھیجا ہے۔ وہ پیغام نواب آصف خان کے نام ہے یا نواب زادی شاہ بانو کے نام۔ اگر

آصف خان کے نام ہے تو پھر یہ پیغام پوشیدہ سیاسی سرگرمیوں کی چغلی کھاتا ہے۔ اگر شاہ بانو کے نام ہے تو ماموں جان اپنی صاحبزادی کو ایک مہرہ بنا کر ولی عہد کی طرف بڑھا رہے ہیں۔

دونوں ہی باتیں تشویش ناک تھیں۔ ملکہ عالیہ دیر تک اپنی قیام گاہ میں ٹہلتی رہیں اور اس مسئلے پر غور کرتی رہیں پھر ایک قلما تنی کو طلب کیا جو تیر کمان سے لیس تھی۔ اسے حکم دیا کہ وہ چوبارے کی چھت پر کھڑی رہے۔ اگر کوئی کبوتر آصف خان اور شہزادہ خرم کی قیام گاہوں کے درمیان پرواز کرے تو اسے مار گرائے۔ قلما تنی حسب حکم چھت پر کھڑی رہی۔ صبح سے دوپہر ہوگئی۔ سہ پہر کو ایک کبوتر نظر آیا۔ اس کی پرواز بتا رہی تھی کہ وہ آصف خان کی رہائش گاہ سے چلا ہے اور اس کی منزل شہزادہ خرم کی رہائش گاہ ہے۔ قلما تنی نے تیر کمان پر چڑھایا اور نشانہ تاک کر اسے مار گرایا۔ نشانہ بھی درست تھا اور یہ اندازہ بھی درست نکلا کہ شاہ بانو اور خرم کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہے۔

ملکہ نور جہاں نے خون آلودہ کبوتر کے پنجے سے ایک تہ کیا ہوا کاغذ نکالا اور اسے کھول کر پڑھا۔ لکھا تھا۔

"شہزادہ بلند اقبال کی خدمت میں کنیز آداب عرض کرتی ہے۔ آپ جسے گلاب کہتے ہیں' وہ پہلے ہی کانٹوں میں گھرا ہوا ہے۔ اللہ ہمیں آزمائش میں مبتلا نہ کریں۔ ہمارے پیروں میں حیا کی زنجیر ہے اور والد صاحب کی عزت و شرافت کا پاس ہے۔ آپ سے التجا ہے کہ آپ ہماری مجبوریوں کا خیال کریں اور ہمارے انتظار میں اپنا قیمتی وقت ضائع نہ کریں۔ ہمیں آپ کے حکم سے انکار نہیں ہے۔ اگر شرافت کے دائرے میں کبھی موقع نصیب ہوا تو یہ کنیز آپ کے قدموں میں اپنی جان نچھاور کر دے گی۔

فقط......"

وہ نامہ' نامہ نگار کے نام سے خالی تھا۔ ملکہ عالیہ کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ نام نہ ہونے کے باوجود انداز تحریر بتا رہا تھا کہ اسے شاہ بانو نے لکھا ہے۔ اس خط سے ظاہر تھا کہ شاہ بانو بلاشبہ معصوم اور حیا پرور ہے۔ شہزادہ کسی جگہ اس کا انتظار کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے ملنے سے معذرت ظاہر کی تھی۔

بے شک شاہ بانو بے قصور تھی پھر بھی اس کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ ولی عہد اس کا دیوانہ بن گیا تھا اور اس دیوانگی میں اس نے ملکہ کی نور نظر لاڈلی بیگم کو نظرانداز کر دیا تھا۔ یہ محض لاڈلی بیگم کی ہی نہیں بلکہ ملکہ عالیہ کی بھی توہین تھی۔ وہ اب تک یہ منصوبہ بنائے بیٹھی تھیں کہ اپنی صاحب زادی کو ولی عہد سے بیاہ کرا کے ہندوستان کی ملکہ بنائیں گی۔ مگر اب یہ ان کی توہین تھی کہ جو شہزادہ ان کی صاحب زادی کو نظر سے گرا دے' اس سے جبراً رشتہ جوڑا جائے۔ ملکہ معظمہ کی صاحب زادی کے لیے رشتوں کی کمی نہیں تھی۔

اس روز ملکہ نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ آئندہ شہزادہ خرم کے بجائے شہزادہ شہریار ولی عہد کہلائے گا اور لاڈلی بیگم شہریار سے بیاہی جائے گی۔ عملی طور پر اس فیصلے سے پہلے لازمی تھا کہ شہزادے کو مزید عشق و محبت میں مبتلا کیا جائے۔ اسے مجبوراً فراق میں تڑپایا جائے۔ تب یہ ثابت ہو جائے گا کہ جس طرح حکومت کرنے والے محبت نہیں کر سکتے' اسی طرح محبت کرنے والے حکومت کے قابل نہیں رہتے۔

محبت کرنے والے ایک دیوانے بادشاہ کی مثال سامنے موجود تھی۔ ملکہ نور جہاں کا عشق رعایا سے بھی پوشیدہ نہ تھا۔ وہ ایسا عاشق تھا کہ مہرالنسا کو حرم سرا میں لے کر ملکہ نور جہاں بنانے کے بعد عقل و خرد سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ ہر وقت ملکہ کی آغوش میں خود کو گم رکھتا تھا۔ دیوانگی کا یہ عالم تھا کہ اس پری جمال جہاں آرا کی مرضی کے بغیر سانس تک نہ لیتا تھا۔

رفتہ رفتہ سلطنت کے امور اور تمام مہمات حکومت ملکہ کے قبضے میں آ گئی تھیں۔ محبت کرنے والے شہنشاہ جہانگیر کا صرف نام رہ گیا تھا۔ بادشاہ سلامت خود فرماتے تھے کہ ہم نے سلطنت بیگم کو دے دی ہے۔ ہمیں ایک پیالہ شراب اور آدھ سیر گوشت کے سوا کسی چیز کی حاجت نہیں ہے۔

وقت ثابت کر رہا تھا کہ محبت کرنے والے حکومت کے قابل نہیں رہتے۔ ملکہ معظمہ جھروکے میں آ کر جلوہ افروز ہوتی تھیں' امیر و وزیر حاضر ہو کر تسلیم و کورنش بجا لاتے تھے۔ سب ان کے احکام و فرامین کے مطابق عمل کرتے تھے۔ مختلف صوبوں کے امرا کو جو فرمان بھی بھیجے جاتے ان پر "حکم علیہ عالیہ مہر علیہ نور جہاں بیگم بادشاہ" کا طغرا ہوتا تھا۔ مہر شاہی کا یہ تھا۔

"نور جہاں گشت بحکم اللہ — ہمدم و ہمراز جہانگیر بادشاہ

خطبہ جہانگیر کے نام تھا لیکن سکے پر جو بیت نقش تھا' اس میں جہانگیر کے ساتھ بیگم کا نام بھی تھا۔

"بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور
بنام نور جہاں بادشاہ بیگم زر"

ملکہ معظمہ ایک عبرت ناک تاریخ مرتب کر رہی تھی۔ مرد کی دنیا میں جہاں عورت کا سکہ نہیں چلتا وہاں وہ اپنے نام کا سکہ چلا رہی تھی۔ فہم و فراست میں کوئی عورت اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی تھی۔ وہ دور رس نتائج پر نظر رکھتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ امرا' وزرا اور دیگر صوبے دار اس کے حکم اور بادشاہ کی دیوانگی پر پیٹھ پیچھے ناگواری سے تبصرے کرتے ہیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر وہ آئندہ ایسے بادشاہ کی بادشاہت کو تسلیم نہیں کریں گے جو باپ کی طرح کسی مہ جبین کے عشق میں دیوانہ ہو۔ لہٰذا شہریار کو ولی عہد بنانے کے لیے خرم کو دیوانہ عاشق بنانا ضروری تھا۔ ملکہ عالیہ کی سیاسی سوجھ بوجھ اور حکمت عملی یہی تھی۔

شہزادہ خرم شام ڈھلنے تک نامہ بر کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ نامہ بر ملکہ عالیہ کے سیاسی تیر کا نشانہ بن چکا ہے۔ رات ہوئی تو وہ مایوس ہو گیا کہ نواب زادی شاہ بانو نے محبت کا جواب محبت سے نہیں دیا۔ پھر خیال آیا کہ شاہ بانو نے موتیے اور بیلے کا ہار قبول کیا تھا اور گل فروش نے شہزادے کو یقین دلایا تھا کہ نواب زادی اس کی محبت دل میں چھپائے ہوئے ہے۔ یہ باتیں یاد آئیں تو امیدیں پھر سے جوان ہو گئیں۔ دل نے کہا کہ شاہ بانو اپنی فطری شرم اور حیا سے مجبور ہے' اس لیے خاموش ہے۔ خط کا جواب اس لیے نہیں دیا کہ دنیا والوں کا خوف دامن گیر ہو گا۔ اس کے باوجود جذبہ دل اسے جمنا کے کنارے کھینچ لائے گا۔

دوسری طرف شاہ ارجمند بانو شہ نشین کے ایک ستون سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ چودھویں کا چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ نگاہوں کے سامنے کوئی سو گز کے فاصلے پر بارہ دری تھی۔ شہزادہ خرم نے بارہ دری کا انتخاب اسی لیے کیا تھا کہ نواب زادی اپنے محل سے نکل کر تنہا یہ مختصر سا فاصلہ آسانی سے طے کر سکتی تھی۔ لیکن وہ خاموش

بیٹھی اپنے فیصلے پر پچھتا رہی تھی۔ جس شہزادے کا پیار وہ دل میں چھپائے رکھتی تھی۔ اس سے ملاقات کا ایک سنہری موقع اس نے گنوا دیا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ تالاب کی طرح ایک جگہ ٹھہر جانے سے منزل نہیں ملتی۔ منزل کو پانے کے لیے دریا کی طرح رواں دواں رہنا پڑتا ہے۔ وہ بے کل ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ کچھ دیر ادھر سے ادھر ٹہلتی رہی پھر زینے طے کر کے باغ میں چلی آئی۔ سامنے بارہ دری تھی اور اس سے پرے جمنا کا ساحل تھا۔ وہ منظر اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ جذبہ دل کی کشش تھی وہ اپنے دل کو سمجھاتے ہوئے آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی کہ شہزادہ اپنے محبت نامے کا جواب پا کر مایوس ہو چکا ہوگا۔ اب وہ نہیں آئے گا۔ بارہ دری دیران ہوگی۔ اس ویرانے میں جا کر وہ اس حقیقت پر غور کرے گی کہ فیصلے کی اہم گھڑی ہو اور وہ گھڑی گزر جائے تو اس بارہ دری کی طرح ویران ہو جاتی ہے۔

بارہ دری کے محرابی دروازے کے قریب پہنچتے ہی وہ ٹھٹک گئی۔ نجانے یک بیک کیسے اور کہاں سے شہزادہ خرم چلا آیا تھا۔ یوں خلاف توقع اسے دیکھ کر وہ گھبرا سی گئی۔ شہزادے نے ہاتھ آگے بڑھا کر استقبال کے لیے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"چشم ما روشن، دل ماشاد۔ ہمیں اپنی خوش نصیبی پر ناز ہے کہ آپ یہاں تشریف لائی ہیں۔ اگر آپ نہ آتیں تو ہم بدگمانیوں کا شکار ہو جاتے۔"

شاہ بانو نے جلدی سے رخ پھیر کر سر کا آنچل چہرے تک کر لیا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ شہزادے کے سامنے دوبارہ بے نقاب چلی آئے گی۔ وہ شہزادے کی قربت سے کچھ گھبراتے، کچھ شرماتے ہوتے کہنے لگی۔

"شہزادہ سلامت کا اقبال بلند رہے۔ کنیز کو توقع نہیں تھی کہ آپ یہاں تشریف لائیں گے۔ ہم نے ملاقات سے معذوری ظاہر کر دی تھی۔ کیا نامہ بر نے ہمارا نامہ آپ تک نہیں پہنچایا؟"

"آپ کا نامہ؟" شہزادے نے تعجب سے پوچھا "کیا آپ نے جواب دیا تھا؟ ہاں آپ سے غلط بیانی کی توقع نہیں ہے۔ لیکن وہ نامہ کہاں گیا اور ہمارا نامہ بر ہمارے پاس کیوں نہیں آیا؟"

"شاہ بانو نے پریشان ہو کر کہا "یا اللہ خیر! وہ نامہ کسی کے ہاتھ لگ گیا تو ہم مفت میں

بدنام ہو جائیں گے۔"

شہزادے نے بڑی بے باکی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "آپ سمجھتی ہیں کہ یہ ہاتھ ہمارے ہاتھوں میں آ کر بدنام ہو جائے گا۔ کیا آپ خرم کو کمزور اور بزدل سمجھتی ہیں؟"

"جی.... جی نہیں۔ آپ شہ زور ہیں۔ طوفانوں کا رخ موڑ سکتے ہیں لیکن آپ جانتے ہیں کہ حکومت کی باگ ڈور ملکہ عالیہ کے ہاتھوں میں ہے۔ وہ یہ امید لگائے بیٹھی ہیں کہ لاڈلی بیگم آپ سے منسوب ہوں گی۔ ایسی صورت میں انہیں اس ملاقات کا علم ہو جائے تو قیامت آ جائے گی۔"

شہزادے نے جواب دیا "ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ آپ ہم سے منسوب نہ ہوئیں تو قیامت آ جائے گی۔ امی حضور نے ہماری مخالفت کی تو ہم ان سے سمجھ لیں گے۔ فی الحال آپ دوستانہ ماحول میں دشمنوں کا تذکرہ نہ کریں۔ یہ جو قربت کا لمحہ ہے یہی ہماری آئندہ ازدواجی زندگی کا بنیادی لمحہ ہے اور اسی لمحے سے ہمارے پیار اور ہمارے اعتماد کا رشتہ مضبوط ہوگا۔ آیئے اعتماد کا پہلا ثبوت دیجئے۔ یہ نقاب رخ سے اٹھا لیجئے۔"

یہ کہہ کر شہزادے نے اسے سوچنے اور سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ ہاتھ بڑھا کر چہرے سے آنچل ہٹا دیا۔ وہ حیا سے سمٹی جا رہی تھی اور وہ حیرت سے سانس لینا بھول گیا تھا۔ اس کے سامنے اجلی شفاف چاندنی شاہ بانو کے روپ میں مجسم ہو گئی تھی۔ وہ حسن بے مثال کے دیدار میں اس طرح محو ہو گیا کہ نہ بات یاد رہی نہ رات یاد رہی۔ ان کے درمیان وقت تھم تھم کر گزرتا چلا گیا۔

چاند اپنی پرنور چاندنی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ سرگوشیوں میں بول رہے تھے، سن رہے تھے۔ رفتہ رفتہ تکلف اٹھ رہا تھا۔ نواب زادی نے اپنا سر شہزادے کے شانے پر رکھ دیا۔ وہ سرسبز مخملی گھاس پر بیٹھے جمنا کی سبک خرام لہروں کو دیکھ رہے تھے۔ چاندنی ان لہروں پر چاندی کے ورق کی طرح کانپ رہی تھی۔ شاہ بانو نے اس نظارے سے متاثر ہو کر کہا۔

"کتنا دل فریب نظارہ ہے۔ جب چاند جوان ہوتا ہے اور چاندنی ان لہروں پر دل بے قرار کی طرح مچلتی ہے تو ایسے وقت ہم اکثر یہاں آتے ہیں اور اس نظارے میں ڈوب

جاتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی ہم اسی جگہ قیام کریں۔"

شہزادے نے کہا "آج سے ہماری نئی زندگی کا آغاز ہو رہا ہے۔ آپ مرنے کی باتیں نہ کریں۔ یہ جگہ واقعی جنت سے کم نہیں ہے۔ ہم آپ کی قربت اور محبت کی ان ساعتوں میں وعدہ کرتے ہیں کہ ہم آپ کے لیے یہاں ایک ایسا عالی شان محل تعمیر کرائیں گے جو آپ کے حسن وجود کے شایان شان ہوگا اور رہتی دنیا تک لوگ اس محل کے سائے میں آکر محبت کی قسمیں کھاتے اور نبھاتے رہیں گے۔"

اس کی بات پوری ہوتے ہی دور کسی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ شہزادے نے خوش ہو کر کہا "سبحان اللہ! ہم نے کتنی مبارک ساعتوں میں وعدہ کیا ہے۔ خداوند کریم ہمارے وعدے کی لاج رکھنے والا ہے۔"

وعدوں اور خوابوں کی اس جنت سے دور امین الدولہ آصف خان کی خواب گاہ میں ملکہ نورجہاں اضطراب کے عالم میں ٹہل رہی تھیں اور آصف الدولہ بہن کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔ اذان کی آواز سن کر ملکہ عالیہ نے بھائی کو غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"صبح ہونے والی ہے اور تمہاری صاحب زادی کو اب تک واپسی کا ہوش نہیں ہے۔ کیا وہ اس قدر بے حیائی پر اتر آئی ہے کہ اس کے دل سے ہمارا خوف بھی جاتا رہا۔ شاید یہی بات ہے۔ ایک عیاش ولی عہد کا سہارا پا کر وہ مغرور ہو گئی ہے لیکن ہم خاک کے کیڑے کو خاک ہی میں ملا کر رہتے ہیں۔ سر اٹھائے تو اسے کچل دیتے ہیں۔ یہ نہ بھولو کہ تمہاری اوقات کیا تھی۔ ہم نے ملکہ نورجہاں بن کر تمہیں محض اس لیے عزت و شہرت کے آسمان پر پہنچایا ہے کہ تم ہمارے برادر عزیز ہو۔ جو رتبہ ہم نے تمہیں دیا ہے، اسے چھین بھی سکتے ہیں۔ اگر یہ عزت اور مرتبہ عزیز ہے تو آفتاب طلوع ہونے سے پہلے شاہ بانو کو دہلی روانہ کر دو۔ وہ تا حکم ثانی وہاں شاہی محل میں نظر بند رہے گی۔"

یہ حکم صادر کرتے ہی وہ بھائی کا جواب سنے بغیر وہاں سے غصے میں تلملاتی ہوئے چلی گئی۔

○☆○

شطرنج کی بازی جمی ہوئی تھی۔ شاہوں کا شطرنج کھیلنے کا انداز بھی شاہانہ ہوتا ہے۔ تقریباً دس گز مربع صحن کے چکنے فرش پر شطرنج کے بڑے بڑے سیاہ و سفید خانے بنے

ہوئے تھے۔ ان خانوں میں نوجوان کنیزیں کھڑی ہوئی تھیں۔ ہر کنیز کے سر پر صف آرائی کی مناسبت سے شطرنج کے مہرے رکھے ہوئے تھے۔ ان مہروں کے مطابق کوئی پیدل تھا، کوئی فیل، کوئی اسپ، کوئی وزیر اور کوئی شاہ کی حیثیت رکھتی تھی۔

شطرنج کی اس بساط کے اطراف امرا و روسا اور معززین دربار تماشائیوں کی حیثیت سے بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنی طویل و عریض بساط اس لیے تیار کی گئی تھی کہ شہنشاہ اور ملکہ عالیہ کے درمیان ہونے والی بازی سے دوسرے شوقین بھی لطف اندوز ہو سکیں۔

صحن کے اوپر غلام گردش کے ایک جانب درشن جھروکہ تھا جہاں شہنشاہ جہانگیر اور ملکہ نورجہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان شطرنج کی چھوٹی سی بساط بچھی ہوئی تھی۔ اس چھوٹی سی بساط پر وہ جس مہرے کو آگے بڑھاتے تھے، وہی صحن میں بڑی بساط پر آگے بڑھ جاتا تھا۔

ہوتا یوں کہ ملکہ اگر اپنے پیدل کو آگے بڑھاتی تھیں تو ان کی ایک خاص کنیز درشن جھروکے کے نیچے جا کر صحن کی بساط پر پہنچتی تھی اور اس کنیز کا ہاتھ پکڑ کر ایک خانہ آگے بڑھا دیتی تھی جو ملکہ کی طرف سے پیدل کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس طرح شہنشاہ کی طرف سے ایک خواجہ سرا آتا اور صحن کی بساط پر شہنشاہ کے مہرے کو حرکت میں لاتا تھا۔ اس طرح نیچے بیٹھے ہوئے معززین اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے تھے کہ شہنشاہ نے کون سی چال چلی ہے۔ پھر آپس میں خیال آرائیاں کرتے تھے کہ اب ملکہ کون سی چال چلیں گی۔

دونوں ہی ذہین، حاضر دماغ اور شطرنج کے مانے ہوئے کھلاڑی تھے۔ ان کی ہر چال پر حاضرین دربار واہ واہ کرتے۔ اس وقت درشن جھروکے میں بیٹھی ہوئی ملکہ دہری بازی میں الجھی ہوئے تھیں۔ ایک بازی سامنے تھی دوسری بازی دل میں چھپی ہوئی تھی۔ اس بازی کا سب سے اہم مخالف مہرہ شہزادہ خرم تھا جسے مات دینے کے لیے وہ اپنے مہرے کو آگے بڑھا رہی تھی۔ اس نے ایک مہرے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ہم لاڈلی بیگم کے ہاتھوں میں سہاگ کی مہندی دیکھنے کے لیے بے قرار ہیں۔ اگر آپ پسند فرمائیں تو ہماری نظروں میں ایک شہزادہ ہے۔"

"ہم جانتے ہیں کہ آپ کا اشارہ شہزادہ خرم کی طرف ہے۔"

"جان نورجہاں! آپ کا اندازہ غلط ہے۔ تعجب ہے کہ شہریار کو ہر معاملے میں آپ

نظرانداز کیوں کرتے ہیں؟

"اس لیے کہ وہ ناچ رنگ کی محفلوں میں وقت ضائع کرتا ہے۔ اس نے کبھی حکومت کے معاملات میں دلچسپی نہیں لی۔"

"یہ بات پرانی ہو چکی ہے۔ ہوا کا رخ بدل گیا ہے۔ شہریار کو جو جاگیر بخشی گئی ہے۔ وہاں کے فرائض وہ اتنی خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں جو ہماری توقعات سے زیادہ ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ ان میں گہری سنجیدگی بھی آگئی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم اپنی صاحبزادی کو ان سے منسوب کرنے کا ارادہ ظاہر نہ کرتے۔ اس کے برعکس خرم تباہی کے راستے پر جا رہے ہیں۔ آج کئی ماہ سے انہوں نے حکومت کے کسی معاملے میں دلچسپی کا اظہار نہیں کیا ہے۔"

"ہمیں آپ کے فیصلے سے اتفاق ہے۔ لاڈلی بیگم' شہریار سے بیاہی جائے گی لیکن یہ اطلاع ہمارے لیے افسوس ناک ہے کہ صاحب زادہ خرم بے راہ روی اختیار کر رہے ہیں۔ ہم ابھی ان سے جواب طلبی کریں گے۔"

ملکہ عالیہ نہیں چاہتی تھیں کہ براہ راست جواب طلبی ہو۔ شہنشاہ اس وقت شطرنج کی بساط پر چال چل رہے تھے۔ ملکہ نے کہا۔

"آپ جواب طلب کریں یا دوسرے لفظوں میں بیٹے کو نصیحت فرمائیں گے۔ ہمارا خیال ہے کہ جوان بیٹوں پر نصیحتیں اثر نہیں کرتیں۔ انہیں ان کی غلطیوں پر شرمندہ کرنے کے بجائے حکومت کے اہم معاملات میں الجھا دیا جائے۔"

"آپ کا مشورہ مناسب ہے۔ آپ فرمائیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

یہ کہتے ہوئے ملکہ نے مہرہ اسپ اٹھایا اور ڈھائی خانے کی اڑان پر شہنشاہ کی چال بند کر دی۔ نیچے صحن میں بیٹھے ہوئے تماشائیوں نے جب یہ چال دیکھی تو ملکہ معظمہ کو بڑھ بڑھ کر داد دینے لگے۔

شہنشاہ چالوں میں الجھ کر سوچنے لگے "بیگم شہزادے کو بہت ہی خطرناک مہم پر بھیجنے کا مشورہ دے رہی ہیں۔ ایک عرصے سے میواڑ کے رانا اپنے وسیع علاقے اور فوج کی کثرت کے باعث ہندوستان کے تمام راجاؤں میں ممتاز رہے ہیں۔ انہوں نے آج تک کسی سلطان ذی شان کی اطاعت قبول نہیں کی۔ اکبر بادشاہ پچاس سال بڑی شان و شوکت سے

حکمرانی کرتے رہے لیکن رانا پرتاب نے اطاعت و فرمانبرداری اختیار نہ کی۔ کئی بار فوج کشی ہوئی بلکہ ایک مرتبہ تو خلد آشیانی اکبر اعظم نے ہمیں (جہانگیر) بھی میواڑ فتح کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ ہر بار یہی صورت ہوئی کہ جب بھی رانا شاہی فوج کے حملوں سے عاجز آجاتا تو پہاڑ کے دامن میں دشوار گزار گھاٹیوں میں جا چھپتا اور چھپ چھپ کر اپنی فوج کے ساتھ کبھی تیر برساتا اور کبھی شب خون مارتا تھا۔ اکبر کے زمانے سے اب تک کتنے ہی جانباز سپہ سالار مارے گئے تھے اور بیگم خرم کو اس مہم پر بھیجنے کا مشورہ دے رہی ہیں۔ ایسی صورت میں کیا کیا جا سکتا ہے؟ بیگم کو ناراض نہیں کیا جا سکتا اور شہزادے کو ایسے دشمن کے مقابلے پر بھیجنا مناسب نہیں جو اپنی خاندانی روایات کے مطابق چھپ چھپ کر حملے کرنے کا عادی ہے۔

شہنشاہ نے ایک پیدل کو آگے بڑھا کر ملکہ کے گھوڑے کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا پھر ایک عذر پیش کیا۔

"میواڑ کا راجہ ایک طرح سے محکوم ہے' مجبور ہے کیونکہ کھل کر مقابلے پر آنے سے کتراتا ہے۔ ایسے بزدل دشمن کا مقابلہ کرنا شہزادے کی شان کے خلاف ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ پھر ایک بار رانا کی کمر توڑنے کے لیے راجہ سورج سنگھ اور سیف خان کو روانہ کیا جائے۔ اس بار وہ اطاعت قبول کر لے گا۔"

ملکہ کی نظریں بساط پر تھیں۔ شہنشاہ کا پیدل ان کے گھوڑے کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر رہا تھا اور ملکہ نے پیچھے ہٹنا سیکھا نہیں تھا۔ وہ فیل کو آگے بڑھا کر گھوڑے کی پشت پر لے آئیں۔ اب جنگ کی صورت حال یہ تھی کہ شہنشاہ کا پیدل اگر گھوڑے کو مارتا تو ملکہ کا فیل آگے بڑھتا اور شہنشاہ کے پیدل اور وزیر کو مارتا ہوا آخری خانے میں جا بیٹھتا اور شاہ کے لیے خطرہ بن جاتا۔ ملکہ نے یہ چال چلتے ہوئے کہا۔

"یہ تو ہم بھی سمجھتے ہیں کہ اس بار میواڑ کا موجودہ رانا ہماری اطاعت قبول کرے گا کیونکہ ایک طویل مدت سے جنگیں لڑتے لڑتے اس کا خزانہ خالی ہو رہا ہے۔ اس کے بھی کتنے ہی جانباز سپاہی اور سپہ سالار مارے گئے ہیں۔ اب وہ ہمارا جم کر مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ جلد ہی ہتھیار ڈال دے گا۔ اسی لیے تو ہم چاہتے ہیں کہ میواڑ کی فتح کا سہرا شہزادہ خرم کے سر رہے۔ اس کامیابی میں دوسرے سپہ سالاروں کا نام نہیں آنا چاہیے۔ شاہوں کی

تاریخ میں صرف شاہوں اور شہزادوں کی فتوحات کا ذکر ہونا چاہیے۔ کیا آپ نہیں چاہتے کہ آنے والی نسلیں تاریخ کی کتاب میں شہزادہ خرم کو فاتح میواڑ کی حیثیت سے پڑھتی رہیں؟"

"واقعی بیگم آپ کی ذہانت کی جتنی داد بھی دی جائے کم ہے۔ ہم آج کے دور میں حکومت کرتے ہیں اور صرف آج کی باتیں سوچتے ہیں۔ آپ آنے والی کل پر بھی نظر رکھتی ہیں۔ ہمیں آپ کی رائے سے اتفاق ہے۔ انشاء اللہ میواڑ کی فتح کا سہرا خرم کے سر رہے گا۔ تاریخ کے آئینے میں دیکھنے والے آپ کا چہرہ بھی دیکھیں گے اور ہماری طرح تسلی کریں گے کہ آپ نے کبھی سوتیلی ماں بن کر نہیں سوچا۔ ہمیشہ شہزادہ خرم کی فتح و کامرانی کے لیے کوشاں رہیں۔ آفریں ہے صد آفریں!"

ملکہ نے شراب کا پیالہ اٹھا کر شہنشاہ کی طرف بڑھا دیا۔ شطرنج کی بساط پر چال بند ہوگئی تھی۔ شہنشاہ کو مات ہوگئی تھی۔ غلام گردش کے نیچے صحن کے اطراف میں بیٹھے ہوئے معززین دربار تذبذب میں تھے کہ ملکہ کی جیت پر انہیں داد دیں یا نہ دیں کیونکہ شہنشاہ نے مات کھائی تھی۔ ایک کو داد دی جاتی تو دوسرے کی توہین ہوتی۔ جہانگیر نے درشن جھروکے سے جھانک کر کہا۔

"ہماری شکست نے آپ حضرات کو الجھن میں مبتلا کردیا ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ملکہ عالیہ کی جیت ہماری جیت ہے۔ ہم اجازت دیتے ہیں فہم و فراست کی ملکہ کو دل کھول کر داد دی جائے۔"

اجازت ملتے ہی چاروں طرف سے واہ واہ کا شور بلند ہونے لگا۔

○☆○

اقتدار کا لالچ کسے نہیں ہوتا۔ اگر اس اقتدار سے اپنی اولاد کی خوش حالی وابستہ ہو تو سگے بھائی بہن بھی ایک دوسرے کے دشمن ہوجاتے ہیں۔ امین الدولہ آصف خان نے جب یہ دیکھا کہ شہزادہ خرم، شاہ بانو کی طرف مائل ہے تو اس نے بڑے صبر و تحمل سے کام لیا۔ فی الحال وہ اپنی بہن ملکہ نور جہاں کے حکم سے مجبور تھا۔ اس نے بیٹی کو دہلی روانہ کردیا تھا اور اب شہزادہ خرم سے چپکے چپکے دوستانہ تعلقات استوار کر رہا تھا۔ اس نے خرم کو بتا دیا تھا کہ ملکہ کے حکم سے مجبور ہو کر شاہ بانو کو اس سے دور کردیا گیا ہے۔

آصف خان سمجھتا تھا کہ شہریار میں حکمران بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ ایک دن خرم ہی تاج و تخت پر قابض ہوگا۔ اگر شاہ بانو کی محبت نے واقعی اس کے دل میں گھر کرلیا ہے تو وہی ایک دن ہندوستان کی ملکہ بنے گی۔ فی الوقت بازی نور جہاں کے ہاتھ میں تھی۔ وہ دو محبت کرنے والوں کے درمیان دیواریں کھڑی کرتی جارہی تھی۔ پہلے تو اس نے شاہ بانو کو شہزادے سے دور کردیا تھا۔ اب شہزادے کو شاہ بانو سے بہت دور میواڑ کی مہم پر روانہ ہونے کا حکم صادر کرچکی تھی۔

یہ ایک ایسی مہم تھی جس میں اس کے دادا مرحوم جلال الدین اکبر اور والد محترم نور الدین جہانگیر ناکام رہے تھے۔ ناکامی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ دشمن چھپ کر نقصان پہنچاتا تھا۔ اس طریقہ جنگ سے اب خرم کو بھی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ اس کے باوجود وہ اس مہم پر روانہ ہوگیا۔ وہ بھی سیاسی چالوں کو سمجھتا تھا۔ اس کے خیال میں اگر فتح نصیب ہوئی تو اس فتح کے سہارے وہ نور جہاں کو سیاست کے میدان میں کسی حد تک نیچا دکھا کر اپنے والد کا اعتماد حاصل کرسکتا تھا۔

اس کی روانگی کے بعد آصف خان نے ملکہ سے التجا کی کہ شہزادہ اب دارالسلطنت سے بہت دور جاچکا ہے۔ چار چھ ماہ سے پہلے واپسی ممکن نہیں ہے لہٰذا شاہ بانو کو ساتھ رہنے کی اجازت دی جائے۔ ملکہ نے فراخ دلی سے اجازت دے دی۔ چند روز بعد شاہ بانو باپ کے پاس آگئی۔ آصف خان موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ اس نے کچھ ایسے خفیہ انتظامات کیے جن کے ذریعے شہزادہ اور شاہ بانو کے درمیان دوبارہ نامہ و پیام کا سلسلہ قائم ہوگیا۔ مقصد یہ تھا کہ شہزادے کے دل میں شاہ بانو کی یاد ہمیشہ تازہ رہے۔ شاہ بانو کا نامہ ایک ہرکارے کے ذریعے بڑے رازدارانہ انداز میں شہزادے تک میدان جنگ میں پہنچتا تھا اور شہزادے کی خیریت کی اطلاع شاہ بانو کو ملتی رہتی تھی۔

شہزادہ خرم نے اپنے لشکر کے ساتھ قصبہ اودے پور کے میدان چوگان پر پڑاؤ کیا تھا۔ اس علاقے میں اب تک کسی لشکر کی رسائی نہیں ہوئی تھی۔ راجہ سورج سنگھ نے شہزادے کو سمجھایا کہ سارے لشکر کا کوہستان میں گھس جانا مناسب نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ دشمن ہمیں ان پہاڑوں میں چاروں طرف سے گھیر کر پیچھے آنے والوں اور رسد لانے والوں کا سلسلہ منقطع کردے۔ لیکن شہزادے نے اپنے طور پر جنگ لڑنے کی ٹھانی تھی،

اس نے اودے پور سے سرحد تک چھ تھانے قائم کیے تاکہ رسد کی فراہمی اور فوج کی نقل و حرکت میں کوئی دشواری نہ ہو۔ پھر اپنی خداداد صلاحیت اور ذہانت کے مطابق فوج کے چار حصے کیے۔ ایک فوج عبداللہ خان فیروز جنگ کی سرداری میں' دوسری دلاور خان کاکڑا اور کشن سنگھ کے اہتمام میں' تیسری سیف خان بارہرا اور میر بخشی کی ماتحتی میں اور چوتھی میر تقی کی سربراہی میں۔ ان سرداروں میں ہر ایک کو ان کے مرتبے کے مطابق خلعت' شمشیر مرصع' ہاتھی اور عربی گھوڑے عطا کیے۔ رانا کو ان فوجیوں کے تقرر کا علم ہوا تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ زیادہ عرصے تک کھل کر سامنے آکر مقابلہ نہ کر سکا۔ ثابت قدمی کو ترک کر کے اپنی عادت کے مطابق بھاگ کھڑا ہوا۔ کبھی کسی گھاٹی میں چھپنے لگا کبھی کسی پہاڑی کی کھوہ میں۔ آج اس غار میں رات گزاری تو کل اس جنگل میں دن بسر کیا۔ اس کے جاں نثار سپاہی بھی اس کے ساتھ تھے۔ وہ اسی طرح آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے اچانک شاہی لشکروں پر حملہ کرتے تھے پھر فرار ہو کر کہیں چھپ جاتے تھے۔

اسی طرح دن ہفتے اور مہینے گزرتے رہے۔ رانا تھا کہ گرفت میں نہیں آتا تھا۔ بعض اوقات بڑے بڑے خطرناک حملے کرتا تھا۔ کچھ اس طرح شب خون مارتا تھا کہ شاہی لشکر کے سیکڑوں خیموں کو جلا کر اور جانی و مالی نقصان پہنچا کر پھر کسی چوہے کے بل میں جا چھپتا۔ اس جنگ کے روز و شب کی تفصیلات جہانگیر تک پہنچتی رہتی تھیں۔ یہ اطلاع بھی مل چکی تھی کہ دوسرے راجے مہاراجے رانا کی پشت پناہی کر رہے ہیں لہٰذا رانا برسوں تک خرم کو لوہے کے چنے چبواتا رہے گا۔

شہنشاہ نے یہی مناسب سمجھا کہ شہزادے کو واپس بلا لیا جائے لیکن ملکہ نے کہا "جنگ کے دو ہی نتائج ہوتے ہیں۔ شکست یا فتح۔ اور ابھی ان میں سے کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ ایسی صورت میں شہزادے کو واپس بلانا خلاف مصلحت ہے۔ یوں بھی شہزادگی کے زمانے میں شہزادوں کے لیے جنگ کا میدان ہی مناسب ہوتا ہے ورنہ شاہی محل کی ٹھنڈی چھاؤں میں آکر وہ عیش و طرب کی رنگین محفلوں میں اپنی صلاحیتوں کو زنگ آلود کرتے رہتے ہیں۔"

ملکہ نے بڑے پتے کی بات کہی تھی۔ جہانگیر نے سر تسلیم خم کر دیا۔

جنگ جاری رہی۔ وہ بڑی طویل' تھکا دینے والی جنگ تھی۔ اگر کوئی اور شہزادہ ہوتا تو

وہ ہار جیت کے فیصلے کے بغیر ہی واپس چلا آتا لیکن خرم عہد کر چکا تھا کہ رانا کو گرفتار کرے گا یا پھر ساری عمر لڑتا رہے گا۔ اس پر اس لیے بھی تھکن طاری نہیں ہوتی تھی کہ ہر دس پندرہ دنوں بعد شاہ بانو کا طویل محبت نامہ موصول ہوتا تھا جسے پڑھتے پڑھتے وہ تلواروں کی جھنکاروں اور توپ و تفنگ کے دھماکوں سے دور جمنا کے ٹھنڈے ساحل پر پہنچ جاتا تھا۔ جنگ کے میدان میں کڑی دھوپ ہوتی تھی۔ آفتاب سوا نیزے پر ہوتا ہے۔ مگر شاہ بانو کی ٹھنڈی میٹھی تحریر سے چودھویں کا چاند طلوع ہوتا تھا۔ آخر شب کی شبنمی ہوا کانوں کے قریب سرسراتی ہوئی اور سرگوشیوں میں پوچھتی ہوئی گزرتی تھی کہ اے برہا کی ماری شاہ بانو! تیرا شہزادہ کب آئے گا؟ تب شاہ بانو بڑے فخر سے جواب دیتی "دیر آید درست آید۔" وہ دیر سے آئے گا مگر فتح کا پرچم لہراتا آئے گا۔

شاہ بانو کے خطوط شہزادے کا حوصلہ بڑھاتے تھے اور پھر وہ نئے عزم اور حوصلے سے رانا کو گھیرنے اور گرفتار کرنے کی تدبیریں کرتا رہتا تھا۔ اس نے اپنے لشکر کے دلیر اور ہوشیار سپاہیوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنائیں۔ یہ دشمن اور اس کے آدمیوں کا کھوج لگانے والی ٹولیاں تھیں۔ شہزادے کے حکم کے مطابق یہ دن رات پہاڑ کی گھاٹیوں اور غاروں میں دشمنوں کو تلاش کرتی پھرتی تھیں۔ جہاں کوئی دشمن نظر آتا اسے قتل کر دیتیں یا قید کر دیتی تھیں۔ رانا اب ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری پناہ گاہ تک بھاگا بھاگا پھرتا تھا لیکن خرم کی جاسوس ٹولیاں اسے سانس لینے کی مہلت نہیں دیتی تھیں۔ وہ برسات کا منتظر تھا تاکہ بارش کے سبب جنگلوں اور گھاٹیوں کے راستے پانی سے مسدود ہو جائیں اور شاہی فوجیں اس کا پیچھا کرنے کے لیے ندی نالوں کو عبور نہ کر سکیں۔

لیکن اس سے قبل ہی رانا کا حوصلہ پست ہو گیا کیونکہ اب اس کا علاقہ ویران ہو گیا تھا۔ کھیت اور فصلیں تباہ ہو گئیں تھیں۔ خزانہ خالی ہو گیا تھا۔ فوج قتل ہو گئی یا قید کر لی گئی تھی۔ اعزا و اقربا اپنے اپنے راستے چلے گئے تھے۔ رانا کا مان ٹوٹ گیا اور آن بان ختم ہو گئی۔ شاہی فوجوں نے اسے چاروں طرف سے نرغے میں لے کر بدحواس کر رکھا تھا۔ آخر اس نے شکست تسلیم کر لی۔ میواڑ کے راناؤں کا طرۂ امتیاز یہی تھا کہ آج تک کسی رانا نے کسی سلطان کے سامنے گردن نہیں جھکائی تھی اور نہ ہی اپنے کسی راجکمار کو کسی سلطان ذی شان کے دربار میں بھیجا تھا لیکن اس وقت شہزادہ خرم کے مقابلے پر آنے

والے رانا امر سنگھ نے اطاعت قبول کرلی اور جہانگیر کے دربار میں حاضری دینے کے لیے اپنے بیٹے راج کمار کرن کو شہزادہ خرم کے ساتھ کردیا۔

جب شہنشاہ کو اطلاع ملی کہ شہزادہ فتح یاب ہو کر واپس آرہا ہے اور اس نے اجمیر پہنچ کر پڑاؤ کیا ہے تو انہوں نے تمام امرا و دربار کو شہزادے کے استقبال کے لیے روانہ کردیا۔ ملکہ نور جہاں کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ اسے تو توقع نہیں تھی کہ ہزار سال سے راناؤں کی جو گردن اکڑی ہوئی تھی اسے شہزادہ خرم جھکادے گا۔

بہرحال ملکہ نے صبر و تحمل سے کام لیا اور خندہ پیشانی سے جہانگیر کو مشورہ دیا کہ فتح یاب شہزادے کے شایان شان اس کا استقبال ہونا چاہیے اور شکرانے کے طور پر جشن تلادان کی رسم ادا ہونی چاہیے۔ یہ رسم اس طرح ادا ہوتی تھی کہ ترازو کے ایک پلڑے میں شہزادے کو بڑے آرام سے بٹھایا جاتا اور دوسرے پلڑے میں سونا' چاندی اور دوسری قیمتی اشیا شہزادے کے وزن کے برابر تولی جاتی تھیں پھر یہ تمام چیزیں محتاجوں میں بانٹ دی جاتی تھیں۔

شہنشاہ میواڑ کی فتح اور رانا کی سرکوبی سے اتنے خوش تھے کہ شراب کے پیالے پر پیالے خالی کر رہے تھے۔ شہزادہ فاتح کی حیثیت سے سامنے آیا تو انہوں نے ملکہ نور جہاں کے پاس سے اٹھ کر اسے گلے لگالیا اور پدرانہ محبت کے جوش میں اسے چوم کر پوچھا۔

"مانگو شہزادے! کون سی جاگیر مانگتے ہو؟"

خرم نے کہا "ابا حضور! آپ تاقیامت سلامت رہیں۔ جاگیریں تو ہمیں ملتی ہی رہتی ہیں۔ آج ہم اپنی عمر کے مطابق آپ کی ایک رضامندی کے طلب گار ہیں۔"

"بیٹے! آج ہم تمہاری رضا پر راضی ہیں۔ اپنا مطالبہ پیش کرو۔"

اس نے سرجھکا کر آہستہ سے کہا "ہم یمین الدولہ آصف خان کی صاحبزادی کو اپنی شریک حیات بنانا چاہتے ہیں۔"

ملکہ نور جہاں نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ خرم جاگیر طلب کرنے کے بجائے محض ایک نواب زادی کا ہاتھ طلب کرے گا۔ جتنی دیر تک وہ سوچتی رہی اتنی دیر میں شہنشاہ نے اپنی رضامندی ظاہر کردی کہ شاہ بانو' خرم سے بیاہی جائے گی۔ اس خوشی میں وہ اور زیادہ پینے لگے۔ ملکہ بھی انہیں جان بوجھ کر پلانے لگی تاکہ

مدہوشی کے عالم میں ان سے اپنی بات منوا سکے۔

جب تلادان کے وقت شہزادہ خرم ایک پلڑے پر آکر بیٹھا تو ملکہ عالیہ ریشمی پردے کے پیچھے بیٹھی ساقی کا فرض ادا کر رہی تھی۔ اس نے سرگوشیوں میں جہانگیر سے پوچھا۔

"کیا شہزادہ خرم آپ کے ہر حکم کی تعمیل کرتے ہیں؟"

"ہاں۔ بے شک! وہ ہمارا فرماں بردار بیٹا ہے۔"

ملکہ نے سوال کیا "کیا شراب بری شے ہے؟"

"نہیں۔ اگر بری ہوتی تو ہم اسے منہ نہ لگاتے۔"

"مگر شہزادہ خرم اسے برا کہتے ہیں۔ اسے کبھی منہ نہیں لگاتے۔"

"کیوں نہیں لگاتا۔ جب شاہ نے منہ لگایا ہے تو شہزادہ بھی منہ لگائے گا اور ابھی لگائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ لڑکھڑاتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھے ملکہ نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر انہیں روکتے ہوئے کہا۔

"جان نور۔ شہزادے کے آگے پیالہ بڑھانے سے پہلے غور فرمالیں۔ اگر انہوں نے پینے سے انکار کیا تو حاضرین دربار باتیں بنائیں گے کہ جہاں پناہ کی پیش کش ٹھکرادی گئی ہے۔"

"کس کی مجال ہے کہ ہماری پیش کش کو ٹھکرادے۔ ابھی اس کا فیصلہ ہوجاتا ہے۔"

شہنشاہ کے دماغ میں شراب ناچ رہی تھی اور زبان سے نشہ بول رہا تھا۔ وہ نشے میں لڑکھڑاتے باہر آگئے۔ انہیں پردے کے باہر دیکھتے ہوئے حاضرین احتراماً کھڑے ہوگئے۔ شہزادہ بھی پلڑے سے اٹھنا چاہتا تھا کہ جہانگیر نے قریب آکر اس کی جانب پیالہ بڑھا کر کہا۔

"صاحب زادے بیٹھے رہو۔ تمہاری شاندار کامیابی کی خوشی میں آج ہم اپنے پیالے سے تمہیں پلانا چاہتے ہیں۔ لو ایک سانس میں پی جاؤ۔"

شہزادہ پریشان ہو کر اس پیالے کو دیکھنے لگا۔ ایک باپ نشے کی حالت میں اپنے بیٹے کو شراب پیش کر رہا تھا۔ وہ ایک بیٹے کی حیثیت سے انکار کرسکتا تھا لیکن فاتح میواڑ کی حیثیت سے ایک شہنشاہ کی پیش کش کو ٹھکرانے کی جرات نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے

عاجزی سے کہا۔

"ابا حضور! ہماری کیا مجال کہ ہم آپ کے کسی حکم سے سرتابی کریں۔ ہم آپ کے ہاتھوں زہر کا پیالہ بھی نوش کرسکتے ہیں لیکن آپ جانتے ہیں کہ ہم نے آج تک شراب کو ہاتھ نہیں لگایا ہے۔"

"تم نے بچپن میں تلوار بھی نہیں پکڑی تھی۔ پہلی بار فن سپاہ گری سیکھنے کے لیے ہم نے تمہارے ہاتھوں میں تلوار دی تھی۔ آج جوانی میں شراب کا پیالہ دے رہے ہیں۔ تم ہم سے بحث نہ کرو ورنہ ملکہ سمجھیں گی کہ تم ہمارے حکم کی تعمیل سے انکار کررہے ہو۔"

خرم نے چونک کر ریشمی پردے کی طرف دیکھا۔ چشم زدن میں ساری باتیں سمجھ میں آگئیں۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

"اوہ! اچھا تو یہ سب ملکہ کی ایما پر ہورہا ہے۔ وہ جانتی ہیں کہ ہم شراب کو منہ نہیں لگائیں گے اور اگر منہ نہیں لگائیں گے تو ابا حضور نشے کی حالت میں اسے اپنی توہین سمجھیں گے۔ ہم یہ کہنے کی جرات بھی نہیں کرسکتے کہ وہ حرام شے پی رہے ہیں اور بیٹے کو پلانا چاہتے ہیں۔"

یا اللہ ہم کس مشکل میں پڑگئے ہیں۔ ابھی ہم پر جو مہربانیاں ہورہی ہیں وہ ہمارے انکار پر قہر اور غضب میں بدل جائیں گی۔ خاص طور سے ملکہ عالیہ یہ چاہتی ہیں کہ شاہ بانو کا ہاتھ ہم سے چھین لیا جائے۔ ہم شراب کے ایک پیالے کو ٹھکرائیں گے، ابا حضور ہماری محبت کو اور تمام مسرتوں کو ٹھوکروں میں اڑادیں گے۔"

ہم نے مہینوں جنگ لڑنے کے بعد میواڑ کو فتح کیا ہے۔ ملکہ عالیہ کی سیاسی چالبازی کو داد دینی چاہیے کہ وہ پردے میں بیٹھ کر ننھی سی چال چلتی ہیں۔ ہم باپ بیٹے کے درمیان صرف شراب کا ایک پیالہ رکھ کر ہماری فتح کو شکست میں بدل دینا چاہتی ہیں۔ اے عورت شیطان بھی تجھ سے پناہ مانگتا ہے۔ میں تو ایک انسان ہوں۔ میں تجھ سے شکست تسلیم نہیں کروں گا۔ شاہ بانو تک پہنچنے کے لیے میں زہر کا پیالہ نوش کروں گا۔ شراب حرام ہے لیکن...... محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔

یہ سوچ کر شہزادے نے شہنشاہ کے ہاتھوں سے جام لے لیا۔ ریشمی پردے کے پیچھے ملکہ

کا دھندلا سراپا جھلک رہا تھا۔ خرم نے اس سراپا کو طنزیہ نظروں سے دیکھا پھر سانس روک کر غٹاغٹ پیالے کی تمام شراب حلق سے نیچے اتارلی۔ تاریخ میں اور کہیں مثال نہیں ملتی کہ ایک بادشاہ نے اپنے ہاتھوں سے ایک مجبور بیٹے کو شراب پلائی ہو۔

ملکہ نورجہاں نے دل ہی دل میں اعتراف کیا کہ خرم میں ایک حکمران بننے کی پوری صلاحیت ہے کیونکہ اس نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر بروقت فیصلہ کرلیا کہ اسے فوری طور پر کون سا قدم اٹھانا چاہیے۔ اس دن کے بعد ملکہ محتاط ہوگئی اور خرم پر ایک کاری ضرب لگانے کے لیے کسی اچھے موقع کا انتظار کرنے لگی۔

پھر وقت گزرتا چلا گیا۔ اچھا موقع تقدیر ہی سے ہاتھ آتا ہے اور تقدیر ملکہ کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اس دوران لاڈلی بیگم شہریار سے بیاہ دی گئی اور شاہ بانو نے شہزادہ خرم کے دل کی ملکہ اور شریک حیات بن کر ممتاز محل کا لقب پایا۔ شہزادے کی دلی مراد پوری ہوگئی تھی۔ ممتاز محل مل گئی تھی۔ اب جمنا کے کنارے ایک عالی شان محل تعمیر کرانے کی خواہش دل میں کروٹیں لے رہی تھی۔ اس خواہش کی تکمیل اسی وقت ممکن تھی جب وہ مطلق العنان بادشاہ بن جاتا پھر ملکہ نورجہاں جیسی ہستیاں اس کے راستے کی دیوار نہیں بن سکتی تھیں۔ فی الحال وہ ایک عالی شان محل کے خواب دیکھ رہا تھا۔ ممتاز محل ایک تو حسن میں لاجواب اور شیریں گفتاری میں بے مثال تھیں۔ دوسرے یہ کہ آداب دانی، مزاج شناسی اور خدمت گزاری کے باعث خرم کے دل پر حکومت کررہی تھیں۔ ان کی خواب گاہ کے دائیں بائیں، آگے پیچھے کی تمام دیواروں پر جہاں نظر جاتی تھی، وہاں ممتاز محل کی روغنی تصویر نظر آتی تھی۔ وہ ایک پل کے لیے بھی اپنی بیگم سے جدا ہونا گوارا نہیں کرتا تھا۔ بیگم کو شہزادے کی شراب نوشی سے شکایت تھی۔ ہزار بار نہ پینے کا وعدہ کرنے کے باوجود شراب منہ کو لگ جاتی تھی۔ وہ ممتاز محل کا ہاتھ تھام کر قسم کھاتا تھا کہ وہ شراب کو ہاتھ نہیں لگائے گا لیکن جشن وجلوس کے موقعوں پر شہنشاہ جہانگیر اسے مجبور کردیتے تھے۔ ان کے حکم سے انکار کی جرات نہیں ہوتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں وہ اپنے والد کو ناراض کرکے ہندوستان کے تاج وتخت سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس لیے محبت سے کھائی ہوئی قسم بھی باربار ٹوٹ جاتی تھی۔

تقریباً آٹھ برس تک ممتاز محل اور شہزادہ خرم کی محبت ایک ایسے خوش رنگ پھول

کی طرح کھلتی رہی جو کانٹوں سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اس دوران ممتاز محل کے بطن سے دو لڑکیاں حورالنساء بیگم اور جہاں آرا بیگم اور تین لڑکے دارا شکوہ' شجاع اور اورنگ زیب پیدا ہوئے۔ والدین اپنی اولاد سے ایک جیسی محبت کرتے ہیں لیکن شہزادہ خرم کو دارا شکوہ سے کچھ زیادہ ہی محبت تھی۔ وہ اس بیٹے کو ہمیشہ اپنے ساتھ لگائے رکھتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دارا شکوہ ناک نقشے کے اعتبار سے اپنی والدہ ممتاز محل سے مشابہت رکھتا تھا۔ خصوصاً وہ اپنی ماں کی بڑی بڑی آنکھیں اپنا کر پیدا ہوا تھا۔ جب وہ خرم کی طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھتا تھا تو خرم کو یہی محسوس ہوتا کہ ممتاز محل دیکھ رہی ہے۔

یہ باتیں ظاہر کرتی تھیں کہ شہزادہ کس طرح دیوانہ وار اپنی بیگم سے محبت کرتا تھا اگر اسے کسی مہم پر جانا ہوتا تو وہی ایک ایسا موقع ہوتا جب وہ مجبوراً نامعلوم مدت کے لیے اپنی رفیقہ حیات سے بچھڑ جاتا تھا۔ ایسے وقت بھی بیگم کی کوئی تصویر ساتھ ہوتی تھی اور ان کے محبت نامے میدان جنگ تک پہنچتے رہتے تھے۔

ان ہی دنوں دکن کے تین سلاطین نظام الملک' قطب الملک اور عاقل خان نے باہم متحد ہو کر پچاس ہزار سپاہیوں کا لشکر جمع کر کے بالا گھاٹ کے شاہی محلات پر قبضہ کر لیا۔ وہاں کے اور منصب داران کے غلبے سے مجبور ہو کر وہاں سے بھاگ گئے اور مکر کے تھانے کو مستحکم کر کے تین ماہ تک بڑی جی داری کے ساتھ ان کا مقابلہ کرتے رہے۔ دشمن کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس نے چاروں طرف سے راستے اس طرح بند کر دیے کہ غلے کی رسد پہنچنا ناممکن ہو گئی۔ انہوں نے جہانگیر کے پاس عرض داشت بھیجی کہ غلے کی نایابی اور دشمن کے غلبے کی وجہ سے ہمارا برا حال ہے اگر ہمیں سرکشوں کے محاصرے سے نہ نکالا گیا تو ہم بہادر راجپوتوں کی طرح جوہر کی رسم ادا کر کے جان دے دیں گے۔

ہندوؤں کی اصطلاح میں جوہر کے معنی یہ ہیں کہ جب جان پر بن جائے اور امیدیں ختم ہو جائیں تو راجپوت پہلے اپنی عورتوں کو قتل کر دیتے ہیں تاکہ دشمن ان کی عزت تک نہ پہنچ سکیں۔ اس کے بعد وہ اپنے دشمنوں سے لڑتے لڑتے اپنی جانیں دے دیتے ہیں۔ جب جہانگیر نے اس عرض داشت کا مضمون سنا تو اس مہم کو سر کرنے کے لیے خرم کو دکن کی طرف روانہ ہونے کا حکم دیا۔

خرم نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد شہنشاہ سے عرض کی۔

"دشمن کی فوج کا زور شور پہلے سے بہت زیادہ ہے۔ انہوں نے برہان پور کا بھی محاصرہ کر لیا ہے لہٰذا اس سلسلے میں ایک عرض ہے کہ جس طرح رانا سانگا کی لڑائی میں فردوس مکانی حضرت ظہیرالدین محمد بابر نے شراب سے توبہ کی تھی اور خدائے پاک نے اُن کی دعا قبول کر کے انہیں فتح عطا فرمائی تھی۔ اسی طرح ہم بھی شراب سے توبہ کر کے اپنے پروردگار سے دعا مانگیں اور فتح حاصل کریں۔"

جہانگیر نے مصلحت وقت کے مطابق شہزادے کے اس خیال سے اتفاق کیا اور اسے توبہ کی اجازت دے دی۔ شہزادے نے جب دریائے چنبل کے کنارے پڑاؤ کیا تو اس روز اس کی تیسویں سالگرہ تھی۔ سالگرہ کا جشن بڑے ہی تزک واحتشام سے منایا گیا۔ شہزادے نے عیش و طرب کی محفلوں میں حکم دیا کہ ساری شراب دریائے چنبل میں بہا دی جائے۔

حکم کی تعمیل کی گئی۔ شراب دریا میں بہا دی گئی۔ ساقی خانے میں جتنے جام و صبو تھے' انہیں شہزادے کے سامنے توڑ کر محتاجوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ شہزادے نے اسی وقت ممتاز محل کے نام ایک خط لکھا اور اسے ایک شکستہ صبو کے ساتھ روانہ کیا۔ خط میں لکھا تھا۔

اب سے آٹھ برس پہلے ملکہ عالیہ امی حضور نے ابا حضور کی وساطت سے ہمیں جس لعنت میں مبتلا کیا تھا' آج وہ لعنت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دریا میں بہا دی گئی ہے۔ پہلے ہم قسم توڑتے تھے آج ہم نے صبو توڑ دیا ہے۔ دعا کریں کہ ہمارے پایہ استقلال میں کبھی لغزش پیدا نہ ہو۔"

ممتاز محل نے جب یہ خط پڑھا اور ٹوٹے ہوئے صبو کو دیکھا تو خوشی سے کھل گئیں انہوں نے اسی وقت دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی پھر جواباً ایک خط تحریر کیا کہ "اللہ تعالیٰ انہیں عزت دیتا ہے جو ذلت سے دامن بچانے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ کردار کی یہی پختگی آپ کو تخت شاہی تک لے جائے گی۔ ہم اس حسین عالی شان محل کا مبہم سا خاکہ دیکھ رہے ہیں جس کا وعدہ آپ نے فرمایا تھا۔"

ممتاز محل کا یہ خواب ابھی حقیقت سے بہت دور تھا۔ اگرچہ جہانگیر نے شہزادے کو دکن کی مہم پر روانہ کرتے وقت شاہجہاں کا خطاب دیا تھا جو بادشاہت کی شان رکھتا تھا

تاہم ملکہ نورجہاں ابھی تک ملک کے سیاہ و سفید کی مالک تھی۔

جب شاہجہاں دکن کی مہم سے کامیاب ہو کر مانڈو پہنچا تو جہانگیر کے نام ایک عرض داشت میں پرگنہ دھول پور کو اپنی جاگیر میں مانگ لیا اور اپنے ملازم تعینات کر دیے لیکن یہ عرض داشت پہنچنے سے پہلے ملکہ یہ پرگنہ اپنے داماد کو دے چکی تھی۔ وہاں شہریار کا گماشتہ شریف الملک موجود تھا۔ جب شاہجہاں کا نائب وہاں پہنچا تو دونوں میں لڑائی ہو گئی۔ شریف الملک کی آنکھ میں ایک تیر لگا جس سے وہ کانا ہو گیا۔ ملکہ عالیہ کو فساد کی آگ بھڑکانے اور جہانگیر کو شاہجہاں کے خلاف بھڑکانے کا ایک اچھا موقع مل گیا۔

شاہجہاں نے ایک معذرت آمیز عرض داشت کے ساتھ دیوان افضل خان کو جہانگیر کی خدمت میں روانہ کیا تاکہ کسی طرح اس ہنگامے کو ختم کیا جائے لیکن ملکہ اچھی طرح آگ لگا چکی تھی۔ اس نے جہانگیر کو سمجھا دیا تھا کہ شاہجہاں مسلسل فتوحات سے مغرور ہو گیا ہے۔ شہنشاہ کے حکم سے جو جاگیر شہریار کو دی گئی تھی اس نے اس پر جبراً قبضہ کر لیا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ شہزادے اسی طرح بغاوت کا آغاز کرتے آئے ہیں۔"

ایسے وقت آصف خان نے اپنے داماد کی طرف سے صفائی پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر ملکہ کا جادو سرچڑھ کر بول رہا تھا۔ داماد کی طرف داری کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملکہ اس کی بھی دشمن بن گئی۔ اس نے مہابت خان کو طلب کیا جو آصف خان کا دشمن تھا اور شاہجہاں سے بھی خلوص نہیں رکھتا تھا۔ مہابت خان نے کابل سے لکھا۔

"جب تک آصف خان آپ کے حضور ہے، میرا آنا ممکن نہیں ہے۔ اگر شاہجہاں کا زور توڑنا منظور ہے تو آصف خان کو بنگال کی صوبے داری پر رخصت کیجیے۔ میں خدمت کے لیے حاضر ہو جاؤں گا۔"

جہانگیر نے مہابت خان کی خواہش کے مطابق آصف خان کو خزانہ لانے کے بہانے آگرے سے روانہ کر دیا اور یہ حکم بھی صادر کیا کہ شاہجہاں کے دو آبے والی جاگیر اس کے نام سے کاٹ کر شہریار کی تنخواہ میں دے دی جائے۔ شاہجہاں نے جب یہ خبر سنی تو باپ کے دل سے کدورتیں دور کرنے کے لیے لشکر کے ساتھ لاہور روانہ ہو گیا۔ جہانگیر کو یہ اطلاع دی گئی کہ شہزادہ اتنے بڑے لشکر کے ساتھ حملہ کرنے آ رہا ہے۔ وہ لاہور سے آگرہ چلا آیا۔ یہاں آکر شہزادے کے خلاف جو مہم ترتیب دی گئی اس کا انتظام اور

سپہ سالاری مہابت خان کو تفویض کی گئی۔

شاہجہاں نے کوٹلہ میوات میں آکر راجہ بکرماجیت، داراب خان اور اپنے دیگر امرا کو مہابت خان کے مقابل کھڑا کر دیا۔ جنگ شروع ہو گئی تو دونوں طرف کے سپاہی شجاعت و مردانگی کے جوہر دکھانے لگے۔ اس معرکے میں شاہجہاں کا لشکر غالب آ رہا تھا لیکن بات بنتے بنتے بگڑ گئی۔

ہوا یہ کہ شاہجہاں کا سپہ سالار بکرماجیت جو بہادری سے لڑتا ہوا لشکر شاہی کو دباتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ ایک نیم جان بندوقچی کے پاس سے گزرا۔ اس کے ہاتھ میں بھری ہوئی بندوق تھی، فیتا سلگ رہا تھا جونہی راجہ بکرماجیت ادھر سے گزرا بارود کو آگ لگ گئی اور گولی اس کا سینہ توڑتی ہوئی نکل گئی۔ وہ وہیں مر گیا وہ راجہ شہزادے کا چیدہ سردار اور بہت باتدبیر سپہ سالار تھا۔ اس کے مرتے ہی فوج کی ہمت پست ہو گئی۔ شاہجہاں نے اپنی فوج میں ابتری دیکھی تو ثابت قدم نہ رہ سکا۔ مجبوراً میدان سے ہٹ کر مانڈو چلا گیا۔

مہابت خان اس کا پیچھا کرتا چلا آ رہا تھا۔ مانڈو پہنچ کر شاہجہاں نے رستم خان کو فوج کا سپہ سالار بنایا لیکن شاہجہاں کی قسمت میں ابھی ناکامیاں اور زمانے بھر کی ٹھوکریں لکھی ہوئی تھیں۔ وہاں رستم خان نے غداری کی اور مہابت خان سے جا کر مل گیا۔

شاہجہاں دریائے نربدا کو عبور کر کے دوسری طرف چلا گیا۔ وہاں اس نے تمام کشتیاں اپنی طرف جمع کر کے شاہی فوج کے لیے ناکہ بندی کر دی۔ وہاں سے قلعہ اسیر میں آکر خان خاناں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ مہابت خان سے صلح کی بات چیت کرے۔ خان خاناں نے قرآن مجید کی قسم کھائی کہ وہ فریقین کے درمیان پوری دیانت داری سے صلح کرانے کی کوشش کرے گا۔ جب وہ دریائے نربدا کے پار مہابت خان کی طرف چلا گیا تو اسی رات جہانگیر کے لشکر کے کچھ سپاہیوں نے شاہجہاں کے سپاہیوں کو غافل پاکر ساحل نربدا کی ناکہ بندی توڑ دی۔ جہانگیری لشکر کو غالب آتے دیکھ کر خان خاناں اپنی قسم سے پھر گیا اور مہابت خان کی فوج میں شامل ہو گیا۔

شاہجہاں دل برداشتہ ہو کر دکن کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں کتنے ہی امیر، سردار اور دوسرے ملازمین ساتھ چھوڑتے گئے اور اس کا دل توڑتے گئے۔ قدم قدم پر اسے چرکے لگ رہے تھے۔ وقت بدل رہا تھا۔ ساتھیوں کے مزاج بدل رہے تھے۔ موسم

بدل رہا تھا۔ وہ کبھی کپکپا دینے والی سردی میں، کبھی آگ کی طرح دہکتی ہوئی دھوپ میں، کبھی طوفانی بارشوں میں ایک خانہ بدوش کی طرح مارا مارا پھر رہا تھا۔

ایسی بے یاری اور بے مددگاری کے عالم میں ممتاز محل کی محبت دل میں نئی امیدیں اور نئے حوصلے پیدا کرتی تھی۔ ان دنوں وہ راحت جاں بنگال میں تھی۔ آصف خان آگرے سے جاتے وقت اپنی بیٹی اور اس کے بچوں کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔ شاہجہاں نے ارادہ کیا کہ وہ اپنی تھکن دور کرنے کے لئے بنگال جائے گا اور اپنی شریک حیات کی محبت بھری بانہوں میں کچھ عرصہ آرام کرے گا پھر تازہ دم ہو کر نئے سرے سے ایک لشکر ترتیب دے گا۔

اس خیال سے وہ اڑیسہ کی طرف روانہ ہوا۔ جب ملکہ نورجہاں کو یہ اطلاع ملی تو اس نے اپنے خالو ابراہیم خان کو جو بنگال کا مستقل صوبے دار تھا، حکم دیا کہ شاہجہاں کا راستہ روکے اور اسے ہمیشہ کے لیے اپنے راستے سے ہٹا دے۔ ابراہیم خان نے اڑیسہ کے شہر کٹک کے حاکم احمد بیگ خان کو لکھا کہ شہزادے کو آگے بڑھنے سے روک دو۔ شہزادہ وہاں سے راستہ بدل کر مچھلی پٹن پہنچ گیا۔

شہنشاہ جہانگیر، ملکہ نورجہاں اور مہابت خان چاروں طرف سے شاہجہاں کا راستہ روک رہے تھے۔ وہ فی الحال سیاست سے دور اپنی رفیقہ حیات کی آغوش میں جانا چاہتا تھا لیکن اس کے لیے محبت کے دروازے بھی بند کئے جا رہے تھے۔ ایسے وقت مچھلی پٹن کے سلطان قطب الملک نے وفاداری کا ثبوت دیا۔ اس نے بدحال اور بے وطن شہزادے کی دلجوئی کی اور حوصلہ افزائی کے لیے اپنے عاملوں کو حکم بھیج دیے کہ جہاں جہاں سے سواری گزرے وہ سب خدمت گزاری اور جاں نثاری کا پورا پورا حق ادا کریں۔

شاہجہاں وہاں سے پھر بہادر سپاہیوں کا ایک لشکر لے کر آگے بڑھا۔ کٹک کے حاکم احمد بیگ خان نے راستہ روکنے کی کوشش کی لیکن جنگ میں شکست کھا کر سیدھا ابراہیم خان کے پاس بنگال پہنچا۔ وہاں آصف خان اور ممتاز محل کو یہ خبر ملی کہ شاہجہاں مسلسل ناکامیوں کا سامنا کرنے کے باوجود پھر ایک نئی فوج اور نئے حوصلوں سے آگے بڑھتا آ رہا ہے۔

ابراہیم خان ہتھیاروں، کشتیوں، ہاتھیوں اور لشکر وغیرہ کی تیاری کر کے مقابلے کے

لیے آگے بڑھا۔ اس کے پیچھے جہانگیر نگر (ڈھاکہ) میں آصف خان نے اپنے داماد کے آنے کا راستہ ہموار کر دیا اور شاہجہاں دریائی راستوں سے ہوتا ہوا جہانگیر نگر کے شاہی محل میں شاہ بانو کے پاس پہنچ گیا۔

مدتوں کے بچھڑے ہوئے پھر مل گئے۔ شاہ بانو نے اپنے دل وجان کے مالک کو یوں تباہ حال دیکھا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شہزادے نے فرط محبت سے آغوش میں لے کر کہا۔

"بیگم یہ کہاوت کہاں تک درست ہے کہ بادشاہوں پر بھی برا وقت آتا ہے۔ ہم شاید اسی لیے ناکامیوں کا منہ دیکھ رہے ہیں کہ مدتوں سے آپ کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ محبت کا سہارا دنیا کا سب سے بڑا سہارا ہوتا ہے۔ اتنی طویل جنگ کے دوران جب اپنے پرائے سب ہی ہمارا ساتھ چھوڑ رہے تھے، اس وقت خدا کے بعد اس زمین پر صرف آپ کی محبت کا سہارا رہ گیا تھا۔ جب ہم نے اڑیسہ کے راستے آپ کے پاس آنے کا فیصلہ کیا تو اچانک ہی نصیب جاگنے لگے۔ ہم نے احمد بیگ خان کو شکست دی اور اڑیسہ پر قابض ہو گئے اور اب انشاء اللہ ابراہیم خان بھی شکست کھا کر اپنی بھانجی نورجہاں کی پناہ میں جائے گا۔"

شاہ بانو نے کہا "انشاء اللہ ہر قدم پر آپ کی کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔ ہماری محبت اور ہماری دعائیں آپ کے ساتھ رہیں گی۔"

"صرف دعائیں نہیں، آپ بھی ہمیشہ ساتھ رہیں گی۔ آپ کی رفاقت سے ہمارے حوصلے بلند رہتے ہیں۔ ہم نے آزمایا ہے کہ آپ کا ساتھ چھوٹتا ہے تو ساری دنیا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ بیگم! وعدہ کیجئے کہ اب ہم کبھی جدا نہیں ہوں گے۔"

وہ دونوں وعدوں اور قسموں کی بندشوں میں بندھنے لگے۔ مدتوں بعد راحت جاں کی محبت نصیب ہوئی تو شہزادے نے حرم سرا سے باہر قدم ہی نہیں نکالا۔ اس نے عبداللہ خان فیروز جنگ کی سرداری میں ایک آراستہ اور بہترین تربیت یافتہ فوج ابراہیم خان سے مقابلے کے لیے بھیج دی۔ آصف خان تیز رفتار قاصدوں کے ذریعے روزانہ جنگ کی خبریں حرم سرا تک پہنچاتا تھا۔

انہی دنوں خاندان مغلیہ کے دستور کے مطابق شاہجہاں نے گلابی عیا کا جشن منایا۔

یہ جشن ہر سال ساون کی پہلی تاریخ کو شاہانہ شان و شوکت سے منعقد ہوتا تھا اور فارسی میں عید ترکان کہلاتا تھا۔ ایران کے بادشاہ بھی قدیم زمانے سے یہ عید مناتے آئے تھے۔ ممتاز محل کی قربت کو اور زیادہ رنگین اور پر لطف بنانے کے لیے بڑے پیمانے پر جشن منعقد کرنے کا حکم دیا گیا۔ دیگر شہروں کے حاکم اور امرائے نامدار نے شاہجہاں کی خدمت میں جواہرات سے مرصع صراحیاں پیش کیں۔ جو گلاب سے لباب بھری ہوئی تھیں۔ دوسرے خدمت گاروں نے سنہری اور روپہلی مینا کار صراحیاں اور پھولوں کے گلدستے پیش کئے۔ اس عید میں شاہ بانو گلاب کی خوشبوؤں میں بس گئی تھی۔ حرم سرا میں اس کے چاروں طرف پلپنا، چنبیلی، بیلا، موتیا، سوسن، گل یاسمین اور گلاب کے رنگا رنگ پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ ان کے درمیان شاہ بانو پھولوں کی ملکہ نظر آ رہی تھی۔ شاہجہاں نے اس ملکہ محبت کو بے پناہ محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آج سے تقریباً 9 برس پہلے اسی طرح پھولوں کی بہار آئی تھی۔ ہر پھول کا رنگ الگ تھا اور خوشبو الگ تھی۔ سب مل کر ایک گلستان و بوستان کی تکمیل کر رہے تھے۔ جب آپ نے گل فروش کے ہاں قدم رکھا تو پتا چلا کہ بہار کتنی جوان اور کتنی حسین ہے۔ وہاں پہلی بار ہم نے آپ کو پھولوں کی انجمن میں دیکھا۔ آپ خوشبوؤں میں سانس لے رہی تھیں اور سانس کی خوشبوئیں لٹا رہی تھیں۔ آج بھی آپ کو پھولوں کے ہجوم میں دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے یہ کل کی بات ہو۔"

شاہ بانو نے کہا "جی ہاں یہ مینا بازار کا وہی گل رنگ ماحول ہے لیکن جمنا کا کنارہ نہیں ہے۔ ہم پانچ برس سے اس انتظار میں ہیں کہ آپ کو فتح نصیب ہوگی اور کب ہم جمنا کے کنارے اپنے خوابوں کی نگری میں جائیں گے۔"

"بیگم آپ کے خوابوں کی تعبیر جلد ہی سامنے آئے گی۔ حالات بتا رہے ہیں کہ ابا حضور کی فوج اور حکومت اندر سے کھوکھلی ہوتی جا رہی ہے اور جہاں پناہ دن رات نشے میں ڈوبے رہتے ہیں۔ دراصل ہم امی حضور کی سیاسی چالبازیوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔"

"یہ درست ہے کہ پھوپی حضور نے جہاں پناہ کو آپ کا دشمن بنا دیا ہے لیکن وہ شہریار جیسے ناکارہ داماد کو تخت پر نہیں بٹھا سکیں گی۔ وہ حضرت تو خود کو ہر وقت شراب کی سرمستیوں میں گم رکھتے ہیں۔"

"بیگم نئی اطلاعات کے مطابق شہریار ان رنگین محفلوں سے محروم ہو گیا ہے۔ شراب نوشی اور دیگر عیاشیوں میں پڑ کر کسی مرض میں گرفتار ہو گیا ہے۔ ابروؤں اور داڑھی مونچھوں کے بال گر گئے ہیں۔ آتشک کی وجہ سے تمام جسم میں پھوڑے نکل آئے ہیں۔ چہرہ ایسا بگڑ گیا ہے کہ کسی کا سامنا نہیں کر سکتا۔ خدا ایسے عبرت ناک انجام سے اپنے نیک بندوں کو محفوظ رکھے۔"

"واقعی یہ حالات بتا رہے ہیں کہ کامیابی آپ کے قریب آ گئی ہے۔"

ممتاز محل کی زبان مبارک ہوئی۔ اسی وقت ایک قاصد نے آکر فتح کی خوش خبری سنائی کہ ابراہیم خان جنگ میں مارا گیا اور اس کی فوج نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ اس فتح نے شاہجہاں کا حوصلہ بڑھا دیا۔ اب اس نے دارالسلطنت کو اپنی منزل بنا کر الہ آباد کی طرف کوچ کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ پہلے سے طے ہو چکا تھا کہ شاہ بانو کا ساتھ ہر منزل میں رہے گا لہٰذا بیگم اور بچے بھی ساتھ روانہ ہوئے۔

رہتاس تک وہ محبت کرنے والوں کا ساتھ رہا۔ قلعہ رہتاس میں پہنچتے ہی شاہ بانو دردِ زہ میں مبتلا ہو گئیں۔ اسی سنگین قلعے میں ان کا چوتھا بیٹا مراد پیدا ہوا۔ شاہ بانو کی حالت بہت خراب تھی۔ آگے سفر کرنا ممکن نہیں تھا۔ مجبوراً شاہجہاں کو پھر ایک بار اپنی راحت جاں کی جدائی برداشت کرنا پڑی اور وہ شاہ بانو اور بچوں کو آصف خان کی نگرانی میں چھوڑ کر چلا گیا۔

مہابت خان اور سلطان پرویز شاہی لشکر کے سپہ سالار اور سردار تھے۔ وہ شاہجہاں کی تاک میں لگے ہوئے تھے۔ جیسے ہی اس فوج نے گنگا کو عبور کیا، شاہی لشکر نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ دونوں میں زبردست جنگ ہوئی۔ شاہی لشکر میں سپاہیوں کی بھاری تعداد دیکھ کر شاہجہاں کے کچھ بزدل سردار وہاں سے فرار ہو گئے۔ جو جاں نثار کرنے والے ساتھی تھے وہ جم کر مقابلہ کرتے رہے لیکن پھر ایک بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ وہ اپنی جان بچانے اور پھر ایک بار نئے سرے سے لشکر ترتیب دینے کے لیے میدان جنگ سے ہٹ آیا۔

دوسری طرف ملکہ نورجہاں کی سیاسی چالبازی میں ایک لغزش پیدا ہو گئی۔ وہ شہریار کو ولی عہد بنانے اور تخت پر بٹھانے کی فکر میں تھی لیکن اب مہابت خان اور سلطان

پرویز کا ساتھ اسے کھٹک رہا تھا۔ سلطان پرویز شاہجہاں کا بھائی تھا اور مہابت خان کی سپہ سالاری میں شاہجہاں کو مسلسل شکست دیے جا رہا تھا۔ ایسے وقت میں جب شہریار ناکارہ تھا اور شاہجہاں پسپا ہو رہا تھا۔ وہ اپنی بادشاہت کا اعلان کر سکتا تھا اس کا زور توڑنے کے لیے ملکہ نے فیصلہ کیا کہ مہابت خان کو اس سے توڑ لیا جائے اور اسے دارالسلطنت میں بلا کر قید کر لیا جائے۔

جب مہابت خان کو حاضر دربار ہونے کا حکم ملا تو وہ کھٹک گیا۔ وہ میدان جنگ کا کھلاڑی تھا۔ ملکہ عالیہ کی بدلتی ہوئی چالوں کو سمجھتا تھا۔ اس نے سوچا کہ تن تنہا دربار میں جائے گا تو کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے گا۔ اب اس اہم فیصلے کی گھڑی آ گئی تھی کہ اسے کس کا حکم ماننا چاہیے اور کس کا ساتھ دینا چاہیے۔ ملکہ عالیہ کا ساتھ' سلطان پرویز کا ساتھ' شاہجہاں کا ساتھ کس کا ساتھ مناسب رہے گا۔

ملکہ نورجہاں شہریار جیسے نااہل شہزادے کو تخت پر بٹھانا چاہتی تھی۔ حالات سے ظاہر تھا کہ وہ بری طرح ناکام رہے گی کیونکہ امرا اور معززین دربار شہریار اور ملکہ کا مستقل اقتدار کبھی پسند نہ کرتے۔ دوسرا سلطان پرویز تھا۔ وہ ابتدا ہی سے جہانگیر کی فرمانبرداری کرتا آیا تھا۔ وہ نہ تو ایک اچھا سپہ سالار تھا اور نہ ہی حکومت کے پیچیدہ معاملات کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس میں اپنے طور پر فیصلہ کرنے کی صلاحیتیں بھی نہیں تھیں۔ کسی بھی اہم معاملے میں دوسروں کے مشوروں کا ہمیشہ محتاج رہتا تھا۔ اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ صرف شاہجہاں ایسا تھا جو نڈر اور بے باک تھا اور پچھلے پانچ برسوں سے پوری ثابت قدمی اور جواں مردی سے جہانگیری قوتوں کا مقابلہ کرتا رہا تھا۔ اگر مہابت خان ملک کی چالبازیوں سے محفوظ رہنے کے لیے شاہجہاں کے پاس جاتا تو اسے یقیناً پناہ مل جاتی۔

یہ سوچ کر اس نے پہلے آصف خان سے صلح کی اور اس کے ذریعے شاہجہاں تک معافی کی درخواست روانہ کی۔ آصف خان اور ممتاز محل نے بھی شاہجہاں کو اپنی طرف سے خطوط لکھے کہ مہابت خان آپ کی پناہ میں آنا چاہتا ہے۔ یہ اچھا موقع ہے اگر اس کی پچھلی غلطیوں کو معاف فرما کر اسے اپنے اعتماد میں لیا جائے تو جنگ کا نقشہ بدل جائے گا۔ وہ ایک مانا ہوا باتدبیر اور تجربے کار سپہ سالار ہے۔ ہماری پناہ میں آئے گا تو شاہی لشکر کی کمر ٹوٹ جائے گی۔ آپ اس موقع سے ضرور فائدہ اٹھائیں۔

آصف خان اور ممتاز محل کا مشورہ قابل قبول تھا۔ وقت کا بھی یہی تقاضا تھا کہ مہابت خان جیسے دلیر اور تجربے کار سپہ سالار کو اپنی فوج میں شامل کر لیا جائے۔ جب وہ سلام اور کورنش بجالانے کے لیے شہزادے کے خیمے میں حاضر ہوا تو اس کی پچھلی تمام غلطیاں معاف کر دی گئیں۔ شہزادے نے آئندہ عنایات شاہانہ کا وعدہ کر کے اسے اپنے اعتماد میں لے لیا۔

آصف خان اپنی صاحب زادی شاہ بانو اور نواسے اور نواسیوں کو لے کر آگرہ آ گیا۔ ان دنوں شہنشاہ جہانگیر کشمیر میں تھے اور وہاں سے لاہور کا سفر کر رہے تھے۔ جہانگیر کا آخری وقت آ پہنچا تھا۔ وہ ایک مدت سے منشیات کا عادی تھا۔ اس عادت کی وجہ سے وہ دمے کا مریض بن گیا تھا۔ بعض اوقات اس پر انتہائی شدت سے کھانسی کا دورہ پڑتا تھا۔ کشمیر سے لاہور کے سفر کے دوران بھنبر ہتی کے پڑاؤ میں اس پر زبردست دورہ پڑا اور اس دورے نے اس کی جان لے لی۔

ایسے وقت میں شاہجہاں وہاں سے سیکڑوں میل دور مہابت خان کی سپہ سالاری میں دکن کے علاقے فتح کر رہا تھا۔ آصف خان نے بنارسی نام کے ایک شخص کو جو فیل خانے کا ناظر تھا اور تیز رفتاری میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا' شاہجہاں کے پاس روانہ کیا۔ عریضہ لکھنے کی مہلت نہ تھی لہٰذا زبانی تمام باتیں سمجھا کر نشانی کے طور پر اپنی انگوٹھی دی کہ اسے پیش کر دینا۔

شہریار نے باپ کے مرتے ہی ان امرا اور وفاداروں کے خزانوں پر قبضہ کر لیا جو شاہجہاں کے حامی تھے اور آصف خان سے متفق تھے۔ جو مطلب پرست اس کے اردگرد جمع ہو چکے تھے' ان پر شاہی خزانے کا روپیہ بے دریغ لٹا رہا تھا۔ خود عیش و عشرت میں پڑ کر ایسے نالائق آدمیوں کو ایک فوج ترتیب دینے کا حکم صادر کیا جنہوں نے کبھی میدان جنگ کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ کچھ بے ترتیب پرانی فوج تھی' کچھ بے سروپا نئے سپاہی جمع کیے گئے۔ اس طرح پندرہ ہزار سپاہیوں کی ایک فوج شاہجہاں کے خلاف تیار کی گئی۔

شہریار نے جن امرا کے خزانوں پر قبضہ کیا تھا' وہ سب اس سے بدظن ہو کر آصف خان سے مل گئے۔ آصف خان نے ان کی مدد سے ایک فوج تیار کی اور شہریار کے مقابلے پر آ گیا۔ اس سے پہلے اس نے ملکہ نورجہاں کو اپنی رہائش گاہ میں نظربند کر دیا تھا۔ وہاں

کسی کو آنے جانے اور ملکہ سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہاں پہریداری کے لیے چند ایسی سخت مزاج عورتیں متعین کی گئیں جو ملکہ کو خاطر میں نہ لاتی تھیں۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر آصف خان شہریار کی گوشمالی کے لیے مقابلے پر آیا۔ وہ اپنے داماد شاہجہاں کی آمد تک اس کے راستے کے تمام کانٹے صاف کر دینا چاہتا تھا۔

ان دنوں سپہ سالاروں کا قاعدہ تھا کہ لڑائی میں ہاتھی پر سوار ہو کر میدان جنگ میں آتے تھے تاکہ دوست دشمن، سوار اور پیدل سب کی نظریں ان پر پڑتی رہیں۔ دوستوں کا حوصلہ بندھا رہے اور دشمنوں کا حوصلہ پست ہوتا رہے۔ سب پر ان کی شجاعت اور ثابت قدمی ظاہر ہو اور اس طرح جنگ کا نقشہ جما رہے لہٰذا اس روز آصف خان ہاتھی کی عماری میں سوار ہو کر ہر طرف نگاہیں دوڑاتا اور بہادروں کو پیش قدمی پر مائل کرتا رہا۔ شہریار کی فوج میں نہ تو نظم و ضبط تھا اور نہ کوئی تجربے کار سپہ سالار تھا۔ چند ہی گھنٹوں میں آصف خان نے میدان مار لیا۔ دشمن کے سپاہی منتشر ہو کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ شہریار بھی گھبرا کر وہاں سے بھاگا۔ اس پر خوف و ہراس اس طرح طاری ہوا کہ فرار ہونے کا راستہ بھی سجھائی نہ دیا۔ وہ بدحواس ہو کر قلعہ لاہور میں آ کر بیٹھ گیا۔ وہاں افضل خان میر سامان موجود تھا۔ اس نے شاہجہاں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اسے قید کر دیا۔ اگلے روز آصف خان لاہور میں داخل ہوا۔ قلعے میں آ کر اس نے سب سے پہلے شہریار کی آنکھوں میں سلائی پھروا دی تاکہ فتنہ و فساد کا راستہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے۔

کچھ عرصے بعد شاہجہاں شاہانہ انداز سے آگرے میں داخل ہوا۔ اپنی شہزادگی کے زمانے میں جہاں وہ رہائش پذیر تھا، اسی رہائش گاہ میں اس نے بارہ دنوں تک قیام کیا کیونکہ تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہونے کے لیے نجومیوں نے جو تاریخ مقرر کی تھی۔ اس میں بارہ دن کی دیر تھی۔

تخت نشینی سے ایک دن قبل شاہجہاں نے اپنی بیگم ممتاز محل کی تاج پوشی کا جشن حرم سرا کی چہار دیواری میں منعقد کیا۔ ممتاز محل نے کہا۔

"خاندان مغلیہ میں بادشاہ سے پہلے کبھی ملکہ کی تاج پوشی نہیں ہوئی۔ کیا آپ نئی طرح ڈال رہے ہیں؟"

"ہم تاج پوشی کے نام پر محبت کی طرح ڈال رہے ہیں۔ ایک اندھی نے پیش گوئی

نہیں کی تھی بلکہ خود اس گل فروش کی پیش گوئی تھی کہ ملکہ ہند کا تاج آپ کے سر پر جگمگائے گا۔ وہ گل فروش بھی اس وقت آپ کے سامنے موجود ہے۔"

ممتاز محل نے حرم سرا کے دربار میں نظریں اٹھا کر دیکھا۔ وہ بوڑھی عورت دونوں ہاتھوں میں موتیے اور بیلے کے ہار لیے کھڑی تھی۔ شاہجہاں نے چاندی کے تھال سے ایک خوب صورت سا نازک سا تاج اٹھایا اور ممتاز محل کے سر پر رکھتے ہوئے کہا۔

"آج سے آپ تخت سلطنت کی زینت، تاج شاہی کی زیب آرائش عالم، آبروئے ہندوستان اور فخر شاہجہاں ہیں۔"

تمام بیگمات مبارک سلامت کہتی ہوئی ملکہ کے حضور بیش قیمت تحفے پیش کرنے لگیں۔ گل فروش کے پاس پھولوں کا ہار تھا۔ جب اس نے شاہجہاں کے حکم سے آگے بڑھ کر ملکہ کو وہ ہار پہنایا تو ملکہ ممتاز نے فرط مسرت سے کہا۔

"اس خوشی کے موقع پر ہمیں جو تحائف پیش کیے جا رہے ہیں، ان میں ہیرے موتی، لعل و گوہر اور سچے موتیوں کی مالائیں ہیں۔ ان میں ہر چیز کی قیمت لگائی جا سکتی ہے لیکن ہمارے پھولوں کا یہ ہار انمول ہے۔ پہلے ایک ہار خواب بن کر آیا تھا، آج تعبیر بن کر ہمارے گلے کا ہار بن گیا ہے۔ ہم تم سے بے حد خوش ہیں اور اس خوشی میں تمہیں میوات کی جاگیر عطا کرتے ہیں۔"

گل فروش خاتون کے دن پھر گئے۔ وہ دعائیں دیتی ہوئی ایک طرف ادب سے کھڑی ہو گئی۔ اس کے بعد ممتاز محل نے ان خادماؤں کو بھی انعام دیے جو اچھے برے وقت میں اس کی خدمت کرتی رہی تھیں۔

دوسرے دن تخت نشینی کے وقت شاہجہاں کو فضل ربانی، ظل سبحانی، شاہ دیندار، شہنشاہ عدالت شعار، فخر سعادت و اقبال صاحب قرآن ثانی کے القاب سے نوازا گیا۔ امرائے سلطنت نے اس خوشی کے موقع پر بے شمار نقارے بجوائے۔ سلطنت مغلیہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک شہروں اور دیہاتوں کو دلہن کی طرح سجایا گیا۔ جگہ جگہ عیش طرب اور نغمہ و سرود کی محفلیں سجائی گئیں۔

شاہجہاں نے قدر شناسی کے طور ارکان سلطنت میں سے ہر ایک کا خطاب مقرر کیا اور حکم دیا کہ درباری منشی فرمان وغیرہ میں یہی خطابات بعینہ لکھا کریں تاکہ ہر شخص کے

رتبے کا حق ادا ہوتا رہے۔

جب ظل سبحانی، صاحب قرآن ثانی شہاب الدین شاہجہاں دربار خاص و عام سے اٹھ کر حرم سرائے شاہی میں تشریف لائے تو شاہ ارجمند بانو بیگم، ممتاز محل نے اپنے ہاتھوں سے شہنشاہ کے سر پر روپوں، اشرفیوں اور لعل و گوہر سے بھرے ہوئے خوان نچھاور کئے۔ شہنشاہ نے اپنی ملکہ کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر فرط محبت سے کہا۔

"آج سے ہماری ایک نئی خوش حال زندگی کا آغاز ہو رہا ہے۔ ہماری ملکہ کی کوئی آرزو ہو تو بیان کریں۔ ہم اسے ابھی پورا کریں گے۔"

"عالی جاہ نے برسوں پہلے ایک وعدہ کیا تھا۔ ہماری آرزو ہے کہ وہ وعدہ ایفا ہو جائے۔"

"جان شاہجہاں کو اپنا وعدہ یاد ہے۔ ہم آپ کے لیے ایک ایسا خوب صورت اور جاذب نظر محل تعمیر کرائیں گے جو رہتی دنیا تک ہماری لازوال محبت کی یادگار بنا رہے گا۔ ہم اندرون ملک اور بیرون ملک سے ماہرین تعمیرات کو مدعو کریں گے۔ ہمارے خوابوں کے اس محل کا جو سب سے اعلیٰ نمونہ پیش کرے گا، ہم اسے سونے چاندی میں تول دیں گے۔"

شاہجہاں نے حسب وعدہ اعلان کرا دیا۔ اس اعلان کو سن کر بے شمار ماہر فن معمار خوب سے خوب تر نمونہ تیار کرنے کی فکر میں لگ گئے۔ مہینوں ان کی کاوشوں کے بعد کتنے ہی فن کاروں نے اپنی دانست میں حسین اور لاجواب نمونے پیش کیے جو واقعی قابل تعریف تھے لیکن ملکہ اور شہنشاہ کے مزاج اور معیار کے مطابق نہیں تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شہنشاہ کے تصور میں کس طرح کا انوکھا محل جگمگا رہا ہے۔

حکومت کے معاملات اتنے پیچیدہ تھے کہ وہ دو محبت کرنے والے اپنے تصوراتی محل کی تکمیل پر توجہ نہیں دے سکے۔ دور دراز صوبوں کے حاکم اور دوسرے راجے مہاراجے بغاوت اور فتنہ انگیزیوں پر اتر آئے تھے۔ ان کی سرکوبی کے لیے کبھی مختلف سالار شاہی لشکر لے کر جاتے تھے اور کبھی شہنشاہ خود ہی دشمنوں سے نمٹنے کے لیے میدان جنگ میں پہنچ جاتے۔ اس طرح کئی سال گزرتے چلے گئے۔

ان ہی دنوں کابل کے صوبے دار لشکر خان نے شہنشاہ کے پاس ایک عرض داشت

بھیجی جس میں لکھا تھا کہ علاقہ تیراہ کے پٹھان اور خاص طور پر غور خیل قبیلے کے لوگ ایک مجہول شخص کو پیر مانتے ہیں اور اس پیر کو "یزداں شناس" کہتے ہیں۔ اس کی پیروی میں احکام شریعت کو بھول کر الٹے سیدھے عقائد میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ وہ عقائد اور رسوم یہ تھیں کہ پیر کے مرید نکاح کے بغیر عورتوں کے ساتھ ہمبستری جائز سمجھتے تھے۔ محفل آراستہ کر کے گائے ذبح کرتے اور حاضرین کو کھلاتے اور قبل تہذیب کے انسانوں کی طرح اپنی پسند کی کسی بھی عورت کو استعمال میں لے آتے تھے۔ جب اس عورت کو چھوڑنا ہوتا تو ایک سنگریزہ اٹھا کر اس کے ہاتھ میں رکھ دیتے تھے۔ عورت کو وراثت سے محروم رکھتے تھے۔ اگر اس کے پاس جاگیر یا نقد روپے ہوتے تھے تو اس سے چھین کر کسی دوسرے مرد کے حوالے کر دیتے تھے۔ جب کسی کے ہاں بیٹا پیدا ہوتا تو گدھے کے کان کاٹ کر خون کے قطرے بچے کے منہ میں ڈالتے تاکہ بڑا ہو کر خونخواری اور گدھے پن میں کامل ہو۔ خونخواری کا یہ عالم تھا کہ جس قبیلے پر فتح پا لیتے اسے نیست و نابود کر دیتے تھے۔ قبیلے کا کوئی شخص اگر قرض ادا نہ کرے تو اسے قتل کر دیتے تھے اور یہ کہتے کہ اس شخص نے ہمارے ہاتھ سے قتل ہو کر شہادت کا درجہ پایا ہے لہٰذا قیامت میں اسے قرضہ ادا نہیں کرنا پڑے گا۔

ان عقائد و رسوم کے مطابق جس کی لاٹھی اس کی بھینس تھی۔ وہ نادار کو زندہ نہیں چھوڑتے تھے اور نادار و قلاش لوگوں کو غلام بنا لیتے تھے۔ ان لوگوں میں اس قسم کی بے شمار برائیاں نسل در نسل چلی آ رہی تھیں۔

شاہجہاں کے حکم سے لشکر خان نے ان پر لشکر کشی کی۔ ان پر پوری طرح قابو پانے کے بعد انہیں احکام شریعت پر عمل کرنے کی ہدایت کی۔ جو شخص غلط راستہ اختیار کرتا اسے شریعت کے مطابق درے لگائے جاتے یا اسے قتل کر دیا جاتا۔ تھوڑی ہی مدت میں وہ تمام بدعتیں اور خرافات ختم ہو گئیں اور شریعت اسلامی کا رواج ہو گیا۔

ایک حکمران کی نظروں میں مذہب کی بھی اتنی ہی اہمیت ہوتی ہے جتنی کہ سیاست کی۔ شاہجہاں کی نظروں میں محبت کی بھی اہمیت تھی لیکن سیاسی اور مذہبی فرائض کی انجام دہی میں محبت کا وہ خیالی محل تعمیر نہ ہو سکا۔ یوں تو اس حسن نظر رکھنے والے شہنشاہ نے اس دوران کتنی ہی شاندار عمارتیں، مسجدیں اور سرائے وغیرہ تعمیر کرائیں لیکن اسے

وہ فنکار نہ ملا جو اس کے خوابوں کے محل کو تراش کر زمین کے سینے پر کھڑا کر دیتا۔

رفتہ رفتہ وقت بوڑھا ہو رہا تھا اور لمحے جوان ہو رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دارا شکوہ، شجاع، اورنگ زیب اور مراد جوان ہو گئے۔ چار عدد جوان بیٹوں کو دیکھ کر شاہجہاں نے سوچا کہ حکومت کا بوجھ اب تک تنہا ہمارے کاندھے پر تھا۔ اب بوجھ چاروں بیٹوں میں تقسیم ہو جائے گا اور ہم اطمینان سے محبت کے شبستان میں بیٹھ کر غور کریں گے کہ خوابوں کا محل تعمیر کی دنیا میں کسی طرح تعمیر کیا جا سکتا تھا۔

یہ سوچ کر شہنشاہ نے محمد شجاع کو بنگال کا علاقہ دیا، اورنگ زیب کو دکن کے صوبے اور مراد کو گجرات کی ولایت پر متعین کیا۔ بڑے بیٹے دارا شکوہ کو نائب السلطنت ولی عہد کی حیثیت سے اپنی خدمت میں رکھا۔ وہ شہزادہ بچپن ہی سے عزیز تھا۔ ممتاز محل سے مشابہت رکھنے کے باعث ہر وقت بادشاہ کے دل میں سمایا رہتا تھا۔ شاہجہاں نے بیگم اور شہزادے شہزادیوں کے سامنے بارہا دارا شکوہ کی آنکھوں کی تعریفیں کی تھیں۔ اپنی بیگم سے کہا تھا کہ شکوہ کی آنکھوں میں آپ جھانکتی رہتی ہیں۔

ایسے دیوانے بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں جو سالہا سال اپنی شریک حیات سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسے وہ نئی نویلی دلہن ہو۔ عشق کی انتہا یہ تھی کہ اسے اپنے بچوں کی آنکھوں میں بھی اس رفیقہ حیات کا جلوہ نظر آتا تھا۔ اب جب کہ تمام بیٹوں میں کاروبار حکومت تقسیم کر دیا گیا تھا، شہنشاہ کے سامنے صرف یہی ایک فرض رہ گیا تھا کہ وہ ملکہ سے کیا ہوا وعدہ ایفا کرے۔

لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ وقت نے جب فرصت دی تو ممتاز محل کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ جس سے انسان کو زیادہ محبت ہوتی ہے وہی تقدیر کا نشانہ جلد بن جاتا ہے۔ ایک بچی کو جنم دیتے وقت ممتاز محل کی حالت بگڑ گئی۔ موت کے آثار نظر آنے لگے شہنشاہ کو اطلاع ملی تو وہ بے خود و بدحواس ہو کر حرم سرا میں تشریف لائے اور اضطراب کے عالم میں اس جان حیات کا ہاتھ تھام لیا جو جان چھوڑ رہی تھی۔ وہ نقاہت سے کہنے لگی۔

"آخری وقت ہے یہ روشنیاں میری آنکھوں میں چبھ رہی ہیں انہیں بھی بجھا دیجئے۔"

شاہجہاں کے حکم سے تمام فانوس ٹھنڈے کر دیے گئے۔ صرف ایک شمع جلتی رہی۔ خواب گاہ کی تاریکی میں دور ایک شمع روشن تھی اور قریب ممتاز محل کا چہرہ ایسے روشن تھا جیسے چراغ۔ بجھنے سے پہلے ایک بار زور سے بھڑک کر روشن ہوتا ہے۔ شاہجہاں کے سامنے اس وقت کا ماحول ایسا تھا کہ ساری دنیا اندھیرے میں ڈوب گئی تھی۔ صرف ایک محبوب کا تابناک جلوہ تھا۔ بیگم نے کہا۔

"اس تاریکی میں آپ کو صرف ہم نظر آ رہے ہیں۔ یہی ہماری آرزو ہے کہ ہمارے نام سے جو محل تعمیر ہو اس کی جگمگاہٹ اور ضوفشانی کے سامنے دنیا کے تمام محلوں کے چراغ بجھ جائیں۔ صرف ہمارا محل زمین کے ماتھے پر جھومر کی طرح جگمگاتا رہے۔"

"آپ کی یہ آرزو اب بہت جلد پوری کی جائے گی۔ آپ کے صحت یاب ہوتے ہی....."

ممتاز محل نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

"آپ ہماری صحت یابی کا خیال دل سے نکال دیں۔ ہم شرمندہ ہیں کہ چند لمحوں سے زیادہ آپ کا ساتھ نہیں دے سکیں گے۔ آہ! کوئی ایسا نہیں جو یہ کہہ سکے کہ مجھے ایک آدھ گھڑی سے زیادہ خوشی نصیب ہوئی۔ دنیا میں راحت کم ہے اور رنج زیادہ۔ خواہ کنیز ہو یا بیگم کسی کے لیے مسرت کی میعاد ایک لمحے سے زیادہ نہیں۔"

یہ کہتے کہتے آنکھیں بند ہونے لگیں۔ دور شمع کی لو تھرتھرا رہی تھی۔ ملکہ حمیدہ صفات، مریم زماں رابعہ دوراں نواب ممتاز بیگم کا ہاتھ شاہجہاں کے ہاتھوں میں سرد پڑ گیا۔ شمع حیات کی لو بجھ گئی۔

شہنشاہ نے کبھی سوچا تک نہ تھا کہ اتنی جلدی جان سے زیادہ عزیز بیگم جدائی کا صدمہ دے جائیں گی۔ دل و دماغ کو ایسا صدمہ پہنچا کہ کئی روز تک ہوش و حواس سے بیگانہ رہے۔ امور سلطنت سے توجہ ہٹ گئی اور ہونٹوں پر ہمیشہ کے لیے مسکراہٹ رخصت ہو گئی۔ جان حیات کے رخصت ہونے کے کئی سال بعد تک رنگین لباس اور عطریات کو ہاتھ نہیں لگایا۔ عیدیں آتی تھیں اور بے کیفی کی حالت میں گزر جاتی تھیں۔ دن رات آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔ یہاں تک کہ آنکھوں میں غبار آ گیا۔ بینائی کمزور پڑ گئی۔ کہتے ہیں کہ محبت کی آنکھ سے ٹپکے ہوئے آنسوؤں نے تاج محل کی تخلیق کی ہے۔ ایسے

ہی وقت اس محل کا دھندلا دھندلا سا خاکہ شاہ کی دھندلائی ہوئی آنکھوں کے سامنے جھلملانے لگا۔

اس سوگوار شہنشاہ نے ایک درباری منشی کو طلب کیا۔ اسے حکم دیا کہ دن رات شاہ کے خلوت کدہ میں حاضر رہے۔ جب بھی چشم تصور میں وہ خیالی محل جگمگائے گا' شاہ اپنی زبان سے اس کی تفصیل بیان کریں گے اور منشی اسے لوح پر محفوظ کرتا رہے گا۔

کوئی شاہکار اس وقت تک تخلیق نہیں ہوتا جب تک فنکار کے دل پر چوٹ نہ پڑے۔ شاہ جہان کا دل درد سے آشنا ہو چکا تھا۔ ممتاز محل کی جدائی سے قیامت گزر رہی تھی اور وہ نادیدہ محل خیال کے روپ میں الہام بن کر ذہن کے دریچوں میں اتر رہا تھا۔

"لکھو منشی' ہمیں ایسے معمار کی ضرورت ہے جو صرف معماری کے فن میں ماہر نہ ہو بلکہ خیالات کی نزاکت اور خواب کی صداقت کو بھی سمجھتا ہو اور ہمارے خیالوں کے ذریعے خوابوں تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ مغنی سات سروں سے اور شاعر لفظوں سے بولتا ہے۔ ہمیں ایسے معمار کی ضرورت ہے جو پتھروں کی زبان سے حسن کا قصیدہ پڑھتا ہو۔ اس دنیا میں جتنے صنم خانے ہیں' وہ پتھر سے تراشے گئے ہیں۔ وینس کا حسین مجسمہ پتھر کی زبان سے حسن کی دلکشی بیان کرتا ہے۔

ہمارا وہ محل سنگ مرمر سے تراشا جائے گا۔ بظاہر وہ سنگ مرمر کا ہوگا لیکن اس کی تراش میں اتنی نزاکت ہوگی اور ایسی جھلملاہٹ ہوگی جیسے ایک محبت کرنے والے شہنشاہ کے آنسوؤں کا ایک قطرہ جمنا کے کنارے ٹھہر گیا ہو اور چاندنی میں لرز لرز کر جھلملا رہا ہو۔

ہماری محبت کا وہ محل دنیا کے تمام محلوں کا تاج ہوگا۔ لہٰذا آج سے ہم اسے تاج محل کے نام سے یاد کریں گے۔

تمام شاعروں' مصوروں اور سنگ تراشوں تک یہ پیغام پہنچا دو کہ جو تاج محل کے سلسلے میں اچھوتے خیال پیش کرے گا۔ اس کا منہ موتیوں سے بھر دیا جائے گا۔"

شہنشاہ نے شاہی محل میں گوشہ تنہائی پسند کر لیا تھا۔ ممتاز محل کی یادوں نے اسے اسیر کر رکھا تھا۔ دارا شکوہ سامنے ہوتا تو یوں لگتا جیسے بیگم اس کی آنکھوں میں جھانک رہی ہیں اور ابھی کچھ کہنے والی ہیں۔ شہنشاہ پیار کی دیوانگی میں مبتلا تھے۔ دارا شکوہ اچھی طرح

جانتا تھا کہ وہ اپنے ابا حضور کی نظروں میں کتنا عزیز اور کتنا اہم ہے اس لیے کاروبار حکومت میں دخل اندازی کرتا تھا۔ باپ نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تو وہ ان کی پیار بھری کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اپنے طور پر احکامات صادر کرنے لگا۔ اس کی یہ حکمرانی دوسرے بھائیوں کی نظروں میں کھٹکنے لگی۔

جب شجاع' اورنگ زیب اور مراد کی طرف سے شکایات موصول ہونے لگیں تو شاہجہاں کو ہوش آیا۔ اتنی بات سمجھ میں آگئی کہ اگر وہ محبت کا محل ہی تعمیر کرتے رہے تو بادشاہت کمزور پڑ جائے گی اور سلطنت مغلیہ کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ حکومت کی سلامتی اور تمام بیٹوں کے درمیان صلح صفائی کرنے کی غرض سے وہ گوشہ تنہائی سے نکل آئے اور عنان حکومت سنبھال لی۔

انہی دنوں شیراز کے ایک فنکار نے تاج محل کا ایک خوب صورت نمونہ پیش کیا جو شہنشاہ کے خیالات کے عین مطابق تھا۔ انہوں نے اس محل کی تعمیر کا کام اس کے سپرد کر دیا۔ اب ان کی مصروفیات کا یہ عالم تھا کہ تمام بیٹوں کو فردا فردا احکامات بھیجتے تھے اور نصیحتیں کرتے تھے کہ آپس میں اتحاد و اتفاق سے رہیں۔ بھائی بھائی کی دشمنی سے تباہی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ دارا شکوہ جو دن رات شہنشاہ کی نگاہوں کے سامنے رہتا تھا' اسے بھی برابر نصیحتیں کرتے رہتے کہ چھوٹے بھائیوں کے ساتھ ایسا سلوک کرو کہ وہ تمہیں حاکم کے بجائے صرف ایک مخلص بھائی سمجھتے رہیں۔ لیکن وہ سرچڑھا بیٹا تھا اکثر ایسی من مانی کرتا کہ دوسرے بھائی اس سے بدظن ہو جاتے تھے۔ ویسے بھی دوسرے بھائیوں کو شروع سے یہ شکایت تھی کہ جہاں پناہ دارا شکوہ کو سب سے عزیز رکھتے ہیں' خلوت ہو یا جلوت اپنے سے جدا نہیں کرتے ہیں۔ یہ باتیں نفاق کا بیج بو رہی تھیں اور وہ چاروں بیٹے شہنشاہ کے سنبھالے نہیں سنبھل رہے تھے۔

دوسری جانب خوابوں کا حسین تاج محل تعمیر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ پہلے بنیاد پڑی پھر دیواریں اٹھنے لگیں۔ یہ ایک دو دن کا کام نہیں تھا۔ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ سنگ مرمر تراشے جا رہے تھے اور زمین کی گود میں ایک دوشیزہ صفت محل انگڑائیاں لے رہا تھا۔ شہنشاہ اس زیر تعمیر محل کا اکثر معائنہ کرنے آتے تھے اور اسے دیکھ کر فرط مسرت سے کھلتے تھے۔

"اے تاج محل! تو ہماری زندگی کا حاصل ہے۔ جب سے ہم نے شاہ بانو کے ساتھ محبت کا سفر شروع کیا ہے تب سے تو ہمارا ذکر ہے' ہماری فکر ہے' ہمارا ذوق ہے' ہمارا وجدان ہے اور ہماری محبت کی دائمی شان ہے۔

نہ جانے تو کب مکمل ہوگا۔ سال پہ سال گزرتے جارہے ہیں۔ ہماری کمر جھکتی جارہی ہے۔ سر اور داڑھی کے بال سفید ہوچکے ہیں۔ اب ہماری صرف یہی آرزو ہے کہ ہم تیرے مکمل سراپا میں تیرے حسن لازوال کا دیدار کریں۔

آج تک محبت ایک ان دیکھا جذبہ تھا۔ تیری تکمیل کے بعد محبت کو چھو کر دیکھا جاسکے گا۔ تیری دیواروں سے کان لگا کر ابدی نیند سونے والی ملکہ ممتاز محل کے دل کی دھڑکنیں سنی جاسکیں گی۔ تب دنیا یک زبان ہوکر کہے گی کہ محبت دیکھنے' چھونے اور سننے کی چیز بھی ہے۔"

محبت کے جذبوں میں بڑی ہی رنگینی اور دلکشی ہوتی ہے لیکن سیاست کی تلخیوں ایک بار پھر بوڑھے شہنشاہ کو زندگی کے عذاب میں مبتلا کردیا۔ اور حالات نے انہیں بیمار بنا کر دوبارہ گوشہ نشین کر بنا دیا۔

بیماری کے دوران شہنشاہ کا قیام دہلی میں تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ آخری وقت آگرہ میں گزاریں اور تاج محل کا دیدار کریں۔ آرزوؤں کا وہ محل تقریباً مکمل ہوچلا تھا لیکن دیدار کا موقع نصیب نہیں ہورہا تھا۔ بیماری و ضعف اور ناتوانی کا ایسا غلبہ تھا کہ وہ غسل خانے تک نہیں جاسکتے تھے۔

اس موقع سے فائدہ اٹھا کر داراشکوہ نے حکومت کے تمام معاملات اپنے اختیار میں لے لیے۔ تمام صوبوں کے نمائندے جو دارالسلطنت میں تھے۔ ان سے تحریری معاہدہ کرلیا کہ وہ دربار کی کوئی بات اپنے صوبے کے حاکم کو لکھ کر نہیں بھیجیں گے۔ اس پابندی کا مقصد صرف یہ تھا کہ دوسرے بھائیوں تک اس کے برسراقتدار آنے کی خبر فی الحال نہ پہنچے اور ان کی لاعلمی میں وہ تمام امرا اور معززین دربار کو رفتہ رفتہ اپنے اعتماد میں لے لے۔ اس مقصد کے لیے اپنے قابل اعتماد آدمیوں کو مختلف شاہراہوں پر متعین کردیا تاکہ دوسرے بھائیوں کے وکیل اور امرا وغیرہ کوئی خط ارسال نہ کرسکیں۔ بنگال' احمد آباد اور دکن کے راستوں کی ناکہ بندی کرادی۔ ان پابندیوں کے باوجود ڈاک چوکی اور ہرکاروں

کے ذریعے تمام صوبوں میں تشویش ناک خبریں پھیلتی چلی گئیں۔

شہنشاہ کو ان تمام باتوں کا علم ہوا تو انہوں نے صاحب زادے کو بلا کر کہا۔

"یہ حکومت کے اصول نہیں ہیں۔ کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ تمہاری ناکہ بندیوں کے باعث دور دراز کے صوبوں میں ابتری پھیل رہی ہے۔ مفسد اور فتنہ پرور لوگ بغاوت پر اتر آئے ہیں۔ سوداگروں اور مسافروں نے آمدورفت ترک کردی ہے۔ تجارت کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ اگر تم نے ہماری بیماری کی خبر عام نہیں کی تو لوگ ہماری عدم موجودگی سے یہی سمجھیں گے کہ ہم اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں۔"

داراشکوہ نے کہا "خدا آپ کا سایہ ہمارے سر پر سلامت رکھے ہم نے مصلحتاً ناکہ بندی کی ہے۔ آپ کی طویل بیماری نے آپ کو حکومت کے معاملات سے دور کر رکھا ہے لہٰذا آپ ہمارے بھائیوں کے بدلے ہوئے مزاج سے واقف نہیں ہیں۔ شہزادہ مراد بخش نے گجرات میں خودمختاری کا اعلان کردیا ہے۔ شہزادہ شجاع نے بھی بنگال میں یہی روش اختیار کی ہے۔ اگر ان کی اس خودمختاری کا جواب نہ دیا گیا تو وہ حکومت کے نشے میں بڑھتے ہوئے دارالسلطنت تک چلے آئیں گے۔"

"ہم انہیں سمجھائیں گے۔ وہ ہماری اولاد ہیں' ہم سے نافرمانی نہیں کریں گے۔ تم درباری منشی کو طلب کرو۔ ہم ان کے نام خطوط روانہ کریں گے۔"

"ابا حضور! وہ سمجھانے سے نہیں سمجھیں گے۔ ہمیں طاقت کا جواب طاقت سے دینا ہوگا۔"

"کیا تم ہم سے زیادہ زمانے کا تجربہ رکھتے ہو۔ یہ تمہاری نادانی ہے کہ تم ہمارا فیصلہ بدلنے کی کوشش کررہے ہو۔"

داراشکوہ نے باپ سے آنکھیں ملاتے ہوئے کہا۔

"امی حضور بھی تو آپ کے فیصلے بدل دیا کرتی تھیں۔"

ممتاز محل کے ذکر پر شاہجہاں کے مزاج میں یکلخت نرمی آگئی۔

داراشکوہ کی آنکھوں سے بچھڑی ہوئی محبت جھانک رہی تھی۔ وہ اپنے باپ کی اس پیار بھری کمزوری کو خوب سمجھتا تھا۔ اس نے فوراً کہا۔

"ابا حضور! آپ کا فیصلہ سر آنکھوں پر۔ آپ کسی صوبے کا انتظام ہمارے سپرد

کردیں، ہم یہاں نہیں رہنا چاہتے۔"

شہنشاہ اپنے اس بیٹے سے جدا نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ جان سے زیادہ عزیز تھا اور مرحومہ کی یاد تازہ کرتا رہتا تھا۔ انہوں نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

"صاحب زادے! تم ہماری کمزوریوں سے کھیل رہے ہو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم تمہیں ایک دن کے لیے بھی جدا نہیں کرسکتے۔"

"ابا حضور! گستاخی نہ ہو تو ہم عرض کریں۔ آپ کو ہماری نہیں بلکہ ہماری آنکھوں کی ضرورت ہے۔ یہ آنکھیں ہمیں امی حضور سے ورثے میں ملی تھیں۔ ہم آپ کی اولاد ہیں اور آپ پر اپنی جان نچھاور کرسکتے ہیں لیکن ہم یہاں سے ضرور جائیں گے اور جانے سے پہلے یہ آنکھیں جو آپ کو عزیز ہیں انہیں نکال کر آپ کے قدموں میں رکھ جائیں گے تاکہ آپ کی کوئی کمزوری ہمارے پاس نہ رہے۔"

یہ بات سنتے ہی شہنشاہ کا دل لرز گیا۔ کوئی دشمن شہزادے کی آنکھیں نکالنے کی بات کہتا تو وہ اسی وقت اس کی گردن اڑا دیتے۔ وہ آنکھیں آئینہ تھیں۔ اس آئینے میں ممتاز محل کا عکس نظر آتا تھا۔ وہ آنکھیں جام جمشید کی طرح خوب صورت ماضی کی یاد دلاتی تھیں اور آئندہ تاج محل کی تکمیل کا یقین دلاتی تھیں۔ انہوں نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔

"ایسے منحوس کلمات منہ سے نہ نکالو۔ یہ آنکھیں تمہاری امی کا ایک خوب صورت عطیہ ہیں۔ انہیں عزیز جانو اور ان کی حفاظت کرو۔ ہم شجاع اور مراد کی بغاوتوں کو کچلنے کے لیے تمہاری بچگانہ ضد تو تسلیم کرسکتے ہیں لیکن ان آنکھوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اب بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو؟"

"ابا حضور! ہم باغی شہزادوں کی گوشمالی کے لیے ایک بھاری لشکر یہاں سے روانہ کرنا چاہتے ہیں لیکن ہمارے بہترین سپاہی اور سپہ سالار ان دنوں شہزادہ اورنگ زیب کے ساتھ کئی ماہ سے بیجاپور کی مہم میں وقت ضائع کررہے ہیں۔ آپ اورنگ زیب کے نام فرمان جاری کردیں کہ وہ لشکر کو یہاں واپس بھیج دے تاکہ وہ لشکر ہمارے صاحب زادے سلیمان شکوہ کی قیادت میں شہزادوں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے بھیجا جائے۔"

یہ مشورہ قابل قبول نہیں تھا کہ اورنگ زیب کی قیادت سے ایک لشکر چھین کر

دوسری مہم پر بھیجا جائے لیکن شہنشاہ بیٹے کی ضد کے آگے جھک گئے اور فرمان جاری کردیا۔

شہزادہ اورنگ زیب بیجاپور کا محاصرہ کئے ہوئے تھا۔ اس قلعے کو فتح کرنے کے آثار پیدا ہوچکے تھے۔ ایسے وقت شاہی فرمان موصول ہوا کہ فوج کو واپس بھیج دیا جائے۔ اورنگ زیب کو مجبوراً بیجاپور کے اسکندر ریہ عادل شاہ کی صلح کی پیش کش قبول کرنی پڑی۔ وہ سمجھ گیا کہ فرمان کے پیچھے داراشکوہ اس کی فتح کو ناکامی میں بدل رہا ہے۔ اس نے داراشکوہ کے خلاف منظم ہونے کے لیے شہزادہ مراد کو اپنے ساتھ ملالیا۔ وہ دونوں بھائی اپنی اپنی فوج کے ساتھ دریائے نربدا کے کنارے آکر متحد ہوگئے۔ ان کے مقابلے کے لیے جسونت سنگھ شاہی فوج کا سپہ سالار بن کر دریا کے دوسرے کنارے پر آگیا۔

ایسے وقت داراشکوہ نے اپنے باپ کو ان ہنگاموں سے دور رکھنے کے لیے مشورہ دیا۔

"ابا حضور! آپ کے لیے آب وہوا کی تبدیلی بہت ضروری ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ آگرہ جاکر آرام فرمائیں۔ تاج محل تکمیل کے مرحلے میں پہنچ گیا ہے۔ آپ نے بارہا اس محل کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اگر آپ حکم دیں تو آپ کی روانگی کا انتظام کیا جائے۔"

شہنشاہ خود ہی اس آرزو میں تڑپ رہے تھے کہ کسی طرح تاج محل کو ایک نظر دیکھ لیں۔ وہ جانے کے لیے راضی ہوگئے۔ داراشکوہ نے ان کے سفر کے لیے دریائی راستے کا انتخاب کیا تاکہ کسی کو بادشاہ سلامت کے سفر کا علم نہ ہو۔ اس نے شاہی کشتی پر پردے ڈلوادیے۔

شاہجہاں نے پوچھا "پردوں کی کیا ضرورت ہے؟ ہم بہت عرصے بعد محل کی چہار دیواری سے باہر آئے ہیں۔ لہٰذا قدرتی مناظر کا نظارہ کرتے جائیں گے۔"

ابا جان آپ بھول رہے ہیں کہ دور کے مناظر آپ کو دھندلے نظر آتے ہیں۔ آپ قدرتی مناظر سے لطف اندوز نہیں ہوسکیں گے۔ ہم نے پردہ اس لیے لگایا ہے کہ رعایا آپ کو نہ دیکھ سکے ورنہ آداب کورنش بجالانے کے لیے آپ کے چاروں طرف مجمع لگ جائے گا۔ اس بیماری میں آپ اٹھ کر نہیں بیٹھ سکتے۔ ایسی صورت میں کسی سے ملاقات

کرنا مناسب نہیں ہے۔ خدا کی ذات سے امید ہے کہ آپ یہ سفر نہایت آرام سے طے کریں گے۔"

انہوں نے اپنے عزیز بیٹے کی خواہش کے مطابق کشتی کے ذریعے سفر کیا۔ انہیں اس بات کا مطلق احساس نہ ہوا کہ بیٹے نے بیماری کے بہانے پہلے شاہی محل میں انہیں نظر بند کیا تھا۔ اب کشتی میں دنیا والوں سے چھپا کر دہلی سے آگرہ منتقل کر رہا ہے۔ وہ باپ کو سمجھانے کے لیے یہی تاویل پیش کرتا رہا تھا کہ بیماری کی حالت میں کسی سے ملاقات کرنا مناسب نہیں ہے۔ اپنی اس تاویل سے قائل کرنے کے لیے کبھی وہ اپنی آنکھوں کو ہتھیار بناتا تھا اور کبھی تاج محل کی تکمیل کے خواب دکھاتا تھا۔

وہ تاج محل کو دیکھتے آگرہ پہنچے لیکن وہ دور سے دھندلا سا نظر آیا کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ کوئی دشمنی سے قید کرتا ہے۔ بیٹے نے انہیں محبت سے قید کر دیا تھا۔ وہ شاہی محل کی ایک خواب گاہ میں پڑے رہتے تھے۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ کوئی باہر کی خبریں ان کو پہنچاتا۔ اب ان کا یہی کام رہ گیا تھا کہ ممتاز محل کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات کو یاد کرتے رہتے تھے اور ایک بار تاج محل کو دیکھنے کی آرزو میں زندگی کی سانسوں سے رشتہ جوڑتے رہتے تھے۔

اس بیماری کے دوران ان کی صاحبزادی جہاں آرا ان کی خدمت میں رہا کرتی تھی۔ پہلے تو اس نے بھی باپ کے سامنے حکومت کے بگڑے ہوئے معاملات کا ذکر نہیں کیا لیکن جب اس نے دیکھا کہ پانی سر سے اونچا ہوتا جا رہا ہے اور تمام بھائی اقتدار کی ہوس میں ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے ہیں تو وہ بیمار باپ تک تازہ ترین اطلاعات پہنچانے لگی۔ بیمار شہنشاہ سنتا رہا کہ شجاع شاہی لشکر سے شکست کھا کر فرار ہو گیا ہے۔ اورنگ زیب اور مراد متحد ہو کر شاہی فوج کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

پھر خبر ملی کہ اورنگ زیب اور مراد شہنشاہ کی قدم بوسی کے لیے آنا چاہتے ہیں لیکن دارا شکوہ کے حکم پر جسونت سنگھ نے ان کا راستہ روک لیا ہے۔ جہاں آرا نے کوشش کی مراسلت کے ذریعے اورنگ زیب اور شہنشاہ کے درمیان رابطہ قائم ہو جائے اور اس طرح آپس کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں اور بھائیوں کے درمیان صلح کے راستے ہموار ہو جائیں۔

شہنشاہ نے جواباً اورنگ زیب کو جو خطوط لکھے ان میں انہوں نے اورنگ زیب اور مراد کو اپنی بے پناہ محبت کا یقین دلایا لیکن بڑے بیٹے دارا شکوہ کو ولی عہد کے طور پر پیش کیا۔ یہ بات شروع سے ہی تمام بھائیوں کو ناگوار گزرتی تھی۔ وہ دارا شکوہ جیسے ضدی، خود سر اور نادان بھائی کی برتری برداشت نہیں کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صلح و صفائی کے راستے ہموار نہ ہو سکے اور بھائیوں کے درمیان جنگیں طول پکڑتی گئیں۔ اورنگ زیب دلیر بھی تھا اور ذہین بھی اور ہوا کے رخ کو پہچان کر حملہ کرتا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں دارا شکوہ بھی شکست کھا کر فرار ہو گیا اور اورنگ زیب کی فوج نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔

قلعے میں شہنشاہ کی محصور فوج نے کئی دنوں تک مقابلہ کیا لیکن پانی کی قلت کے باعث انہیں قلعے کا دروازہ کھولنا پڑا۔ اورنگ زیب کے بیٹے شہزادہ محمد اعظم نے قلعے کے اندر آ کر اپنے دادا شاہجہاں کے تمام ملازمین کو حراست میں لے لیا اور یہ حکم صادر کر دیا کہ بغیر اجازت دادا حضور سے کوئی ملاقات نہ کرے۔ جہاں آرا کو خصوصی اجازت دی گئی کہ وہ کھانے کے اوقات میں بیمار باپ کے پاس جائے اور کھلا پلا کر واپس آ جائے۔

شہنشاہ جیتے جی مر چکے تھے۔ ایک زندہ لاش کی طرح بستر پر پڑے رہتے۔ اب وہ بار بار پوچھتے۔

"ہمارا بیٹا (دارا شکوہ) کہاں ہے؟ کیا تاج محل مکمل ہو گیا۔ ہمیں واپس لے چلو۔"

"ان سوالوں کا جواب دینے کے لیے کبھی جہاں آرا موجود ہوتی کبھی ان کا پوتا شہزادہ محمد اعظم ہوتا اور کبھی اورنگ زیب کی آواز سنائی دیتی۔ بینائی اس قدر کمزور ہو گئی تھی کہ روبرو ہونے والوں کے چہرے صاف طور سے نظر نہیں آتے تھے۔ وہ بہت قریب سے دیکھتے تھے یا پھر ان کی آواز پہچان لیتے تھے۔

کبھی جہاں آرا جواب دیتی "برادر عزیز دارا شکوہ دوبارہ فوجیں جمع کر رہے ہیں۔ وہ عنقریب فاتح کی حیثیت سے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے۔"

کبھی محمد اعظم کی آواز سنائی دیتی "دادا حضور! آپ نے ایک تاج محل کی تعمیر میں لاکھوں روپے کے ہیرے جواہرات خرچ کر دیئے ہیں۔ اس ایک محل کی تعمیر کے لیے بیس سال سے رعایا پر بھاری ٹیکسوں کا بوجھ پڑ رہا ہے۔ آپ کو کیا حق پہنچتا ہے کہ غریبوں کے لہو سے آپ اپنی محبت کا تاج محل بنائیں.....

قید خانے کی تنہائی میں شاہجہاں کی نقاہت بھری آواز ابھرتی۔

”میرے بچے آج تک اس زمین پر جتنے بھی محل اور مسجدیں تعمیر ہوئی ہیں۔ ان سب کا بوجھ رعایا پر ہی پڑا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ثواب دارین حاصل کرنے کے لیے لوگ شاہی مسجد کے ٹیکس بخوبی برداشت کر لیتے ہیں۔ ہم نے کتنی ہی مسجدیں تعمیر کرانے کے بعد ایک تاج محل بنایا ہے۔ یہ تاج محل محبت کا درس دیتا ہے۔ محبت کے بغیر ایک انسان دوسرے انسان تک نہیں پہنچ سکتا۔ جب انسان تک نہیں پہنچ سکتا تو پھر خدا تک کیسے پہنچے گا؟ دراصل خدا محبت ہے اور محبت سے پہچانا جاتا ہے۔ اس تاج محل میں کلام پاک کی جو آیتیں لکھی جائیں گی وہ تمہیں خدا شناس بنائیں گی۔

آہ! ہمارا داراشکوہ کہاں ہے؟ اس نے کبھی تاج محل پر نکتہ چینی نہیں کی۔ وہ ہمارا فرمانبردار بیٹا ہے۔ اس نے کبھی ہمیں اس طرح قید نہیں کیا تھا۔“

نہ جانے کتنا وقت گزر جاتا تھا‘ کتنے دن گزر جاتے تھے‘ کبھی اورنگ زیب کی بھی آواز سنائی دیتی تھی ”ابا حضور! بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس بیٹے نے بھی آپ کو قیدی بنا رکھا تھا لیکن آپ کو اس کا احساس نہیں ہوا۔ کیا محبت اتنی اندھی ہوتی ہے کہ پاؤں کی زنجیریں بھی نہیں دیکھ سکتی۔“

قید تنہائی میں شاہجہاں کی کمزور آواز سسکنے لگتی ”بیٹے انسان محبت کی زنجیر خود پہنتا ہے۔ اس زنجیر کو دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کاش تم بھی ہمیں اپنی محبت سے قید کرتے۔“

کئی دنوں کے بعد شاہجہاں کو ایک خبیث کا چہرہ نظر آیا وہ چہرہ سیاہی مائل تھا۔ جابجا جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ سر‘ داڑھی اور ابروؤں کے بال سفید تھے۔ وہ شاہجہاں کے بالکل قریب آ گیا تاکہ پہچان لیا جائے۔

شاہجہاں نے پوچھا ”تم کون ہو؟“

اس نے جواب دیا ”میرے معزول شہنشاہ! مجھے پہچانیے۔ میرا نام شریف الملک ہے۔ آپ کی شہزادگی کے زمانے میں ملکہ نور جہاں اور شہزادہ شہریار نے مجھے پرگنہ دھول پور کا گماشتہ بنایا تھا۔ میں ان کا وفادار ملازم تھا مگر آپ کے ملازم نے آپ کے حکم سے اس علاقے پر قبضہ جما لیا۔ اس نے مجھ سے جنگ کی اور اپنے تیر سے میری آنکھ کو زخمی

کر کے مجھے ہمیشہ کے لیے کانا بنا دیا۔ اس وقت سے میرے دل میں انتقام کی آگ سلگ رہی ہے۔“

”تم کیا چاہتے ہو۔ تم یہاں کیوں آئے ہو؟“

”مجھے تقدیر یہاں لے آئی ہے ظل سبحانی۔ شہنشاہ اورنگ زیب نے مجھے آپ کی خدمت کے لیے مامور کیا ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ میرے دل میں کیا ہے جو کچھ بھی ہو‘ آپ کے آخری وقت میں ایسی خدمت کروں گا کہ میرا کلیجا ٹھنڈا ہو جائے گا۔ حکم دیجیے حضور عالی! میں تعمیل کروں گا۔“

”تمہارا لہجہ بتا رہا ہے کہ تمہارے تیور اچھے نہیں ہیں۔“

”آپ میرے تیور کو نہ دیکھیں۔ میری خدمت گزاری کو دیکھیں۔“

”اتنے ہی خدمت گزار ہو تو شہزادی جہاں آرا کو بلاؤ۔“

”میں مجبور ہوں‘ شہنشاہ وقت کے حکم سے شہزادی صاحبہ پر بھی پابندیاں عائد کر دی گئیں ہیں کیونکہ وہ شہزادہ داراشکوہ کی خبریں پہنچایا کرتی ہیں۔“

”آہ‘ ہمیں اپنی بیٹی سے بھی جدا کر دیا گیا ہے۔ یہ کیسا ظلم ہے۔“

”ہر زمانے میں ایسا ظلم ہوتا آیا ہے۔ آپ نے بھی اقتدار سنبھال کر ملکہ نور جہاں پر پابندیاں عائد کی تھیں۔“

”کیا تم ہمیں طعنے دینے آئے ہو‘ نکل جاؤ یہاں سے۔ ہم حکم دیتے ہیں کہ اورنگ زیب کو ہماری خدمت میں حاضر ہونے کی اطلاع دی جائے۔“

شہنشاہ وقت ظل سبحانی اورنگ زیب یہاں سے بہت دور آپ کے صاحب زادے داراشکوہ کو گرفتار کرنے کی فکر میں ہیں۔ وہ آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہو سکیں گے۔ کوئی اور حکم دیجیے بندہ پرور! سنا ہے کہ آپ تاج محل کے لیے بہت بے چین ہیں۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اب تک آپ کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔ آپ جہاں آرام فرما رہے ہیں۔ اس دیوار کے دوسری طرف تاج محل ہے۔ اگر اس دیوار میں کوئی دریچہ یا روشن دان ہوتا تو آپ دور سے اسے دیکھ لیتے۔ اگر آپ حکم دیں تو میں کچھ ایسا انتظام کر دوں کہ آپ یہاں لیٹے ہی لیٹے تاج محل کو دیکھتے رہیں گے۔“

تاج محل کے دیکھنے کی بات آئی تو شاہجہاں کی ساری توجہ اسی ایک خواہش پر مرکوز

ہوگئی کہ کسی طرح ایک نظر اسے دیکھ لیں۔ انہوں نے بڑے اضطراب سے کہا۔

"انسان کتنا کمزور ہے۔ اپنی آرزو کے ہاتھوں کھلونا بن جاتا ہے اور لوگ اس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اس سے کھلونے کی طرح کھیلتے ہیں۔ تم بھی جانتے ہو کہ ہم اپنی آرزوؤں کے محل کو دیکھنے کے لیے کتنے بے چین ہیں۔ اگر واقعی وفادار ملازم ہو تو ہمیں تاج محل کا دیدار کا موقع دو۔ ہم تمہیں اتنا انعام دیں گے کہ بڑھاپا آرام سے گزر جائے گا۔"

"مجھے اپنے نہیں، آپ کے بڑھاپے کی فکر ہے۔ آپ کی بیماری 'قید تنہائی' بے بسی اور مجبوریاں دیکھ کر میرا بڑھاپا مطمئن ہوگیا ہے۔ ہی ہی ہی....."

وہ ہنستا چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ راج مستری کو لے کر آیا۔ جہاں بادشاہ سلامت لیٹے ہوئے تھے اس طرف دیوار میں ایک سوراخ بنوانے لگا۔ آدھے گھنٹے بعد ایک ایسا سوراخ بن گیا جس کے آر پار دیکھا جا سکتا تھا۔

راج مستری کے جانے کے بعد کانے شریف الملک نے کہا "میرے معزول شہنشاہ! اس سوراخ سے آنکھ لگا کر دیکھیے۔ باہر چاند نکلا ہوا ہے۔ چاندنی کھلی ہوئی ہے۔ اس چاندنی میں بہت دور جمنا کے کنارے تاج محل نظر آرہا ہے۔ آپ اس نظارے سے بہت محظوظ ہوں گے۔"

بادشاہ سلامت اشتیاق دید میں بستر پر کروٹ بدل کر دیوار کے قریب آگئے اور سوراخ سے ایک آنکھ لگا کر باہر کی جانب دیکھنے لگے۔ باہر چاندنی تھی 'باغیچہ تھا۔ شبنم سے بھیگی ہوئی ہریالی تھی۔ جمنا کی لہریں چاندی کے ورق کی طرح جھلملا رہی تھیں اور اس کے کنارے تاج محل جگمگا رہا تھا۔

لیکن شاہجہاں کی آنکھ کے سامنے چاندنی کے بجائے دودھیا اجالے کی دھند چھائی ہوئی تھی۔ اس دھند میں تاج محل کی صرف جگمگاہٹ تھی۔ اس محل کا مکمل خاکہ نہیں تھا۔ حالانکہ وہ تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ انہیں اس لیے واضح طور پر نظر نہیں آرہا تھا کہ بینائی کمزور ہوگئی تھی۔ دور کی تمام چیزیں نگاہوں کے سامنے دھندلا جاتی تھیں۔ اس لیے چاندنی یوں لگتی تھی کہ جیسے دور تک سفید کہر کی چادر بچھی ہوئی ہو۔ شبنمی دھوئیں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

مجبوری تھی کہ وہ اپنی جوانی کے خواب کو بڑھاپے کی کمزور آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ انہوں نے بیس برس تک ممتاز محل کے ساتھ ایک محل کا خواب دیکھا پھر اس خواب کی تعبیر اور اس محل کی تعمیر میں مزید بیس سال لگ گئے۔ چالیس برس میں وہ خواب ٹھوس اور جامد ہو کر زمین کی ہتھیلی پر تخلیق ہوگیا اور چالیس برس میں وہ بوڑھے ہو کر بینائی سے محروم ہو کر اتنے مجبور ہوگئے کہ اپنی محبت کے محل کو قریب جا کر چھو سکتے تھے نہ دور سے دیکھ سکتے تھے۔

انہوں نے سوچا سوراخ ایک ہے اور وہ ایک آنکھ سے دیکھ رہے ہیں اگر وہ دونوں آنکھوں سے دیکھیں تو تاج محل کچھ اور واضح ہوجائے گا۔ انہوں نے پلٹ کر کانے شریف الملک سے کہا۔

"اس سوراخ کو اتنا بڑا کردو کہ ہم تاج محل کو دونوں آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ ہماری بینائی کمزور ہے ہم ایک آنکھ سے اچھی طرح نہیں دیکھ سکتے ہیں۔"

جواب میں شریف الملک نے ایک زبردست قہقہہ لگا کر کہا۔

"حضور عالی! یہ بندہ بھی ایک مدت سے کانا ہے۔ آپ کی مہربانیوں سے میری ایک آنکھ بیکار ہوگئی ہے۔ میں ایک آنکھ سے اتنی بڑی دنیا کو دیکھ رہا ہوں۔ کیا آپ ایک آنکھ سے تاج محل کو نہیں دیکھ سکتے۔ حضور عالی! آپ ایک بادشاہ ہیں اور میں آپ کا ایک ناچیز خادم ہوں۔ انتقام لینے کے لیے آپ کی ایک آنکھ بے کار نہیں کر سکتا کیونکہ شہنشاہ وقت ظل سبحانی اورنگ زیب نے صرف آپ کو قید کیا ہے۔ وہ آپ پر اس سے زیادہ ظلم نہیں کرنا چاہتے پھر میری کیا مجال کہ میں آپ کی ایک آنکھ کو نقصان پہنچاؤں۔ ہاں جب تک آپ میری نگرانی میں ہیں میں یہی کوشش کروں گا کہ آپ صرف ایک آنکھ سے قید خانے سے باہر کی دنیا کو دیکھیں اور آپ دیکھ رہے ہیں۔ ہی ہی ہی......"

ایک وقت تھا جب بادشاہ سلامت کے سامنے ان کے اپنے بیٹے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتے تھے۔ اب یہ وقت آیا کہ ایک ادنی سا ملازم طبع نازک پر چرکے لگا رہا تھا۔ انہوں نے غصے سے تلملاتے ہوئے کہا۔

"دور ہو جا میری نظروں سے۔ اگر اورنگ زیب نہیں ہے تو محمد اعظم کو بلاؤ۔ ہم ابھی تمہیں سزائے موت کا حکم سنائیں گے۔"

"بے شک آپ کی شکایت پر میری گردن اڑائی جا سکتی ہے۔ میں نے تو جان ہتھیلی پر رکھ کر یہ ملازمت قبول کی ہے۔ میں سزائے موت کو بھی قبول کروں گا کیونکہ میرا انتقام پورا ہو رہا ہے۔ اس بڑھاپے کے بعد اب موت ہی آئے گی۔ خواہ وہ سزائے موت کی صورت میں ہو۔ ویسے میری خواہش ہے کہ میں اس وقت تک زندہ رہوں جب تک کہ آپ کا لاڈلا بیٹا داراشکوہ گرفتار نہ ہو جائے اور بغاوت کے جرم میں اسے اندھا نہ کر دیا جائے۔"

داراشکوہ اندھا ہو جائے؟ یہ بات وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے اور نہ کبھی سننا گوارا کر سکتے تھے۔ اس کانے خبیث کی زبان سے یہ سن کر وہ غصہ سے تھرا گئے۔ چیخ چیخ کر کہنے لگے۔

"بکواس نہ کر مردود! دور ہو جا ہماری نظروں سے۔ اورنگ زیب ہمارا بیٹا ہے' ہم اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ داراشکوہ کی جان کا دشمن تو بن سکتا ہے مگر اس کی آنکھوں کا دشمن نہیں بن سکتا کیونکہ وہ آنکھیں ہمیں عزیز ہیں۔ مرحومہ کے بعد ان آنکھوں نے ہمیں زندہ رکھا ہے۔"

"آنکھیں سب کو عزیز رکھتی ہیں۔ آنکھوں سے ہی زندگی کا لطف حاصل ہوتا ہے لیکن آپ نے اقتدار سنبھالنے سے پہلے شہریار کی آنکھوں میں سلائی پھروادی تھی۔ شاہوں اور شہزادوں کے کھیل ایسے ہی خونچکاں ہوتے ہیں اور تاریخ کے ہر موڑ پر کھیلے جاتے ہیں لہٰذا آپ کو بھی اب شہزادہ داراشکوہ کی آنکھوں کا ماتم کرنا چاہیے۔ شکایت نہیں کرنی چاہیے۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ تنہائی میں بیمار بادشاہ کی آنکھیں اپنے عزیز بیٹے کو دیکھتی رہیں اور دل اسے پکارتا رہا۔ اگر وہ روبرو ہوتا تو اسے اپنے قریب بلا کر اس کی آنکھوں میں ممتاز محل کو دیکھ لیتے۔ تاج محل کو بھی دیکھ لیتے۔ اگرچہ تاج محل خود ان کے پاس نہیں آ سکتا تھا لیکن بیٹے کی آنکھوں میں اس کا جلوہ نظر آ سکتا تھا۔ وہ آنکھیں ایسی تھیں جو ممتاز محل سے کیا ہوا وعدہ یاد دلاتی تھیں۔ گویا اس کی آنکھوں کی تحریک اور ترغیب سے ہی تاج محل وجود میں آیا تھا۔

اس قید تنہائی سے بہت دور داراشکوہ ناکامیوں کا منہ دیکھتا ہوا دہلی پہنچا اور اپنی

بدبختی سے اورنگ زیب کی گرفت میں آ گیا۔ کچھ عرصے تک اسے کال کوٹھری میں رکھا گیا۔ اورنگ زیب کے کتنے ہی مصاحبوں نے مشورہ دیا کہ داراشکوہ کو اذیتیں دے کر مارا جائے تاکہ دوسرے باغی شہزادوں کو عبرت ہو لیکن اورنگ زیب نے صرف اس کی گردن اڑا دینے کا حکم دیا۔ بعد میں کچھ لوگوں نے کہا کہ اس کا سر شاہجہاں کو پیش کر دیا جائے لیکن اورنگ زیب نے یہ بھی گوارا نہ کیا۔ اس نے صرف ایک باغی کو سزائے موت دی تھی۔ وہ ایک لاڈلے بیٹے کا سر پیش کر کے باپ کو مزید صدمہ نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔

۳۰ اگست ۱۶۵۹ء بدھ اور جمعرات کی درمیانی شب تھی۔ برسات کی اندھیری رات میں ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دیتا تھا۔ معزول شہنشاہ حالات کے اندھیرے میں بستر پر نیم دراز تھے۔ ایک طرف چند شمعیں روشن تھیں جن کی لوئیں طوفانی ہوا کی زد میں پھڑپھڑا رہی تھیں۔ وہ ایک جانب نظریں جمائے سوچ رہے تھے اور زیر لب بڑبڑاتے ہوئے خون اور محبت کے رشتوں کو پکار رہے تھے۔

"ہمارا شکوہ کہاں ہے؟ شجاع.... مراد.... اورنگ زیب تم سب کہاں ہو۔ زندگی کی کالی راتوں میں تم نے بیمار اور بوڑھے باپ کا ساتھ کیوں چھوڑ دیا ہے۔

آہ! ہم ہندوستان کے شہنشاہ تھے۔ آج ہمارے دونوں ہاتھ اقتدار سے خالی ہیں۔ سر پر تاج نہیں ہے' زمانے کی گرد ہے۔ دل فریادی کی طرح دھڑک کر محبت کے رشتوں کو پکار رہا ہے۔ آنکھیں دیدار کی پیاسی ہیں۔ تاریخ کی آنکھوں نے ایسا بھکاری شہنشاہ نہیں دیکھا ہو گا۔

ہمارا دل گھبرا رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔ کوئی قیامت ٹوٹنے والی ہے۔ یہ بادل رہ رہ کر یوں گرج رہے ہیں جیسے موت کا فرشتہ زندگی کو دھمکیاں دے رہا ہو۔ اتنی طویل عمر گزارنے کے بعد بھی ایسا لگتا ہے جیسے ایک پل کے لیے دنیا میں آئے تھے اور دوسرا پل شروع ہونے سے پہلے یہاں سے رخصت ہو رہے ہیں۔ زندگی بس اتنی ہی دیر کی ہوتی ہے۔ بجلی کی طرح ایک لمحے کے لیے چمکتی ہے اور فنا کی گود میں چلی جاتی ہے۔"

زندگی کے اس ایک قطرے میں ہم نے کیا پایا' کیا کھویا؟

شاہ بانو ہم کتنی دور سے چل کر آئے ہیں۔ آپ مینا بازار کی پھلواری میں ملیں۔ ہم

نے ایک تاج محل کا خواب دکھایا۔ آج وہ تاج محل تعمیر ہو چکا ہے لیکن یہ کیسی بدنصیبی ہے کہ اسے دیکھنے سے پہلے آپ اس دنیا سے رخصت ہو گئیں اور اسے دیکھنے کی آرزو میں ہم جی رہے ہیں اور مر رہے ہیں۔ شاید ہمیں بھی اس کا دیدار نصیب نہ ہو۔ کیا دنیا اس المیے کو سمجھ سکے گی کہ جو اس کا خالق ہے وہ اپنی ہی تخلیق کو ایک نظر دیکھنے کی آرزو میں مر گیا!

شاد بانو! آپ نے دارا شکوہ، شجاع، اورنگ زیب اور مراد کو جنم دیا تھا۔ ایک ماں کی ہر تخلیق تاج محل سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ آئندہ زمانے میں..... تاج محل کا کیا حشر ہو گا مگر آپ کے تخلیق کردہ تاج محلوں کی تباہی کا تماشا ہم دیکھ رہے ہیں۔

آج ہمارے پاس کوئی نہیں۔ آپ نہیں ہیں، آپ کے بچے نہیں ہیں، ہماری دولت نہیں ہے، ہماری حکومت نہیں ہے، ہماری شان و شوکت، عزت و وقار شاید تاریخ کے صفحات پر ہوں گے لیکن بیٹے کی قید میں نہیں ہیں۔ ہم نے اس زندگی میں کچھ نہیں پایا۔ خدا کی قسم، شاہ بانو! ہمارے دونوں ہاتھ خالی ہیں۔ آج ایک بھکاری بھی ہم سے بہتر ہو گا۔ انتہا یہ ہے کہ ایک ادنیٰ ملازم بھی سر چڑھ کر بولنے لگا ہے۔

دیکھئے بیگم! وہ دیکھئے۔ وہ خبیث آ رہا ہے۔ اس کی ایک آنکھ میں شگاف ہے اور دوسری آنکھ سے شیطان جھانک رہا ہے۔ وہ باہر کی بارش میں بھیگتا ہوا آیا ہے۔ اس کے کپڑوں سے پانی لہو کے قطروں کی طرح ٹپک رہا ہے..... اے بوڑھے خبیث! تم یہاں اتنی رات گئے کیوں آئے ہو؟ یہ تمہارے ہاتھوں میں کیا ہے؟"

"میرے معزول شہنشاہ! یہ چاندی کا قلم دان ہے۔ یہ ناچیز آپ کے لیے ایک انمول تحفہ لایا ہے۔"

قید خانے کی نیم تاریکی میں شمع کی لوئیں تھرا رہی تھیں۔ اس روشنی میں چاندی کا قلم دان کاسہ سر کی طرح چمک رہا تھا۔ شاہجہاں نے کہا "ہم تمہارے تحفے کو ٹھکراتے ہیں۔ چلے جاؤ یہاں سے۔"

"حضور عالی! آپ مجھے مایوس نہ کریں۔ آپ کے لاڈلے بیٹے دارا شکوہ کا اس تحفے سے گہرا تعلق ہے۔"

شاہجہاں نے چونک کر اس قلمدان کی طرف دیکھا پھر ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "لاؤ

یہ مجھے دے دو۔ کیا ہمارے بیٹے نے اسے ہمارے لیے بھیجا ہے۔"

"جی ہاں۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔" اس نے تحفے کو شہنشاہ کے ہاتھوں پر رکھ دیا۔

چاندی کا وہ چھوٹا سا قلمدان شہنشاہ کے ہاتھوں میں لرزتا رہا پھر انہوں نے اسے کھول کر دیکھا۔ اس کے اندر اور باہر مینا کاری کا نفیس کام کیا ہوا تھا۔ اندر ایک مخملی گدا بچھا ہوا تھا۔ جس کی مخملی سطح پر دو انسانی آنکھیں بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔

اچانک ایک بجلی کوندی، روشنی کا ایک جھماکا ہوا۔ وہ آنکھیں کچھ روشن ہو گئیں اور شہنشاہ کی بچھڑی ہوئی محبتوں اور رشتوں کو پکارنے لگیں۔

بادل کی گرج کے ساتھ کانے شریف الملک کی آواز گونج رہی تھی۔

"حضور عالی! مغل بادشاہوں کے انصاف کے مطابق جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ۔ میں اپنی ایک آنکھ کے بدلے آپ کی خدمت میں دو آنکھیں پیش کر رہا ہوں۔ آپ ان آنکھوں کو اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ میں نے شہنشاہ اورنگ کی لاعلمی میں اپنی جان پر کھیل کر یہ آنکھیں ایک سر کٹے صاحب زادے کے چہرے سے نکالی ہیں۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف......"

بجلی پھر ایک بار کوندی۔ اس لحاتی روشنی میں لاڈلے بیٹے کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں اور ان آنکھوں سے ممتاز محل جھانک رہی تھیں۔ بوڑھے بادشاہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ چہرہ بھیگ گیا۔ داڑھی بھیگ گئی پھر آنسوؤں کا ایک قطرہ ٹپک کر ایک آنکھ پر ٹھہر گیا اور سچے موتی کی طرح جھلملانے لگا۔

آنسو کا وہ قطرہ اب تک جمنا کے کنارے جھلملا رہا ہے۔

○☆○

(نوٹ: کہانی میں چند واقعات حقائق پر مبنی نہیں ہیں۔ صرف کہانی کی دلچسپی کی خاطر شامل کئے گئے ہیں)